معرفت کا چوتھا منبع
فطرت، ضمیر اور باطنی شعور

اشارہ

انسان جب عقل و شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر کچھ حقائق کو جان لیتا ہے۔ بدیہی یعنی واضح ترین مسائل اس پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں مثلاً دو ضدیں یا دو نقیضین ایک جگہ اکٹھا نہیں ہو سکتیں اور ان کا اجتماع محال ہوتا ہے۔

بہت سی چیزوں کے حسن و قبح (اچھائی اور برائی) کا ادراک کر لیتا ہے، ظلم و ستم کو بُرا اور عدل و احسان کو اچھا سمجھتا ہے۔

جب کوئی غلط کام اس سے سرزد ہو جاتا ہے تو اپنے باطن سے ایک آواز سنتا ہے جو اسے سرزنش اور تنبیہ کر رہی ہوتی ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنے اندر ایک قسم کا سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔

اچھی اور خوبصورت چیزوں سے پیار کرتا ہے اور علم و خرد کو دوست رکھتا ہے۔

اور اندرونی طور پر ایک مقدس مبداء کے ساتھ اپنے تعلق کا احساس کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے دل کی گہرائیوں سے خدا کی طرف کھینچ کر چلا جاتا ہے۔

ان تمام چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ معرفت کا ایک اور عظیم منبع ان چیزوں کے علاوہ جو اب تک بتائی جا چکی ہیں انسان کے اندر بھی موجود ہے جس کو ہم فطرت یا ضمیر یا باطنی شعور کا نام دیتے ہیں۔

عقل اور فطرت و ضمیر کی حدود کو ایک دوسرے سے جدا کرنے۔ کے لیے مندرجہ ذیل وضاحت پر غور فرمایے۔

انسانی روح ایک عجیب مخلوق ہے جس کے کئی زاویے ہیں، جن میں سے کچھ تو پہچانے جا چکے ہیں اور کچھ کی ابھی تک پہچان نہیں کی جا سکی۔ اور وہ زاویے اور پہلو مختلف ہونے کی بنا پر ان کی سرگرمیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

ان میں سے کچھ سرگرمیوں کا تعلق عقل و خرد سے ہے جن کا کام غور و فکر کرنا ہے، اس کا ایک اور حصہ بھی ہے جس کا نام، حافظہ ہے جو انسان کی تمام معلومات کو اکٹھا کرتا ہے، انہیں ترتیب دیتا اور انہیں ریکارڈ میں لاتا ہے اور بوقت ضرورت، صرف اور صرف ضروری چیز کو ہی لاکھوں، کروڑوں مطالب کے درمیان سے ڈھونڈ نکالتا ہے، اور وہ بھی برق رفتاری اور معجزانہ انداز میں۔

اس کا ایک اور حصہ محبتوں، دوستی، اور دشمنی پر مشتمل تعلقات اور عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اور حصے کا تعلق انسان کے اندرونی اعمال سے ہے، مثلاً کسی چیز کا انتخاب کرنا، ارادہ کرنا اور فیصلہ کرنا وغیرہ۔

الغرض روح ایک ایسا سمندر ہے جس میں ہر قسم کے عجائبات پائے جاتے ہیں اور جو قوانین اس پر حکم فرما ہیں وہ نہایت ہی عجیب اور نہایت ہی پیچیدہ ہیں۔

البتہ ایک لحاظ سے روح کو دو اہم ترین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ایک حصہ کا تعلق غور وفکر اور نظری ادراکات یعنی جنہیں انسان استدلال کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، سے ہوتا ہے۔

۲۔ایک حصّہ کا تعلق بدیہی یعنی ظاہری ادراکات سے ہوتا ہے، یا پھر ضمیر ووجدان سے ہوتا ہے یعنی ایسے امور جو بغیر کسی قسم کی دلیل وبرہان سے معلوم ہوجائیں۔

چنانچہ اس گفتگو میں ہم جہاں پر بھی فطرت اور ضمیر کی بات کریں گے تو اس سے مراد اسی دوسرے قسم کے انسانی ادراکات ہوں گے۔

فطرت یعنی اولین تخلیق، یعنی روح اور جان کی تخلیق جس میں ضروری معلومات کا کچھ حصہ ملا ہوا ہوتا ہے۔

ضمیر یعنی وہ چیز کہ جسے انسان اپنے اندر پاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

باطنی شعور یعنی وہ ادراک اور نظر جو انسان کی جان کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان الہام لیتا ہے۔

بہرحال حقائق کی شناخت اور معرفت کا الہام عطاء کرنے والا ایک منبع یہ بھی ہے جسے کبھی کبھی دل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ عقل سے بالکل جدا ہے جو کہ نظری افکار وادراکات کا مرکز ہے، ہر چند کہ یہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور روحِ انسان کے شجرہ کا ثمر ہیں۔ (غور کیجئے گا)

البتہ یہ بات بھی یاد رہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ضروری نہیں وہ تمام فلاسفہ کے لیے قابلِ قبول ہو، بلکہ یہاں یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا اور انشاءاللہ ہم آگے چل کر مفصل اور مستدل طریقہ سے اس پر بحث کریں گے۔

اس اشارے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم قرآن مجید کی چند آیات کو بیان کرتے ہیں تا کہ دیکھیں کہ معرفت کے اس منبع سے کیونکر پردہ اٹھایا گیا ہے۔

تو سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

آیات

۱۔ وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۞ (شمس ۷۔۸)

۲۔ فَرَجَعُوۡۤا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۞ (سورہ انبیاء ٦٤)

۳۔ وَلَٮِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ

(سورہ لقمان ۲۵)

۴۔ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿۶۵﴾ (سورہ عنکبوت ۶۵)

۵۔ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿۱۳۸﴾

(سورہ البقرہ ۱۳۸)

۶۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (سورہ الرحمن ۳۔۴)

۷۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾ (سورہ علق ۵)

۸۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

(سورہ روم ۳۰)

ترجمہ

۱۔قسم ہے آدمی کی روح کی اور اس کی کہ جس نے روح کو موزوں بنایا، پھر فجور اور تقویٰ کی راہیں اسے الہام کیں۔

۲۔(بابل کے بُت پرست، جناب ابراہیمؑ کے دندان شکن دلائل کے بعد) اپنے آپ کی طرف لوٹ آئے اور خود کو کہنے لگے تم ہی تو ظالم اور ستمگار ہو۔

۳۔اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ کہیں گے کہ خدا نے!

۴۔جب وہ کشتی میں سوار ہوجاتے ہیں تو خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن خدا انہیں خشکی پر پہنچا دیتا ہے اور نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ مشرک ہوجاتے ہیں۔

۵۔ہم تو خدائی رنگ قبول کریں گے (توحید اور اسلام کے رنگ کو) اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہوسکتا ہے اور ہم تو اس کی عبادت کرتے ہیں۔

۶۔خدا، جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔

۷۔خدا نے انسان کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

۸۔اپنے چہرے کو پروردگار کے خالص چہرے کی طرف متوجہ کرو، یہ وہ فطرۃ ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اور خدائی تخلیق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہے۔یہ ہے ایک محکم اور جاودانہ دین

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

الفاظ کی تشریح

"الھمھا"، "الہام" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ بزرگ اہلِ لغت نے بتایا ہے اس کے معنی وہ چیز ہیں جو انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے، لیکن راغب نے مفردات میں تحریر کیا ہے کہ یہ لفظ صرف اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جو خدواند عالم اور عالمِ بالا سے انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے۔[۱]

پھر انہوں نے آیت "فالھمھا فجورھا و تقواھا" کو اس معنی پر شاہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ لسان العرب میں مذکور ہے کہ اس لغت کی اصل "لھم" (بروزن فہم) ہے جس کے معنی نگلنا ہیں۔ اور الہام کے معنی خدائی تلقین ہیں اور وہ وحی کی ایک قسم ہے) وحی اپنے کلمہ کے وسیع معنی کے لحاظ سے)۔

اس کلمہ کی اصل کی طرف دیکھتے ہوئے جو کہ ابھی بتایا گیا ہے، اس کے معنی کی مذکورہ تشریح کے ساتھ مناسبت واضع ہو جاتی ہے، گویا انسانی روح اپنا منہ کھولتی ہے اور خدائی تعلیمات کے ذریعہ حقیقت کو نگل جاتی ہے۔

فطرت فطر (بروزن سطر) کے مادہ سے ہے بعض لوگوں کے نظریہ کے مطابق اس کے اصل معنی، پھاڑنا ہیں جبکہ بعض دوسرے حضرات کے نزدیک اس کے معنی طول میں پھاڑنا ہیں۔[۲] پھر اس کا استعمال مخلوق کی پیدائش کے معنی میں ہونے لگا ہے، گویا کہ عدم کا پردہ پھاڑ کر موجودات منصۂ شہود پر آ جاتی ہیں روزہ توڑنے کو بھی افطار کہا جاتا ہے کیونکہ روزہ ایک متصل اور طویل امر ہوتا ہے جسے اس طرح پھاڑ دیا جاتا ہے۔

کھمبی جیسی نباتات جو زمین کو پھاڑ کر باہر آتی ہیں کو فُطر (بروزن قطر) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو بڑی تیزی سے پھاڑ کر باہر آتی ہیں۔ اسی لیے انگلیوں کے پوروں کے ساتھ جانوروں کے پستان کو دوہنے کو فطر (بروزن سطر) کہا جاتا ہے

یہ لفظ آٹا گوندھنے کے لیے بھی ستعمال ہوتا ہے یعنی جب آٹا گوندھیں اور فوراً اس سے روٹی پکائیں۔[۳]

بہرحال ان آیات میں اس لفظ سے مراد خدائی تخلیق، اولین پیدائش اور ایک سلسلۂ حقائق کی طرف رہنمائی ہے جو آغاز ہی سے انسان کے اندرون میں امانت کے طور پر رکھے گئے ہیں اور اس کے وجود کے ضمیر میں شامل ہیں۔

---

[۱] "فالالھام"، "القاء الشی فی الروع و یختص ذالك بما كان من جهة الله و جهة الملاء الاعلى"۔ (روع بروزن نوح کے معنی دل ہیں اور روع بروزن شوق کے معنی خوف یا تعجب ہیں۔

[۲] لسان العرب

[۳] "کتاب العین"، "لسان العرب"، "مفرداتِ راغب"

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے نفس بمعنی انسانی، روح کے ہے اور کبھی کسی چیز کی ذات کو بھی نفس کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم قرآنِ مجید میں پڑھتے ہیں "ویحذرکم اللہ نفسہ" (اور خدا تمہیں اپنی ذات (کی مخالفت) سے خبردار کرتا ہے) اور یہ لفظ، خون آنکھ اور شخص کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔[1]

اور کبھی بالخصوص نفس امارہ یعنی سرکش نفس کو بھی نفس کہتے ہیں۔

لیکن مذکورہ آیات میں، ضمیر اور وجدان کے معنی میں آیا ہے جو انسانی روح کا ایک حصّہ ہے۔

"صبغہ"، "صبغ" کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی، رنگ کرنا ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر اسے صبغہ کہا جاتا ہے اور صبغ (بروزن صدق) کے معنی سالن، اور وہ غذا ہے جو انسان روٹی کے ساتھ کھاتا ہے کیونکہ روٹی اس سے رنگین ہوجاتی ہے۔ اور بعض حضرات نے اسے روغنِ زیتون کے معنی میں بھی لیا ہے جس سے روٹی کو بھگو کر کھاتے ہیں۔

راغب کے بقول زیرِ بحث آیت میں صبغہ کا لفظ عقل کی طرف اشارہ ہے جسے خداوند عالم نے انسانی وجود کے اندر قرار دیا ہے اور فطرت کی مانند اس کے ذریعہ بھی انسان کو دوسرے جانوروں اور چوپایوں سے جدا کیا ہے۔[2]

جیسا کہ کئی اربابِ لغت نے بتایا ہے زیرِ بحث آیت میں یہ تعبیر شاید اس لیے ہے کہ جب نصاریٰ کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ ساتویں دن کے بعد اسے ایسے پانی سے غسل دیتے تھے جس میں زرد رنگ کا مادہ ملا ہوتا تھا۔ (یعنی بپتسمہ مراد ہے) اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ رنگ اسے پاک و پاکیزہ بنا دیتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ رنگِ الٰہی یعنی اسلام اور توحید ہی ان سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔

تو اس طرح سے مندرجہ بالا آیت میں صبغہ کی تعبیر فطرت اور اولین تخلیق کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے، خصوصاً جبکہ بہت سی روایات میں اسلام اور ولایت سے بھی تفسیر کی گئی ہے۔[3]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں انسانی روح اور اس خدا کی قسم کھائی گئی ہے جس نے روح کو فراوانی کے ساتھ استعداد اور لیاقت عطا فرمائی ہے اور اسے نظام عطا فرمایا ہے۔ اس قسم کے بعد انسان کے اخلاقی وجدان، (ضمیر) اور آگاہی کے منبع یعنی فجور، اور تقویٰ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتا ہے:

ان امور پر آگاہی الہام کی صورت میں اوائل میں انسان کے اندرونِ جان سے ہوئی ہے۔

---

[1] "مجمع البحرین" طریحی مادہ نفس اور مفردات راغب

[2] مفردات راغب، مادہ "صبغ"

[3] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۱۵۷، ۱۵۸

اس طرح کے مقصود کی طرف ایک اور آیت میں بھی انسان کی آفرنیش کے بعد اشارہ کیا گیا ہے۔"وھدیناہ النجدین" (اور ہم نے انسان کو اس کے خیر وشر کی ہدایت کر دی ہے)

توجہ رہے کہ بخد لغت میں دراصل بلند مکان کو کہتے ہیں اور اس کے مقابل کا لفظ "تھامه" (بروزن علاقہ) ہے جس کے معنی ہیں پست سرزمین اور یہاں پر قبل وبعد کی آیات کے قرینہ اوران آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات کے قرینہ کی رو سے یہ تعبیریں خیر وشر اور خوش قسمتی اور بدقسمتی کے عوامل سے کنایہ ہیں۔[1]

ممکن ہے سورہ ھل اتی کی تیسری آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہو جس میں بتایا گیا ہے "انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا" (ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے خواہ وہ شکر کرے یا کفران کرنے والا بنے) یا کم از کم اس آیت میں بیان ہونے والی ہدایت کے کلّی مفہوم میں ہدایت فطری تو آ ہی جائے گی۔

دوسری آیت میں توحید کے بطلِ جلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور بابل کے بُت پرستوں کی طرف سے آپؑ پر مقدمہ چلانے کے واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے جب انہوں نے حضرات ابراہیمؑ کو بلایا اور پوچھا کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بلکہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہوگا، ان سے پوچھئے اگر وہ بولتے ہیں۔

اس مقام پر زیرِ بحث آیت کہتی ہے وہ اپنے آپ کی طرف (اپنے ضمیر کی طرف) لوٹ آئے اور اپنے آپ سے کہا یقیناً تم ہی ظام ہو (ایک تو تم اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور دوسرے اس معاشرے پر ظلم کیا ہے جس میں تم رہ رہے ہو اور تیسرے اپنے خالق و مالک اور تمام نعمتیں عطا کرنے والے پروردگار پر)

اگر چہ بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ "فرجعوا الی انفسھم" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت اور سرزنش کی لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جی ہاں! یہی ضمیر ہی تو ہے جو خود غرض اور مغرور بت پرستوں تک کو اپنی ملامت کے تازیانے لگاتا ہے اور واضح طور پر ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔

سورہ قیامت کی دوسری آیت "ولا اقسم بالنفس اللوامه" میں نفس لوامہ سے اسی عدالت کی طرف واضح اشارہ ہے، خاص کر جب "لا اقسم بیوم القیامة" (روزِ قیامت کی قسم) کے ساتھ ہی اسے ذکر کیا گیا ہے جس طرح قیامت، عدالت کا دن ہے، اسی طرح نفسِ لوامہ بھی اندرونی فطری اور ضمیر کی عدالت کا نام ہے

تیسری آیت میں مشرکین عرب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ آیاتِ الٰہی کی پیروی کرو تو وہ کہتے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کی پیروی کریں گے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۷۱۵۵ و مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۹۴

پس خدا فرماتا ہے: اگر تم ان سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے بارے میں سوال کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان سب کا خالق خدا ہے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس عظیم اور بزرگ خالق کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس ایسے مجسموں اور تصویروں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہے اور یہ کس قدر نادانی اور لاعلمی کی دلیل ہے؟ بل اکثرهم لا یعلمون۔

وہ خالقِ کائنات کے بارے میں سوال کا جو جواب دیتے ہیں ممکن ہے وہ ان کی فطرت کی آواز ہو، اور وہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہو کہ اس نورِ الٰہی کی تجلی تمام انسانوں کی سرشت میں داخل ہے اور وہ اس فطری حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غلط راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

چوتھی آیت میں بھی اسی معنی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے توحید فطری جو کہ مہایت ہی بحرانی حالات میں انسان کے اندرون جان میں متجلّی ہوتی ہے، کے معنی کو واضح کرنے کیلئے ایک واضح ترین مثال پیش فرماتا ہے اور ایسی حالت کو مجسم کرتا ہے کہ، لوگ کشتی میں سوار ہیں اور سمندر کی موجوں، گردابوں اور طوفانوں میں پھنس چکے ہیں اب کوئی طاقت انہیں ایسی نظر نہیں آتی جو انہیں ساحلِ نجات تک پہنچائے تو یہی موقعہ ہے کہ اندھی تقلید، خرافائی رسومات، غلط تعلیمات اور نادرست تجربے کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور خداجوئی کی فطرت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ خدا کی یاد میں پڑ جاتے ہیں اور اسے مکمل خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جونہی طوفان تھم جاتا ہے اور وہ ساحل نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو شرک آلود افکار ان کے دلوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور ان کے اندرونِ قلب بتوں کو ٹھکانے مل جاتے ہیں کیونکہ وہی پردے پھر ان کی فطرت پر آپڑتے ہیں۔

پانچویں آیت میں پہلے تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے بزرگ انبیاء کا دین توحید ہے۔ پھر فرماتا ہے، آپ بُت پرستوں سے کہہ دیجئے کہ ہم خدائی رنگ کو قبول کرتے ہیں اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسے ہی پوجتے ہیں۔

مشرک مسیحی جو توحید کی بجائے تین خداؤں کی عبادت کیا کرتے تھے، وہ اپنے بچوں کی ولادت کے بعد بپتسمہ کرتے، یعنی ولادت کا غسل دیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس میں ایک مخصوص قسم کے زرد رنگ کا اضافہ بھی کیا کرتے تھے اور اپنے نومولود کو باپ بیٹا اور روح القدس کے نام سے غسل دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ غسل نومولود کے گناہوں سے پاک ہونے کا باعث ہے کہ اسے آدمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔ [1]

---

[1] ''کتاب مقدس'' کی قاموس میں آیا ہے کہ ''بپتسمہ'' مقدس دینی قواعد میں سے ایک ہے جو حضرت مسیحؑ کے ظہور سے بہت پہلے سے معروف ہے اور وہ کلیسا کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے کہ جب اقانیم ثلثہ کے لیے پانی کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ گناہ کی نجاست و ناپاکی کی علامت ہوتی ہے...... بہت سے عیسائیوں کا خیال ہے کہ مومنین کے بچوں کا بپتسمہ واجب ہے۔ (قاموس ص ۲۵۷، ص ۲۵۸)

قرآنِ مجید نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور فرمایا کہ اس خرافاتی رنگ کی بجائے توحید اور خدائی رنگ کو قبول کرو تا کہ وہ تمہاری روح اور تمہاری جان کو ہر قسم کے شرک بت پرستی اور گناہ سے پاک کر دے۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں متعدد روایات میں یہ بات درج ہے کہ رنگِ الٰہی سے مراد وہی اسلام اور ولایت کا رنگ ہے [1] اور یہ انسان کی ذات میں فطری الہامات کے وجود کی ایک تاکید ہے۔

چھٹی اور ساتویں آیات میں انسانی تخلیق کے بعد پروردگار کے ذریعہ تعلیم بیان کی بات ہو رہی ہے، اور تعلیم بھی ایسی چیز کی جسے انسان نہیں جانتا لیکن اس کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

اور ایک اور مقام پر لکھنے میں انسان کا معلّم خدا بتایا گیا ہے، کہ "الذی علم بالقلم" (علق ۴)

اس طرح سے وہ معلّمِ بیان بھی ہے اور معلّمِ قلم بھی، اور ایسی چیزوں کا علّم بھی جن سے خود انسان آگاہ نہیں ہے۔ ان تعلیمات سے ممکن ہے کہ فطری تعلیمات کی طرف اشارہ ہو جو خلاصہ کے طور پر اور سربستہ راز کی صورت میں انسان کے اندرونِ موجود ہیں...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ اوزار، اسباب اور مقدمات ہوں جو خدا نے انسان کے اندر تخلیق فرمائے ہیں اور اس کائنات میں زبان و خط اور دوسری اور وقعیات کی ایجاد پر قادر بنایا ہے۔

اور پہلی صورت میں ہماری بحث کا شاہد ہے۔

اسی موضوع کی آٹھویں اور آخری آیت میں دینِ فطرت کی بات ہو رہی ہے۔ خداوندِ متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے رہا ہے کہ پروردگار عالم کے خالص دین کی طرف توجہ کریں، وہی دین جو خالقِ کائنات نے تمام انسانوں کی فطرت میں داخل کر رکھا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، بلکہ وہ پائیدار اور استوار ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن یہاں پر یہ نہیں کہتا کہ خدا شناسی فطری ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ دین اور آئینِ الٰہی مکمل طور پر اور ہر لحاظ سے ایک فطری امر ہے۔

البتہ تشریعی اور تکوینی امور کی ہم آہنگی اور یک جہتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیئے یعنی جو چیز عالمِ تشریعی میں مفصل طور پر بیان ہوئی ہے وہ اجمالی طور پر انسان کی تکوین اور فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور فطرت کی آواز جو انبیاء اور شریعت کی آواز سے ہم آہنگ ہوتی ہے، وہ انسان کو راہِ حق میں رہنمائی کرتی ہے اور صحیح راستے پر قائم رکھتی ہے۔

انشاء اللہ العزیز، توحیدِ فطری کی بحث (بعد کی جلد) میں اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۳۱۶ و تفسیر درمنثور، جلد ۱ ص ۱۴۱

نتیجہ گفتگو

اس طرح قرآن مجید نے فطرت اور وجدان کو معرفت کے ایک مکمل اور جامع منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور متعدد آیات میں تمام لوگوں کو اس منبع کی اہمیت کی طرف متوجہ کرایا ہے۔

تشریحات

۱۔ فطرت ووجدان اور ضمیر کی قسمیں

جو معرفت اور آگاہی فطرت اور وجدان سے عمل میں آتی ہے اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے ہر ایک آیت بھی انہی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ اخلاقی حسن وقبح اور اچھائی اور برائی کا ادراک: جسے بعض اوقات اخلاقی وجدان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر بہت سی صفات کو اچھا سمجھتا ہے، جیسے دوسروں کے ساتھ بھلائی، احسان، عدل وانصاف، شجاعت، ایثار، عفوودرگزر، سچائی اور امانت وغیرہ۔

اوران کے مقابلے میں کچھ ایسی صفات بھی ہیں جنہیں انسان اچھا نہیں سمجھتا بلکہ بری صفات کے زمرے میں انہیں شمار کرتا ہے۔ جیسے ظلم وستم، بخل، حسد، کینہ، جھوٹ اور خیانت وغیرہ۔ چنانچہ "**فالھمھا فجورھا وتقواھا**" والی آیت اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ عقلی بدیہیات کا ادراک: اسی پر نظرِ استدلالات کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کے بغیر کسی موضوع کے لیے کوئی بھی دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ علمِ ریاضی میں کچھ قضیے ایسے ہیں جو بدیہی کہلاتے ہیں اور ریاضی کے تمام استدلالات کا سلسلہ آخر میں انہی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق وجدان سے ہوتا ہے، مثلاً کل جزء سے بڑا ہوتا ہے دو برابر کی چیزیں ایک دوسرے کی مساوی ہوتی ہے یا دو برابر کی چیزوں سے مسای مقدار میں کچھ کم کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں، یا مساوی مقدار میں ان میں اضافہ کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں وغیرہ۔

اسی طرح عقلی اور فلسفی استدلالات کی کیفیت ہے کہ اگر ان میں مسلم اور بدیہی اصولوں سے استفادہ نہ کیا جائے تو تمام استدلالات کی عمارت ہی منہدم ہو جائے، مثلاً دوضدوں کا اجتماع یا دونقیضوں کا یکجا ہونا محال ہے۔

قرآنِ مجید نے بھی بعض اوقات اہم مسائل کے اثبات کے لیے اس قسم کے بدیہی اصولوں کو بیان کیا ہے۔ مثلاً سورہ زمر/۹ میں ارشاد ہوتا ہے "**ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون**" (آیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟)

یا ایک اور جگہ سورہ رعد/۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے "قل هل يستوى الا عمى والبصير ام هل تستوى الظلمات والنور" (کہہ دیجئے یا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں؟ یا ظلمات اور نور یکساں ہیں؟)

۳۔ فطرت مذهبی: یعنی کچھ عقیدتی مسائل ہیں جنہیں انسان کسی استاد اور معلم کی تعلیم کے بغیر جانتا ہے، جن میں خدا شناسی اور معاد، اور اس طرح کے کئی دوسرے عقیدتی مسائل ہیں جن کی تفصیل انشاء اللہ اسی کتاب کی دوسری جلد میں آئے گی۔ اور "فاذا ركبوا فى الفلك دعوا الله مخلصين له الدين" کی آیت اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات اس امر کی دلیل ہے کہ تاریخِ انسانی میں ایک مقدس مبداء پر ایمان موجود رہا ہے حتیٰ کے ایسے دلائل اور ثبوت موجود ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ کے ادوار میں بھی اسی مبداء پر ایمان و اعتقاد انسان کے اندر پایا جاتا تھا، اور جیسا کہ بعد میں اس کی تفصیل بیان کریں گے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ کسی چیز میں یہ فطری امر موجود نہ ہو اور وہ اس وسعت اور دوام کے ساتھ پائی جاتی ہو۔

۴۔ ضمیر یا وجدان کی عدالت: جو انسان کے اندرون موجود ہے اور ایک ایسی عجیب وغریب عدالت ہے کہ اسے قیامتِ صغریٰ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایسی عدالت ہے جو انسان پر اس کے اعمال کے سامنے ہی مقدمہ چلاتی ہے۔ اچھائیوں کے بدلے میں تشویق اور برائیوں کے بدلے میں سزا دیتی ہے۔ اس تشویق اور سزا کو ہم سب مختلف انداز میں اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کہتے ہیں میرا وجدان اس کام پر راضی ہے، میرا ضمیر تخت بے قرار اور ناراحت ہے، اور ضمیر اور ضمیر وجدانی یہ بیقراری اور بے چینی راتوں کا خواب حرام کردیتی ہے اور سُکھ اور چین انسان سے مکمل طور پر چھین لیتی ہے، اور اگر حد سے بڑھ جائے تو دردناک انجام سے بھی دوچار کردیتی ہے اور انسان خودکشی پر مجبور ہوجاتا ہے، یا دیوانگی اور دوسری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ آیت "فرجعوا الى انفسهم" اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ آیا شناخت فطری کا وجود ہے؟

باوجودیکہ ہر شخص اس منبع کو اجمالی طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے یعنی کچھ اندرونی پیغامات اور باطنی الہامات، یا الفاظ دیگر کچھ ایسے ادراکات ہیں جنہیں روبکار لانے کے لیے انسان کو کسی استاد اور معلم کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر بھی کچھ فلاسفہ (خاص کر مادیین) ایسے ہیں جو شناخت کے اس منبع کے اصل وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس مقام پر تقریباً تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

الف: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کسی استثناء کے بغیر تمام معلومات پہلے سے اپنے اندر رکھتا ہے اور اس دنیا میں جو

کچھ وہ یاد کرتا ہے درحقیقت اس کی بھولی بسری یادیں اور معلومات ہیں نہ کہ نئی تعلیم۔ اور یہ نظریہ افلاطون اور اس کے پیروکاروں کا ہے۔[۱]

ب: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کے اندر کسی قسم کی فطری شناخت اور معرفت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اندر مختلف مسائل کے یاد کرنے کی استعداد اور لیاقت پائی جاتی ہے۔ اور یہ لوگ انسان کے فطری ادراکات کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہیں اس کے تجربات ضرورتوں اور اجتماعی تقاضوں کا۔

مشہور ماہر نفسیات، فرائیڈ کا اخلاقی وجدان کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ یہ وجدان کچھ اجتماعی رکاوٹوں اور نامکمل خواہشات کا مجموعہ ہے جو انسان کے مخفی ضمیر میں موجود ہوتی ہیں اس کا کہنا ہے کہ اخلاقی وجدان انسان کے عمیق روح اور ذاتی عمل کا نمائندہ نہیں ہے، بلکہ سادہ اجتماعی رکاوٹوں کی اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ اچھائی اور برائی تصورات کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے، نہ کسی فرد کی تاریخ میں ان کا وجود ملتا ہے اور نہ کسی بشری تاریخ میں بلکہ یہ تصورات صرف اور صرف خارج اور اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔[۲]

میٹریالزم اور ڈائیلکٹیک مکتب کے طرفدار بھی اپنے مشہور اصل کہ ہر چیز اقتصادی صورتحال کا نتیجہ ہے کے مطابق فطری مسائل کی بھی اسی اصول کے مطابق تفسیر کرتے ہیں۔

ج: ان لوگوں کا نظریہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کچھ معلومات ایسی ہیں جن کا اصل تعلق فطرت سے ہے، جبکہ کچھ کا تعلق کسب واکتساب سے ہے اور ہمارے کسی ادراکات کا فطری ادراکات پر موقوف ہے اور منطقی، عقلی اور آیات واحادیث پر مشتمل نقلی دلائل تھی اسی نظریہ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ:

ا۔ اگر ہمارے پاس ریاضی کے چند مسلمہ اور بدیہی اصول نہ ہوں تو ریاضی کے کسی بھی قضیہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دوسرے استدلالی مسائل میں بھی یقینا کچھ بدیہی امور کا ہونا ضروری ہے جو کہ فطرت کے ذریعہ درک کیے جاتے ہیں اور نظری استدلالات کا محور ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اگر فطری اصول کا مکمل طور پر انکار کر دیں تو کائنات کی کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکیں گے، تمام

---

[۱] ''افلاطون'' کہتے ہیں کہ انسانی روح بدن میں داخل ہونے اور مجازی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے عالم مجردات اور عالم معقولات میں تھی اور ''مثل''، یعنی حقائق کا ادراک کر چکی تھی اور جب اس کا ورود عالم کون وفساد میں ہوا تو اس نے تمام حقائق کو فراموش کر دیا۔ لیکن وہ مکمل طور پر محو اور نیست ونابود نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے جب انسان کسی چیز کے پرتو اور سایہ کو دیکھتا ہے، یعنی ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جن کا ''مثل'' کے ساتھ تعلق ہے، تو تھوڑی سی توجہ کے ساتھ حقائق کا ادراک کر لیتا ہے۔ پس علم اور معرفت کا حصول درحقیقت ایک یاددہانی ہے۔ اگر انسان بالکل ہی نادان اور بے علم ہوتا، یعنی علم کا مایہ اس کے اندر نہ ہوتا، تو علم کا حصول اس کے لیے قطعاً ناممکن بن جاتا۔ (ملاحظہ ہو کتاب ''سیر حکمت در اروپا''، جلد ۱ ص ۲۳، نظریات افلاطون)۔

[۲] کتاب ''اندیشہ ہائے فروید'' ص ۶۴

عقلی مسائل مشکوک ہو کر رہ جائیں گے اور سفسطہ کے گہرے کھڈے میں جا گریں گے۔

مثال کے طور پر اگر ہم نے حس وتجربہ یا کسی ایک عقلی دلیل کے ساتھ کسی موضوع کے وجود کو ثابت کر دیا، لیکن ایک بدیہی ترین اور واضح ترین اصول اجتماع نقیضین محال کو اپنے ضمیر ووجدان کے ساتھ قبول نہ کریں تو یہ بات کہہ سکتے ہیں کیا حرج ہے کہ وہ موضوع موجود ہو بھی اور موجود نہ بھی ہو۔

اور اگر اس بدیہی اصول کو تجربہ اور استدلال کے ذریعہ بھی ثابت کرنا چاہیں تو دور اور تسلسل تک معاملہ جا پہنچے گا جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔

۲۔ اس کے علاوہ سفسطائیوں کے مقابلے میں جو کہ ہر شئے کی وجود کے منکر ہیں اور آئیڈیالسٹوں کے مقابلے میں جو کہ خارجی اشیاء کا انکار کرتے ہیں اور ذہنی اشیاء کے وجود کے قائل ہیں، ہم وجدان وضمیر پر تکیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا وجدان اس قسم کے نظریات کے باطل ہونے پر گواہ ہے کیونکہ ہم اچھی طرح اپنی ذات کا اور دوسری کائنات کا خارج میں ادراک کرتے ہیں یہی ضرورتِ وجدانی بھی اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ بہت سے ادراکات ہماری ذات کے اندر موجود ہیں۔

جیسا کہ ہم بہت سی جسمانی اور روحانی خواہشات کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں (جسمانی خواہشات وضروریات کی مثال غذا اور نیند ہے اور روحانی خواہشات کی مثال جیسے علم، اچھائی اور خوبصورتی، پرستش اور قدامت بعض عظیم نفسیات شناسوں کے بقول یہ چار ایسے عناصر ہیں جن سے انسانی روح تشکیل پاتی ہے)

یہی وجدان اور ضمیر ہمیں بتاتے ہیں کہ نیکی اور عدالت اچھی چیزیں ہیں اور ظلاو ستم اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا بُری بات ہے اور اس قسم کے ادراک میں ہمیں کسی منبع کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ اجتماعی یا اقتصادی ہو یا کوئی اور!

فرائیڈ اور مارکس جیسے افراد کا عذر بھی معلوم ہے۔ انہوں نے پہلے ہی ایک اصل کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے اور اس کو وہ قبول بھی کر چکے ہیں، مثلاً وہ پہلے ہی سے اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ فکر واجتماع کے بارے میں منصۂِ شہود پر آنے والے تمام مسائل کا تعلق یا جنسی مسائل سے ہے یا اقتصادی مسائل سے۔ پھر وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ ساری دنیا کے مسائل کو اسی معیار پر رکھ کر ان کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

۳۔ توحیدی نقطۂِ نگاہ سے اس بات کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہم اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان ایک الٰہی طریقہ کے تحت، ارتقائی مراحل کو طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا بغیر کسی شک وتردید کے اس راہ کو طے کرنے کے لیے اس کے اندر اسباب ووسائل بھی آمادہ ہونا چاہئیں، جو کچھ اور آسمانی کتابیں اپنے ساتھ لائی ہیں وہ اس کی تکوینی تخلیق سے ہم آہنگ ہے۔

اس طرح تکوین وخلقت کا عالم وحی اور تشریع کی کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، یا با الفاظ دیگر ان تعلیمات کا خمیر، مایہ، نچوڑ اور خلاصہ خود انسان کی جان کے اندر موجود ہے اور آسمانی شریعتوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس خلاصے کی تفصیل ہے۔

پس اسی بنا پر فطری شناخت کے وجود میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عقل اور توحیدی نقطۂِ نظر سے بھی اس کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔

سوال

ہوسکتا ہے یہاں پر یہ سوال پیش کیا جائے کہ قرآنِ مجید صاف طور پر یہ کیوں کہہ رہا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ

خداوندِ عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا ہے حالانکہ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور عقل قرار دی ہیں۔ (نحل ۷۸)

کیا اس تعبیر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ فطری معلومات نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس لمحہ انسان شکمِ مادر سے باہر آتا ہے تو مسلّم سی بات ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ہوتا، حتیٰ کہ فطری معلومات بھی فعلی صورت میں اس کے سامنے موجود نہیں ہوتیں لیکن جوں جوں وہ ہوش سنبھالتا ہے اس کے اندر عقل وتمیز پیدا ہوتے جاتے ہیں کسی استاد و معلم اور حسّ وتجربہ کے بغیر فطری معلومات اس کے اندر پروان چڑھتی رہتی ہیں، وگرنہ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسان تمام چیزوں، حتیٰ کہ اپنے وجود کا علم بھی آزمائش اور تجربے وغیرہ کے بعد حاصل کرتا ہے۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں؟ تو جو آیات یہ کہتی ہیں کہ خداوندِ عالم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اچھائی برائی بھی الہام کردی، یا دینِ الٰہی کو فطری صورت میں انسان کے اندرونِ جان میں قرار دے دیا، دوسری آیات مثلاً جو کہ اسی بحث کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں کہ ''واللّٰہ اخرجکم من یطون امهاتکم'' کی تفسیر کررہی ہے اور فطری معلومات کو اس سے مستثنیٰ قرار دے رہی ہے۔

ایک اور سوال

یہاں پر ایک اور سال ہے جو دوسرے سوال کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید نے بہت سے مقامات پر انسانی علوم کو تذکر، سے

---

[1] ''دیکارٹ'' سے ایک مشہور و معروف جملہ منقول ہے کہ ''مجھے تو خود ہی اپنے وجود میں شک ہے، لیکن میں نے جب دیکھا کہ میں سوچ رہا ہوں تو میں نے سمجھ لیا کہ میں ہوں'' یہ غلط فہمی سے لبریز ایک جملہ ہے، کیونکہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ''میں سوچ رہا ہوں'' تو پہلے وہ اپنے ''میں'' کے وجود کا اعتراف کرچکا ہے، پھر اس نے اپنی سوچ کو پہچانا ہے، تب کہیں جا کر ''میں'' کو۔

موسوم کیا ہے، مثلاً "ان فی ذالك لایات لقوم یتذ کرون" (اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو تذکر کام لیتے ہیں۔ (سورہ نحل ۱۳) اور فرماتا ہے "وما یذ کر الا اولوا الالباب" (صاحبانِ عقل کے علاوہ اور کوئی تذکر نہیں کرتے۔ (سورہ آل عمران ۷) نیز فرماتا ہے "ویبین ایاته للناس لعلھم یتذ کرون" خدا اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تا کہ وہ متذکر ہوں۔ (سورہ بقرہ ۲۲۱)

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہاں پر تذکر کے معنی یادآوری نہیں ہیں؟ اور اس سے افلاطون کے نظریہ کو تقویت نہیں ملتی کہ علم خواہ کوئی بھی ہو، یادآوری ہی ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تذکر ذکر کے مادہ سے ہے اور اربابِ لغت نے ذکر کا اصلی معنی حفظ لکھا ہے جیسا کہ راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں کہ ذکر بھی تو نفسیاتی کیفیت اور حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے علوم ومعارف کے حفظ پر قادر ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کے دل میں حاضر ہونے یا بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

لسان العرب میں بھی اسی سے ملتا جلتا معنی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ذکر کا معنی کسی چیز کو حفظ کرنا ہے، نیز اس مطلب کو بھی ذکر کہتے ہیں جو زبان پر جاری ہوتا ہے۔

بنابرین ذکر اور تذکر، کا معنی صرف فراموشی کے بعد یادآوری یا کسی بھولے بسرے واقعہ کو از سرِ نو ذہن میں لانا نہیں ہے بلکہ تمام معلومات کو شامل ہے۔

۳۔ اسلامی روایات میں، فطرت اور وجدان

انسان کے اندر شناخت کے اس منبع کا وجود ان مسائل میں سے ہے جن کی طرف اسلامی روایات میں کافی حد تک اشارے پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

۱۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مشہور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

کل مولود یولد علی الفطرة حتی یکون ابواه یهودانه و ینصرانه

ہر مولود فطرت (توحید و اسلام) پر پیدا ہوتا ہے اور یہی فطرت اس کے اندر اسی طرح برقرار رہتی ہے یہاں تک کہ اس کے والدین اسے کسی اور دین، یعنی یہودیت یا نصرانیت کا پیروکار بنا دیتے ہیں۔ [۱]

یہ حدیث بخوبی دلالت کر رہی ہے کہ صرف توحید ہی نہیں اسلام کے تمام بنیادی اصول بھی تمام انسانوں کے وجود میں موجود ہیں۔ [۲]

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ایک شخص نے آپؑ سے قرآنِ مجید کی آیت "فطرة الله التی فطر

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۳، ص ۲۸۱

[۲] اس کی تفصیل ہم انشاءاللہ دوسری جلد میں بیان کریں گے۔

الناس علیھا" کے بارے میں استفسار کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

امامؑ نے فرمایا: "التوحید" (فطرت وہی توحید ہی ہے)۔[1]

۳۔ آپؑ سے منقول ہے کہ "ھی الاسلام" (فطرت وہی اسلام ہی ہے)۔[2]

۴۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فطرھم علی المعرفة به"

(خداوندِ عالم نے لوگوں کو اپنی معرفت سے پیدا کیا ہے)۔[3]

۵۔ "صبغة الله ومن احسن من الله صبغة" کی تفسیر میں بھی متعدد روایات موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "صبغة الله" (رنگ الٰہی) سے مراد ہی اسلام ہے۔[4]

۶۔ حدیثِ قدسی میں خداوند فرماتا ہے "خلقت عبادی حنفآء"۔ مجمع البحرین اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ پھر تحریر کیا ہے کہ "کل مولود یولد علی الفطرة" اس حدیث کے مساوی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیک کاموں کو معروف (پہچانے ہوئے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے لہٰذا امر بالمعروف کہا جاتا ہے اور بُرے اور ناشائستہ کاموں کو منکر (ان جانے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اخلاقی فضائل کے مفہوم ایسی چیزیں ہیں جو انسانی روح سے آشنا اور اس کے نزدیک پہچانے ہوئے ہیں جبکہ اس کے برعکس برائیاں اور قباحتیں قابلِ نفرت اور ناپسندیدہ ہیں، جو روح کے لیے انجانی اور غیر معروف ہوتی ہیں۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق علی التوحید" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ "فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق علی التوحید" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[2] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق علی التوحید" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ "فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق علی التوحید" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[3] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق علی التوحید" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ "فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق علی التوحید" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[4] بحارالانوار جلد ۳ ص ۲۸۰

معرفت کا پانچواں منبع
آسمانی وحی

اشارہ

قرآنِ مجید کی اس منبع کے بارے میں بہت سی آیات موجود ہیں نہ صرف قرآنِ مجید میں اس کا تذکرہ ہے بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔اصول کی بات تو یہ ہے کہ آسمانی ادیان کے پیروکار وحی کو ہی معرفت کے دوسرے تمام منابع سے اہم سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا براہِ راست تعلق خداوندِ عالم سے ہے کے بے انتہا علم سے ہے جبکہ باقی منابع کا انسان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جو کہ خدا کے مقابلے میں نہایت ہی محدود اور ناچیز ہے۔

توحیدِ الٰہی کے نظریہ کے حامل کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے ہمیشہ اپنے بندوں کی ہدایت (بمعنی راستہ دکھانے) کے لیے رجالِ وحی یعنی عظیم انبیاء کرام کو بھیجا ہے۔ارتقاء اور سعادت کی راہیں طے کرنے کے لیے ہر قسم کی انسانی ضروریات کو انہی بزرگواروں کے ذریعہ پیدا فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری عقلیں زبردست طاقتور روشنی کی مانند ہیں اور فطرت ووجدان اور تجربہ وغیرہ دوسری طاقتور روشنیوں کی طرح تو وحی کا مرتبہ آفتابِ عالمتاب کی طرح ہوگا اور اس کی قلمرو نہایت ہی وسیع اور بے انتہا عریض ہوگی۔اسی لیے خدا پرستوں کی نگاہ میں وحی ایک نہایت ہی اہم اور نہایت ہی مستغنی منبعِ معرفت کی حیثیت رکھتی ہے،اسی لیے ہم اس پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں اور سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ دل سے سماعت کرتے ہیں۔

آیات

۱۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (سورہ شوریٰ ۵۱)

۲۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (سورہ نجم ۳،۴)

۳۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (سورہ فصلت ۴)

۴۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (سورہ بنی اسرائیل ۳۹)

۵۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(سورہ بقرہ ۹۷)

۶۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ نحل ۸۹)

۷۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ (سورہ شوریٰ ۵۲)

۸۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل ۴۳)

۹۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (سورہ حدید ۲۵)

۱۰۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (سورہ حجر ۹)

۱۱۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (سورہ آل عمران ۱۱۸)

۱۲۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ (سورہ نساء ۱۶۴)

ترجمہ

۱۔ کسی انسان کے لائق یہ بات نہیں ہے کہ خداوندِ عالم اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے، یا پشت پردہ سے، یا کوئی رسول بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم کے مطابق جو کچھ کہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے کیونکہ وہ بلند مقام کا مالک اور صاحب حکمت ہے۔

۲۔ وہ کبھی اپنی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتا، وہ جو کچھ لایا ہے، وحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۳۔ کہہ دو کہ میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں کہ یہ حقیقت مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

۴۔ یہ احکام ان حکمت کی باتوں میں سے ہیں کہ تیرے پروردگار نے تجھ پر وحی کی ہے۔

۵۔ (وہ کہتے ہیں چونکہ جو فرشتہ آپؐ پر وحی لے آتا ہے وہ جبرائیل ہے اور ہم جبرائیل کے دشمن ہیں لہٰذا ہم آپ

پر ایمان نہیں لاتے) تو آپ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے (درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکمِ خدا کے مطابق قرآن کو آپؐ کے دل پر نازل کیا ہے۔

۶۔اور ہم نے اس (آسمانی) کتاب کو آپؐ پر نازل کیا ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے۔

۷۔جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی نازل کی ہے آپؐ کی طرف بھی ہم نے اپنے فرمان کے مطابق روح کو وحی کیا ہے۔اس سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہے؟ (مضامینِ قرآن کو نہیں جانتے تھے)۔ لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا ہے، کہ جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کریں۔اور یقینا آپ لوگوں کو راہِ راست کی ہدایت کرتے ہیں۔

۸۔اور آپ سے پہلے ہم نے مردوں کو نہیں بھیجا مگر ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

۹۔ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتاب اور (باطل سے حق کی پہچان اور عادلانہ قوانین کا) میزان نازل کیا تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔

۱۰۔ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقینا اس کی حفاظت کریں گے۔

۱۱۔ہم نے آیات (اور ان لوگوں کے شر کے بچاؤ کے راستے) کو تمہارے لیے بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو۔

۱۲۔اور خداوندِ عالم نے موسیٰؑ سے باتیں کیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

وحی قرآن مجید، اسلامی روایات اور عربی ادب میں وحی کا لفظ بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن اس کے اصل معنی جیسا کہ راغب نے مفرادت میں لکھا ہے سریع اشارہ ہیں، اسی لیے سریع اور تیزی سے انجام پانے والے کاموں کو بھی وحی کہا جاتا ہے اسی طرح اشاروں اور کنایوں میں جلد از جلد انجام پانے والی گفتگو کو بھی وحی کہا جاتا ہے اور یہ یا تو اشاروں کے ساتھ یا تحریری طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن اب ان معارفِ الٰہیہ کو وحی کہا جاتا ہے جو انبیاء یا اولیاء پر القاء ہوتے ہیں۔

وحی کی مختلف شکلیں ہیں کبھی تو فرشتہِ وحی کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر ہی یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس طرح جناب جبرائیل علیہ السلام حضورِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نازل ہوتے تھے۔کبھی صرف باتوں کو سنا جاتا ہے لیکن فرشتے کی شکل کو نہیں دیکھا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کلامِ خدا کو سنتے تھے۔

کبھی صرف دل ہی میں کوئی مطلب ڈال دیا جاتا ہے۔

کبھی الہام کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کی داستان میں بیان ہوا ہے۔
کبھی تسخیر کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ "واوحی ربك الی النحل" تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی)
اور کبھی خواب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔(جیسے کہ رویائے صادقہ یعنی سچے خواب ہیں)[1]
لیکن خلیل بن احمد نے اپنی کتاب العین میں وحی کے اصل معنی کتابت یعنی لکھنا تحریر کیا ہے جبکہ ابن منظور نے کتاب لسان العرب میں وحی کے مندرجہ ذیل معانی تحریر کیے ہیں مثلاً اشارہ کتابت رسالت الہام مخفی گفتگو اور ہروہ چیز جو دوسروں کو القاء ہوتی ہے۔
اس تمام گفتگو سے مجموعی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وحی کے اصل معنی تو سریع اشارہ اشاروں پر مبنی گفتگو اور اشاروں یا خطوط کے ذریعہ مخفی پیغامات ہیں۔اور چونکہ عظیم الشان انبیاء کو اشاروں کی زبان میں معارفِ الٰہیہ کی تعلیم دی جاتی ہے،لہٰذا یہ کلمہ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جن الفاظ سے ہم کام لیتے ہیں وہ ہماری روز مرہ کی زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں لہٰذا جب ہم ایسے مطالب اور مفاہیم کو بیان کرنا چاہیں گے جو ہماری روز مرہ زندگی سے ماوراء ہیں تو ان الفاظ کے مفاہیم کو وسعت دیں گے، یا پھر ان سے خالی کر کے استعمال کریں گے، پھر کسی مناسبت کو وہاں پر کام میں لائیں گے۔
مرحوم شیخ مفید رضوان اللہ علیہ شرح اعتقادات میں فرماتے ہیں:

وحی کے اصل معنی تو مخفی کلام ہے لیکن اس کا استعمال ایسے مطلب پر بھی ہونے لگا ہے جو مخاطب کو ایسے مخفی انداز میں سمجھایا جاتا ہے جس سے دوسرے لوگ بے خبر ہوتے ہیں۔[2]

۲۔"انزال" اور "تنزیل" دو ایسے الفاظ ہیں جو نزول کے مادہ سے لیے گئے ہیں جن کا اصل معنی اوپر سے نیچے آنا یعنی اترنا ہے اور نیز ان کے متعدد معانی بھی ہیں جن میں سے نیچے لانا اور بھیجنا، بھی ہیں۔
کبھی تو نزول یعنی اوپر سے نیچے بھیجنے کے معنی میں حسّی پہلو موجود ہے جیسے "انزلنا من السماء ماء طهورا" یعنی ہم نے آسمان سے پاک و پاکیزہ اور پاک کرنے والا پانی بھیجا ہے
اور کبھی اس بخشش اور عطا کے معنی میں آتا ہے جو حکام بالا کی طرف سے اپنے ماتحتوں کو ہوتی ہے۔ جیسے "وانزل لكم من الانعام ثمانية ازواج" یعنی اس نے تمہارے لیے آٹھ جوڑے چوپایوں کے نازل کیے ہیں یعنی بخشے ہیں۔
اور کبھی خداوندِ عالم کی طرف سے الٰہی معارف اور مطالب کے القاء کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ الفاظ کئی مقامات پر اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں

---

[1] مفردات راغب مادہ "وحی"
[2] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۳۸

آیا "انزال" اور "تنزیل" ایک ہی معنی کے دو مختلف الفاظ ہیں یا نہیں؟ ارباب لُغت میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ تنزیل میں کثرت اور زیادتی کا معنی پایا جاتا ہے۔[1]

جبکہ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان اساسی فرق ہے تنزیل کے معنی کسی چیز کو تدریجی طور پر نیچے بھیجنا ہیں۔ اور انزال کے معنی میں یکبارگی اور تدریج دونوں پائے جاتے ہیں راغب نے مفردات میں اس فرق کو مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ

مؤمنین کہتے رہتے ہیں کہ کیوں نہیں (ایسی) سورت نازل ہوتی (جس میں جہاد کا حکم ہو) لیکن جب کوئی محکم سورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ کا ذکر ہوتا ہے تو بیمار دل (منافقین) کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی شخص موت کی دہلیز پر پہنچ چکا ہو۔ (سورہ محمد ۲۰)

اس آیت میں پہلے تو آیاتِ جہاد کے تدریجی نزول کی درخواست ہے لیکن بعد میں اس فرمان کے ایک قطعی اور جامع صورت میں نزول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ منافقین وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ وہ جہاد کے اس حکم کے سامنے غفلت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ "تبیین"، "بین" کے مادہ سے ہے جس کے معنی دو چیزوں کا درمیانی فاصلہ ہے۔ یہ ہوئے اور واضح اور آشکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، کیونکہ دو چیزوں کے درمیان فاصلہ اپنے اندر ان دونوں نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ ان دونوں معانی کے لیے بطور جداگانہ استعمال ہونے لگا ہے، کبھی تو جدائی کے لیے اور کبھی واضح ہونے کے لیے۔

کتاب، صحاح اللغۃ میں ہے کہ بین دو متضاد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی بمعنی جدا یا اور کبھی بمعنی اور وصل کے (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی معنی وہی ہے جو لغت کی دوسری کتابوں میں درج ہے، یعنی جدائی اور فراق کے معنی) البتہ چونکہ کسی چیز سے جدائی بسا اوقات کسی دوسری چیز سے جا ملنے کا باعث بن جاتی ہے لہٰذا اس کے لازمہ پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ کلمہ یعنی تبین قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ظہور، انکشاف اور واضح ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا بینہ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو روشن اور آشکار دلیل ہوتی ہے خواہ وہ دلیل عقلی ہو یا محسوس۔ اسی وجہ سے قانونی امور میں جن دو عادل افراد کی گواہی ثبوت کا درجہ رکھتی ہے کو بینہ کہا جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو بھی بینہ کہا جاتا ہے اور بیان کے معنی کسی چیز سے پردہ ہٹانا ہوتے ہیں خواہ وہ

---

[1] "ابوالحسن" نے اس نظریے کو "لسان العرب" سے نقل کیا ہے۔

زبان کے ذریعہ ہو یا تحریر کے اور شاہد حال کے ذریعہ۔

۴۔ تکلیم اور تکلم، لفظ کلم، (بروزن زخم) کے مادہ سے ہے اور مفردات میں بقولِ راغب اس کے اصل معنی کسی چیز پر تاثیر کرنا ہے، ایسی تاثیر جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو، جو چیز آنکھ سے محسوس ہوتی ہے وہ زخم یا جراحت ہے جو کسی کے بدن پر واقع ہوتی ہے۔اور جو چیز کان سے محسوس ہوتی ہے وہ وہ باتیں ہیں جو ہم دوسروں سے سنتے ہیں۔

العین میں خلیل بن احمد اسے مجروح کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اسی لیے اس لفظ کا اطلاق بات کرنے پر اس لیے ہوتا ہے کیونکہ سننے والے پر اس کا گہرا اور عمیق اثر ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات تلوار اور خنجر سے بھی بڑھ کر۔ چنانچہ عرب کا ایک مشہور شعر ہے:

جراحات السان لها التیام

ولا یلتام ماجرح اللسان

نیزے کے زخم تو مندمل ہو سکتے لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہو سکتے۔

بعض تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلم اور تکلیم کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں کے معنی بات کرنا ہے، اسی لیے خدا کی صفات (ثبوتیہ) میں سے ایک صفت متکلم ہے۔حالانکہ اگر ہم ''و کلم اللہ موسی تکلیما'' کی اساس پر بات کریں تو کہیں گے کہ خدا متکلم ہے۔

اور یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ تکلم کی لفظ ایسے مقامات پر استعمال ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے سے بات کرتا ہے لیکن تکلیم مکالمہ کی مانند ایسی بات کو کہتے ہیں جو دو افراد کے درمیان رد و بدل ہوتی ہے۔کوہِ طور پر موسیٰؑ علیہ السلام سے خدا کی گفتگو کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

''علم عقائد'' کو اسی بنا پر ''علم کلام'' کہتے ہیں کہ اسلام میں عقائد کی اولین بحث کا آغاز، کلام اللہ یعنی قرآن مجید کے سلسلے میں ہوا کیونکہ کچھ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کلامِ خدا قدیم اور ازلی ہے جبکہ بعض لوگ اسے حادث سمجھتے تھے اسلام کی قرون اولیہ میں اس بارے میں بڑی شدومد کے ساتھ بحث و مباحثہ اور جھگڑے اور نزاع کا سلسلہ جاری رہا ہے۔[1]

اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کا جھگڑا فضول اور بے بنیاد تھا، کیونکہ اگر قرآن سے مراد اس کے مفہوم اور مضامین ہیں تو مسلّم ہے کہ ازل سے وہ علمِ خدا میں تھے۔اور اگر اس سے مراد الفاظ کتابت اور وحی کا نزول تھا تو بلا خوف و تردید اس کی صورت زمانۂ سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عمل میں آئی۔ بہرکیف علم عقائد کو علمِ کلام کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کی جارہی تھی۔

---

[1] بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں ''علم کلام'' کی وجہ تسمیہ کا موضوع سب سے پہلا عنوان کے طور پر ذکر ہوا ہے، (ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف، فرید وجدی، جلد ۸، مادہ کلم)۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

آفتابِ وحی

قرآنِ مجید میں مسئلہ وحی بڑی شد و مد کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

قرآنِ پاک میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں جن میں وحی کو شناخت و معرفت کے عظیم منبع کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ کہیں پر خود وحی کے لفظ کے ساتھ کہیں پر تنزیل اور انزال کے عنوان سے، کسی جگہ پر خدائی آیات کی تبیین کے عنوان سے اور کہیں پر خدا کی انبیاء کے ساتھ گفتگو کے طور پر اور کہیں پر دوسرے عنوانوں کے ساتھ۔

اس بارے میں بہترین تعبیر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر حقائق کو بیان کرنے کے لیے قرآنی نقطۂ نظر سے عقل ایک طاقتور روشنی کی مانند ہے تو وحی آفتابِ عالمتاب کی طرح ہے۔

زیرِ بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں خدا کا انبیاء کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے تین ذرائع بیان کیے گئے ہیں ارشاد ہوتا ہے کوئی بھی شخص خدا کے روبرو نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے، مگر وحی کے طریقہ اور ان کے دل میں مخفی الہام کے ذریعہ سے، پھر فرماتا ہے یا پھر حجاب کی اوٹ سے پروردگار کا کلام سننے سے (جیسا کہ خدا نے کوہِ طور پر موسیٰؑ بن عمران سے باتیں کیں اور وہ اس طرح کہ فضا میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا تھا اور اس طرح سے اپنا پیغام حضرت موسیٰؑ تک پہنچا دیتا تھا)

یا پھر اپنے قاصد کو بھیج کر اس کا پیغام اس کے رسول تک پہنچائے، جیسا کہ فرشتہ وحی حضرت جبرائیل امین پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا کرتے تھے۔

بنا بریں قلبی الہام صوتی لہروں کی ایجاد اور فرشتۂ وحی کا نزول یہ تین ایسے مختلف ذرائع ہیں جن کے ساتھ انبیاء الٰہی عالم ماوراء طبیعت کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتے تھے۔

دوسری آیت میں اس بات کی قسم کھائی گئی ہے جب کہ ستارہ غروب کر رہا ہوتا ہے، پھر فرماتا ہے، پیغمبر خدا ہرگز گمراہ نہیں ہوئے اور اپنے مقصد و منزل مقصود کو گم نہیں کر دیا۔ وہ تو کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق بات نہیں کرتا۔ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ آسمانی وحی ہوتی ہے۔

قسم ہے ستاروں کی جب وہ غروب کرتے ہیں ممکن ہے یہ عصرِ جاہلیت میں میدانِ افکار سے نور و ایمان و ہدایت کے غروب کی طرف اشارہ ہو۔ ایسا غروب جو کسی اور طلوع کا پیش خیمہ بن رہا ہو یعنی زبانِ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ حقیقت ترجمان سے آفتابِ وحی کا طلوع۔

اس طرح سے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام کلام کو ایک کلی اصول کے تحت وحی اور ایک غیبی کائنات کے ساتھ رابطہ اور وحی کی پیداوار سمجھتی ہے۔

لوگوں کے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عجیب وغریب تقاضوں کے پیشِ نظر تیسری آیت میں آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو واضح کریں اور لوگوں سے صاف صاف کہہ دیں: میں نہ تو اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی مافوق البشر کوئی مخلوق، نہ تو خدا کا بیٹا ہوں اور نہ ہی اس کا شریک! میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے اور ماوراءالطبیعتہ کائنات سے میرا رابطہ ہے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے لوگوں سے اپنا طرہ امتیاز یہ بنایا ہے کہ وہ معرفت کے اس منبع تک دسترس رکھتے ہیں۔

چوتھی آیت میں اسلام کے چھ اہم احکام (قتلِ اولاد کی حرمت، زنا کی حرمت، قتلِ نفس کی حرمت، یتیموں کے مال کی لوٹ کھسوٹ سے پرہیز، ایفائے عہد کا وجوب اور کم فروشی کی حرمت) کو بیان کرنے کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہے۔

اس آیت کے مطابق اصولِ عقائد نہیں بلکہ اسلام کے جزوی احکامات بھی وحی کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے۔

پانچویں آیت میں یہودیوں کے اس ٹولے کے اعتراض کا جواب ہے جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ پر نازل ہونے والا ملک وحی جناب حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور وہ ان لوگوں کے دشمن ہیں تو آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ، آپ کہہ دیجئے کہ جو جبرائیل کا دشمن ہے درحقیت وہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ انہوں نے تو حکم خدا کے مطابق قرآن پاک کی یہ آیات اور اسلامی تعلیمات وحکام آپ کے قلب پر نازل کی ہیں۔

اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کبھی تو قرآنی آیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر براہِ راست نازل کرتے، جبکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی انسانی صورت میں مجسم ہو کر آنحضرتؐ کے سامنے آئے اور آپؐ تک خدا کا پیغام پہنچاتے۔[1]

چھٹی آیت اس حقیقت کو پوری وضاحت کیساتھ بیان کر رہی ہے کہ ہم نے اس قرآن کو آپؐ پر نازل کیا ہے جو تمام اشیاء کا بیان کرنے والا ہدایت، رحمت اور بشارت کا سرچشمہ ہے اسی لیے یہ تمام معارف وحی کے منبع سے ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ ہر چیز سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کا انسانی سعادت سے تعلق ہے جی ہاں! ان تمام امر کے اصل خواہ وہ معنوی

---

[1] ''فخر رازی'' اس آیت کی تفسیر میں اس بات پر مصر ہیں کہ آیت کی توجیہ کی جائے اور کہا جائے ''جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے قلب پر نازل ہوتے تھے اور آیات الٰہی کو ان کے سامنے بیان کرتے تھے، نہ کہ آپؐ کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان آیات کے حفظ کا مرکز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب مبارک تھا اسی لیے "فانه نزله علی قلبك" کے جملوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔'' (تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۳، ص ۱۹۶) لیکن چونکہ اس توجیہ کو ہم خلاف ظاہر نہیں جانتے لہٰذا اس کی تردید نہیں کرتے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ممکن ہے کہ کبھی جبرائیل علیہ السلام کا رابطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی ہوتا اور کبھی جسمانی۔

مسائل سے متعلق ہوں، یا مساوی ہوں، یا دنیاوی اور مادی مسائل سے، قرآن مجید میں کلّی قوانین کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

ساتویں آیت بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے قرآن خدا کی جانب سے ایک روح ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس سے پہلے آپؐ نہ تو اس کتاب کے مضامین سے باخبر تھے اور نہ ہی اس کتاب کے مضامین پر ایمان سے۔ قرآنِ مجید کی روح اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی حیات، جانوں کی زندگی اور انسانی معاشروں کی حیات وزندگانی ہے اور یہ وہ کلام ہے جسے بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔[1]

اور جو یہ قرآن نے کہا ہے کہ آپؐ اس سے پہلے آگاہ نہیں تھے، اس سے مراد آنحضرتؐ کی ان آیات کے مضامین سے عدم اگاہی بعثت سے پہلے ہے ورنہ بہت سے تاریخی شواہد اور متعدد روایات بخوبی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آغازِ عمر ہی سے معرفتِ الٰہی میں ثابت قدم تھے۔

بہر حال یہ آیت وحی کو معرفت کا ایک اہم منبع کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کی عظمت کو دوبالا کر رہی ہے، کیونکہ قرآن کو روح بھی کہا گیا ہے اور نور اور سرچشمہ ہدایت بھی۔

آٹھویں آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی معاملہ آگے بڑھ گیا ہے اور تمام انبیاء کی طرف ایک مختصر سے اشارے کے ساتھ فرماتا ہے وہ بھی ایسے مرد تھے جن کی طرف وحی بھیجی جاتی تھی اگر تم نہیں جانتے تو ان لوگوں سے جا کر پوچھتے جو اس سے باخبر ہیں، کیونکہ وہ سارے کے سارے معرفت کے اس منبع سے تعلق رکھتے تھے۔

نویں آیت انبیاء ومرسلین پر بینات اور آسمانی کتب اور قوانینِ حق وعدالت کے نزول کی بات کر رہی ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں معجزات اور دوسرے ہاتھ میں کتاب اور قوانین ہوتے تھے تاکہ لوگ عدالت پر قائم رہ سکیں اور ظلم وبیداد کی بیخ کنی کی جا سکے جی ہاں! ان بزرگواروں نے یہ سب کچھ وحی کے منبع کے ذریعہ حاصل کیا۔

دسویں آیت ذکر کی تنزیل اور اسے بھیجنے کے بارے میں ہے یعنی جو آیات بیداری کا سبب بنتی ہیں ان کی بات ہو رہی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا وعدہ بھی کر رہی ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات کی ہر طرح سے تحریف کی، بیشی اور محو ونابودی سے حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ پس لوگوں کی ہر قسم کی آگاہی اور بیداری کا ذریعہ وحی ہے اور چونکہ خداوند عالم خود ہی اس کا محافظ ہے۔ لہٰذا اس کی اصلیت اپنی جگہ پر ثابت اور برقرار ہے۔

گیارھویں آیت میں فرماتا ہے، ہم نے تمہارے لیے آیات کو بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو اور یہ چیز بذاتِ خود دلیل ہے کہ اس بات پر کہ آیاتِ الٰہی عقل کو بیدار کرتی ہیں اور افکار کو متحرک رکھتی ہیں۔

اور آخر میں بارھویں آیت حضرت موسیٰؑ سے خدا کی گفتگو کے بارے میں ہے، ایسی گفتگو جو اس عظیم الشان پیغمبر کے معارف کا سرچشمہ تھی اور گفتگو بھی ایسی جو ایک قسم کی وحی تھی۔

---

[1] راغب، مفردات میں کہتے ہیں "سمس القرآن روحا...لکون القرآن سببا للحیوۃ الاخرویۃ"۔

یہ چند ایک آیاتِ قرآنی بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن میں بڑی وضاحت کے ساتھ اور بغیر کسی الہام کے وحی کو نہایت ہی عمدہ طریقہ سے شناخت و معرفت کا ایک منبع بتایا گیا ہے۔

اور یہ ایسی صورت میں ہے کہ مادی فلاسفہ مطلقاً اس کے مخالف ہیں اور وحی کے بارے میں وہ مختلف تفسیریں بیان کرتے ہیں جنہیں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

اصل منبع کی وضاحت کے بعد اب ہم ایسے مسائل کو بیان کرتے ہیں جو وحی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

تفصیلات

ا۔ قرآنِ مجید میں وحی کی قسمیں

قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وحی کے مختلف معانی ہیں، کچھ تو وحی تکوینی ہوتی ہے اور کچھ وحی تشریعی۔ چنانچہ ان دونوں معانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سات قسمیں بنتی ہیں۔

۱۔ "**وحی تشریعی**": جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اور چند آیات بطور نمونہ اس بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ **وحی بمعنی**: ایسے الہامات جو غیر انبیاء پر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں آیا ہے کہ "**واوحینا الی ام موسی ان ارضعیه**" یعنی ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی (الہام کیا) کہ اسے دودھ دے، اور جب اس کے بارے میں تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے، اور نہ تو ڈر اور نہ غمگین ہو، کیونکہ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے، اور اسے رسولوں میں قرار دیں گے۔

اس سے ملتی جلتی صورتِ حال بلکہ زیادہ مکمل طور پر، سورہ مریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بیان ہوئی ہے کہ فرشتۂ وحی ان کے سامنے آیا اور انہیں عیسٰی کی ولادت کی خوشخبری دی۔ (سورہ مریم ۱۷ تا ۱۹)

۳۔ **فرشتوں کی وحی**: یعنی خود فرستوں کو خدا کا پیغام، جیسا کہ سورہ انفال میں غزوہ بدر کی داستان میں مذکور ہے "**اذیوحی ربك الی الملائکة انی معکم فثبتوا الذین امنوا**"۔ یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، بس جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں ثابت قدم رکھو۔

۴۔ **وحی بمعنی**: اشارہ کے ساتھ پیغام جیسا کہ زکریا علیہ السلام کی داستان میں ذکر ہوا ہے "**فخرج علی قومه من المحراب فاوحی الیهم ان سبحوا بکرة وعشیا**"۔ یعنی وہ محراب عبادت سے نکل کر لوگوں کے پاس آئے اور انہیں اشارے کے ساتھ کہا کہ صبح وشام (خدا کی) تسبیح کیا کرو۔

۵۔ **وحی بمعنی** ''خفیہ شیطانی القاء'' جیسے "**وکذالك جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی**

بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا"۔ یعنی اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانی اور جنی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیئے ہیں جو (لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مخفی طور پر فریب پر مبنی بے بنیاد باتیں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں)۔(سورہ انعام ۱۱۲)

۶۔ **وحی بمعنی** ''تکوینی کائنات میں قوانین الٰہی کا تعین'' جیسے "**واوحی فی کل سماء امرھا**"۔ یعنی خداوند عالم نے ہر ایک آسمان میں تقدیر اور تدبیر کو لازم قرار دے دیا ہے۔(فصلت ۱۲)

اور قیامت میں زمین کی شہادت کے بارے میں جو آیا ہے کہ "**یومئذ تحدث اخبارھابان ربك اوحی لھا**"۔ یعنی اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔(**سورۃ اذا زلزلت**) بھی ممکن ہے کہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہو۔

وحی بمعنی ،،عزیزوں کی تخلیق ،، جیسے "**واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر و مما یعرشون**"۔ یعنی تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو طرف وحی کی (الہام عزیزی کیا) کہ پہاڑوں، درختوں اور ان چھجوں پر اپنا گھر بنا جو لوگ بناتے ہیں۔(نحل۔۶۸)

یہ سب کچھ تو رہا ایک طرف ادھر دوسری طرف انبیاء پر وحی کا نزول بھی مختلف صورتوں میں انجام پاتا رہا ہے کیونکہ قرآنِ مجید اور روایات میں کم از کم ان چار صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔کبھی فرشتہ کے نزول اور اس کے مشاہدہ کی صورت میں۔

۲۔کبھی فرشتہ کی آواز سننے اور خود اسے نہ دیکھنے کی صورت میں۔

۳۔کبھی دل میں الہام کی صورت میں۔

۴۔کبھی خواب اور رویائے صادقہ کی صورت میں جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ان کے فرزند کو ذبح کرنے کے بارے میں مذکور ہے۔(صافات/۱۰۲) یا جیسے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ جب انہیں اس بات کی بشارت دی گئی تھی کہ وہ نہایت ہی امن وامان کے ساتھ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے مکہ میں داخل ہونگے۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے ایک صحابی نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ،، آپؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی ہے،، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا

"احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس، وھواشدہ علی، فینصم عنی فقد وعیت ماقال، واحیانا یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی فاعی مایقول۔

یعنی کبھی تو مجھے گھنٹی کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ صورت حال مجھ پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، حقائق کو مجھ پر روشن کر دیتی ہے اور وہ جو کچھ کہتی ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔ اور کبھی فرشتۂ وحی مرد کی صورت میں میرے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے میں اُسے یاد کر لیتا ہوں۔ [1]

---

[1] بحارالانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۰

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انبیاء اور رسولوں کے چار طبقے ہیں:

بعض وہ ہیں جن کے دل پر الہام ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ سے آگے نہیں بڑھتے۔ بعض وہ ہیں جو فرشتہ کو خواب میں بھی دیکھتے ہیں اور بیداری میں بھی اس کی آواز کو سنتے ہیں، لیکن کسی کو نہیں دیکھتے ہیں، اور وہ کسی کی طرف مبعوث بھی نہیں ہوتے۔

بعض وہ ہیں جو خواب میں اسے دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی آواز سنتے ہیں اور اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں، اور ایک مخصوص گروہ کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

اور بعض وہ ہیں جو اسے خواب میں بھی دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی صدا سنتے ہیں اور فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور وہ (دنیا بھر کے لوگوں کے) امام اور پیشوا ہوتے ہیں۔ [1]

۲۔ وحی کی حقیقت کیا ہے؟

وحی کی حقیقت کے بارے میں بہت کچھ کہا اور سنا جا چکا ہے، لیکن واضح سی بات ہے کہ جس عالم تک ہماری رسائی نہیں ہے اور ہم اس سے مکمل طور پر ناواقف ہیں، وہاں تک رسائی حاصل کرنا ہمارے بس سے بالکل باہر ہے حتّٰی کہ اگر خود پیغمبر گرامیؐ کی ذاتِ والا صفات بھی ہمارے لیے اس کی پوری پوری وضاحت کریں پھر بھی ہمارے لیے صرف ایک دھندلکے کی مانند ہوگا، کیونکہ وہ کائنات اور عالم ہی مرموز اور اسرار آمیز ہے۔

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کئی آنکھوں والا شخص کسی ،،مادرزاد نابینا،، کے سامنے سورج کی دلکش شعاعوں، سمندر کی لہروں، مور کے رنگا رنگ پروں اور پھولوں اور کلیوں کے دلفریب مناظر کو ایک خوش وخرم اور سرسبز وشاداب باغ میں بیان کرے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ مبہم سے کچھ تصورات اس کے ذہن میں پیدا کریں لیکن وہ ان مسائل کی حقیقت کو ہرگز درک نہیں کر پائے گا۔

لیکن ہم وحی کو اس کے آثار، اہداف اور نتائج کے ذریعہ وضاحت کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی وہی خدائی القاء ہے جو ثبوت کو حقیقت کا جامہ پہنانے اور بشارت اور ڈرانے کے لیے عمل میں آتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا نور ہے جس کے ذریعہ خداوندِ عالم اپنے جن بندوں کو ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے، یا اسی طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عالم غیب کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ اور اس عالم کے معارف کے ادراک کا ایک وسیلہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف آثارِ وحی کی بات کی ہے حقیقتِ وحی کی نہیں۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۱، باب طبقات الانبیاء

ہمیں اس معنی پر نہ تو استعجاب کرنا چاہیئے اور نہ اس کی حقیقت کو درک نہ کر سکنے کو اس کے وجود کی نفی کی دلیل سمجھنا چاہیئے اور نہ ہی اس کی مادی اور جسمانی توجیہات کرنی چاہیے۔ کیونکہ عالمِ نبوت تو ایک سہل سا امر ہے۔ اس مادی دنیا میں عالمِ حیوانات ہے جنہیں ہم اپنے سے پست مخلوق سمجھتے ہیں ان میں بھی کچھ ایسے احساسات اور ادراکات پائے جاتے ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ جانور ایسے ہیں جو زلزلہ کے وقوع پذیر ہونے سے کچھ عرصہ قبل اپنی مرموز اور مخفی حس کے ذریعہ اس سے مطلع ہو جاتے ہیں جبکہ ہم مکمل طور پر اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تو وہ مل کر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور ایسی دلخراش آوازیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے والا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ رسیوں اور زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں، جبکہ ہمارے نہایت ہی معیاری اور اعلیٰ ترین قسم کے زلزلہ پیما آلات اس طرح کا پتہ نہیں چلا سکتے۔

اسی طرح کچھ جانور ایسے ہیں جو موسمی حالات کا کئی ماہ پہلے پتہ چلا لیتے ہیں ں اور اپنے گھر یا گھونسلے اسی کے مطابق بناتے ہیں اور اس مدت تک کے لیے ضروری غذا اکٹھی کر لیتے ہیں مثلاً اگر آنے والا موسم سرما سخت اور زیادہ سرد در پیش ہو تو اس کے لئے ان کا ردعمل کچھ اور ہوتا ہے اور اگر زیادہ سخت و سرد نہ ہو تو کچھ اور!! مہاجر پرندوں کی اجتماعی حرکت اور استوائی منطقہ سے قطبی منطقوں کی طرف یا قطبی منطقوں استوائی منطقہ کی طرف طولانی مسافت کا طے کرنا، حتیٰ کہ بعض اوقات رات کے وقت اور ابر آلود فضاؤں میں ایسا سفر کرنا ان ہی کا کام ہے جبکہ کوئی انسان نہایت ہی اہم اور پیچیدہ آلات کے بغیر اس کا ایک فیصد حصہ بھی طے نہیں کر سکتا۔

چمگادڑ کا رات کی مکمل تاریکی میں پرواز کرنا، نہایت ہی پیچیدہ رکاوٹوں سے گزر کر رات کی مطلق تاریکی میں اپنے شکار کو تلاش کر لینا، بلکہ بعض اوقات تو پانی کی موجوں کے نیچے سے شکار کو پکڑنا، اور اس قسم کے کئی دوسرے حقائق ایسے ہیں جو ہم انسانوں کے لیے ناقابلِ اعتبار ہیں، لیکن علم اور سائنس نے اس کی تصدیق کی ہے اور ثابت کیا ہے۔

ان واقعیات کا وجود کہ جس سے علم، تجربہ اور مشاہدہ نے پردہ اٹھایا ہے، اس بات کا غماز ہے کہ ان کے اندر مخفی درک اور شعور موجود ہے اور ہم اس سے بے بہرہ ہیں۔ البتہ حیوانات کے اسرار آمیز جہان تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ [1]

باوجودیکہ حیوانات کے حواس کا تعلق مادہ اور طبیعت سے ہے نہ کہ ماوراء الطبیعۃ سے لیکن ہم ان کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ تو پھر ہم وحی کی اسرار آمیز دنیا کو جس کا عالم وراء الطبیعۃ ہے ورک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا کیونکر انکار کر سکتے ہیں؟

ہم نے جو کچھ ابھی بیان کیا ہے اس سے وحی کے مسئلہ کے اثبات پر استدلال مقصود نہیں تھا، بلکہ اس استبعاد کو دور کرنا مقصود تھا اور ان لوگوں کا جواب تھا جو اس کی حقیقت کے ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

---

[1] کتاب ''حواس اسرار آمیز حیوانات'' کی طرف رجوع فرمائیں

مسئلہ وحی کے اثبات کے لیے ہمارے لیے روشن راہیں موجود ہیں جن میں سے دو تین کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے ساتھ کتابیں اور تعلیمات بھی لے آئے جو انسانی فکر وقدرت سے بالاتر ہیں۔ایک انسان جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو اور عصرِ جاہلیت میں نہایت ہی پسماندہ اور عقب افتادہ ماحول میں ظاہر ہوا ہو،اس اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھ قرآن مجید جیسی عظیم کتاب لائے جو آج تک پوری دنیا کو چیلنج کر رہی ہے۔

۲۔دوسری طرف یہ ہے کہ انبیاء کی طرف سے وحی کا دعویٰ ہمیشہ معجزات اور خارق العادہ امور کے سات ہم آہنگ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک ماوراءالطبیعۃ جہان سے رابطہ ہے۔

۳۔ادھر تیسری طرف یہ ہے کہ توحیدی نقطۂِ نظر یہ بتاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ہمیں ارتقاء اور اپنی لامحدود اور بے حدوانتہا ذات کی طرف حرکت کرنے کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ پیچ وخم،نشیب وفراز اور خطرات ومشکلات سے گھرا ہوا یہ راستہ صرف اور صرف انسانی عقل کے پاؤں سے طے کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے،کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں جن کے ادراک کے لیے انسانی عقل عاجز اور ناتواں ہے اور پھر ساتھ ہی صاحبانِ فکر ودانش کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنی عقل اور ان قوانین کے ذریعہ چلانا چاہتے ہیں جنھیں انہوں نے خود وضع کیا ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خدوندِ عالم بنی نوع انسان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ عقل کی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کی ایسے رہبروں کے ذریعہ راہنمائی بھی کرتا ہے جن کا عالمِ غیب سے رابطہ اور تعلق ہے اور وہ بحرِ علوم الٰہیہ سے سیراب ہوتے ہیں۔وہ ان کے ذریعہ بنی نوع انسان کی امداد اور دستگیری کرتا اور انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ہم ان تینوں قرائن سے عالمِ انسانیت اور عالمِ ماوراءالطبیعۃ کے درمیان رابطے کو بخوبی درک کر سکتے ہیں اور وحی سے حاصل ہونے والے امور پر ایمان لا سکتے ہیں،اگرچہ ہم اس کی ماہیت کو نہ بھی پہچانتے ہوں،باالفاظ دیگر بہت سے دوسرے مواقع کی مانند اس موقع پر بھی ہمارا علم اجمالی ہے نہ کہ تفصیلی!

۳۔وحی کے بارے میں شرق وغرب کے فلاسفہ کیا کہتے ہیں؟

بہت سے فلاسفہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ وحی کی اسرار آمیز دنیا تک رسائی حاصل کریں،خواہ وہ فلاسفہ قدیم ہوں یا جدید،مشرقی ہوں یا غربی!اور پھر وہ اس کوشش میں بھی تھے کہ وہ اپنے اپنے فلسفہ کی بنیاد پر اس کی تفسیر کریں۔لیکن جب ان کیؒ مباحث کے نتائج کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں اکثر لوگ بے راہروی کا شکار ہوتے ہیں اور اگر صحیح راستہ اختیار کیا بھی ہے تو صرف اس حد تک گویا اسرار آمیز دنیا کے صرف ایک معمولی سے سایہ تک رسائی حاصل کی ہے۔

کسی دانشور کا کہنا ہے کہ:

سولھویں صدی عیسوی تک دوسری اقوام کی مانند فلاسفۂِ غرب بھی ،،وحی،، پر ایمان رکھتے تھے،کیونکہ ان کی

کتابیں انبیاء کرام کی خبروں سے لبریز تھیں لیکن جونہی جدید (سائنس اور طبیعی) علوم نے پر پُرزے نکالنے شروع کیے اور تمام مسائل مادی محور کے گرد گھومنے لگے تو فلاسفۂ غرب نے وحی کا مکمل طور پر انکار کر دیا، بلکہ بعض اوقات اسے ،،خرافات اور قصہ ہائے پارینہ،، کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی وہ خدا، روح اور ماوراء الطبیعۃ کی دنیا کا انکار بھی کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی جسارت اور گستاخی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ وحی کو خیالات کو مجموعہ یا اعصابی بیماریوں کا دوسرا نام دینے پر تُل گئے۔

یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا یہاں تک کہ سائنسی اور تجربی علوم کے ذریعہ ان کے لیے عالمِ ارواح دریافت ہوا اور ان کے نزدیک عالمِ ماوراء الطبیعۃ کا مسئلہ تجربی مسائل کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اس بارے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے لکھے گئے۔ [۱]

اس موقعہ پر ''مسئلہ وحی'' کو ایک نئی صورت ملی، اگرچہ اب بھی وہ اس حد تک نہیں پہنچ پائے جس حد تک وحی کی حقیقت کو ادیانِ الٰہی کے پیروکار، بالخصوص قرآن کی روشنی میں مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بھی اس بارے میں ایک نہایت ہی اہم قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ [۲]

جدید اور قدیم فلاسفہ کے درمیان وحی کے بارے میں مجموعی طور پر دو مختلف نظریے موجود ہیں اور ان میں سے کوبھی اس نظریے کے مطابق نہیں ہے جو قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ کچھ قدیم فلاسفہ کہتے ہیں ،،وحی،، کا سرچشمہ وہی ،،عقل فعال،، ہی ہے اور پھر وہ عقلِ فعال کو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل اور روحانی وجود تسلیم کرتے ہیں، جو تمام علوم و دانش کا منبع اور خزانہ ہے ان کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کا ،،عقلِ فعال،، کے ساتھ نہایت ہی قریبی رابطہ ہوتا ہے اور وہ اسی سے الہام لیتے ہیں اور وحی کی حقیقت بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، درحقیقت اس گروہ کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وحی ،،عقلِ فعال،، سے رابطے کا نام ہے اس سے قطع نظر، ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ،،عقلِ فعال،، علم و دانش کے عنوان سے ایک مستقل منبع کی حیثیت رکھتی ہو اس کے اثبات کے لیے آج تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی، جیسا کہ فلسفی مباحث میں اس پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

پس اس طرح سے مندرجہ بالا نظریہ ایک احتمالی نظریہ ہے اور دوسرے مفروضات پر مبنی ایک مفروضہ ہے۔ اور ان دونوں مفروضوں میں سے کوئی بھی مفروضہ پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا۔ تو پھر ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی توجیہات کا سہارا لیں؟ بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ،،وحی عالمِ ماوراء الطبیعۃ اور ذاتِ کردگار کے ساتھ رابطے کا نام ہے لیکن کیسے؟ اور کس طرح سے؟ بات ہم پر واضح نہیں ہے ہم صرف اس کے

---

[۱] دائرۃ المعارف، قرن بیستم، جلد ۱۰، ص ۷۱۲

[۲] دائرۃ المعارف، قرن بیستم، جلد ۱۰، ص ۷۱۲

آثار کو دیکھتے ہیں اور آثار دیکھ کر ہی ہم اس کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں اور اس کی ماہیت کا پتہ لگائے بغیر اس سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں اس قسم کے بہت سے حقائق ہیں۔

۲۔ دورِ حاضر کے کئی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ ،،وحی،، درحقیقت ،،نا آگاہ وشعور،، کی تجلی یا اس جہان کے حقائق کے ساتھ مخفی کے رابطے کا نام ہے کبھی تو ،،باطنی نبوغ،، کبھی ریاضت،، اور اس قسم کی دوسری کششوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جدید نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان دوطرح کی شخصیات کا حامل ہوتا ہے، ایک ظاہر اور آگاہ،، شخصیت جو کہ ادراک، تفکر اور معلومات پر مشتمل ہوتی ہے اور ان عام اور معمولی حواس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری ،،غیر مرئی اور نا آگاہ،، جسے کبھی ،،مخفی وجدان،، یا ،،باطنی ضمیر،، یا نا آگاہ شعور،، کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسے بہت سے روحانی اور نفسیاتی مسائل کے حل کی کنجی سمجھتے ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق انسان کی دوسری قسم کی شخصیت کے اثر ورسوخ کا دائرہ پہلی قسم کی شخصیت کے دائرہ سے کئی درجہ زیادہ وسیع ہے۔

ایک مشہور ومعروف ماہرِ نفسیات اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

> ہم ،،آگاہ شعور،، کو برف کے اس ٹکڑے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو پانی پر تیر رہا ہوتا ہے اور تقریباً اس کا 1/2 حصہ پانی سے باہر ہو، چنانچہ اس کا بیرونی حصہ وہی ہماری شخصیت کا ایک حصہ ہے، جس کے وجود سے ہم واقف اور باخبر ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں نا آگاہ وشعور جو ہماری دینی معالیت کا ایک اور حصہ ہے کہ جس کے وجود سے ہم خود بھی آگاہ نہیں ہیں، اور نہ ہی اس کا اختیار ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ انسانی شخصیت کے ایک عظیم حصے کو تشکیل دیتا ہے اور پانی تیرتے ہوئے برف کے بقیہ 8/9 حصے کی مانند ہے جو پانی کے اندر ہے اور جسے نہیں دیکھا جاسکتا۔ [1]

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ انسان کی دوسری شخصیت کو کس نے دریافت کیا ہے؟ فرائیڈ نے یا کسی اور نے؟ آیا اس بارے میں متقدمین کا کوئی قول ملتا ہے جس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہو یا نہیں ملتا ہمیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے ماہرین نفسیات نے ،،نا آگاہ شعور،، کے دریافت کر لینے اور اس کے ذریعہ توجیہ کریں اور کہیں ،،وحی درحقیقت انبیاء کرام کے شعورِ نا آگاہ کا نتیجہ ہے جو فکری جولانیوں کی وجہ سے ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور پھر انبیاء کے فکری نبوغ اور اس کے ساتھ ہی مسلسل ریاضتوں اور افکار سے کام لینے نے اس کے لیے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔

اور مفروضہ کے مطابق ،،وحی، عالمِ ماوراء الطبیعہ کے ساتھ خاص رابطے اور دیگر افرادِ انسانی کے فکری اور عقلی روابط کے منافی ہونے کا نام نہیں ہے، جو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل وجود بنام پیکِ وحی یا فرشتہ کے ذریعہ انجام پائے، خود انبیاء کرام کے مخفی ضمیر کی صدائے

---

[1] کتاب ''خود شناسی'' ترجمہ ڈاکٹر ساعدی، ص ٦ و ص ٧ (قدرے وضاحت کے ساتھ)۔

بازگشت یا ردِعمل کا دوسرا نام ہے۔

چنانچہ یہ،،نظریہ،، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ،،مفروضہ،، بھی قدیم فلاسفہ کے مفروضہ کی مانند ہرقسم کی دلیل سے عاری ہے جو وحی کو ،،عقلِ فعال،، کے ساتھ متعلق سمجھتے تھے۔

جن لوگوں نے وحی کی ان الفاظ میں تفسیر کی ہے شاید ان کا یہ ارادہ نہ ہو کہ وہ اسے ایک ثابت شدہ حقیقت کے عنوان سے تسلیم کریں بس وہ اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ،وحی،، کے آثار جدید علوم سے سازگار ہیں اور انہیں انبیاء کے،،نا آگاہ شعور،، کی تجلّی سے تفسیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہیں کہ:

بہت سے دانشوروں کا اس بات پر اصرار ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کی سائنسی اصولوں سے مطابقت دیں یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کسی نئی چیز کا سامنا کرتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے انہی اصولوں پر رکھیں اور اگر انہیں اپنے مقصد کے اثبات کے لیے کوئی دلیل نہ ملے تو اپنے مفروضوں کے بیان پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

لیکن ہمارا اشکال یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ اس طرح سلوک کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طرح سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ ہم کائنات پر حکم فرما تمام بنیادی اصولوں کو پہچان چکے ہیں۔ لہٰذا اب کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جو ہمارے پہچانے ہوئے اصولوں سے باہر ہو

لیکن یہ ایک عظیم دعویٰ ہے کہ نہ صرف اس کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کی مخالفت پر ہمارے پاس کئی دلائل ہیں، کیونکہ ہم سب جانتے ہیں اور ہمارے مشاہدے میں یہ بات آ چکی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے نظام کے لیے نت نئے اصول دریافت ہوتے رہتے ہیں اور موجود قرائن سے پتہ ہے کہ جو کچھ ہم اس دنیا کے بارے میں جانتے ہیں یعنی اس کائنات کے بارے میں ہماری علم اس سے لاعلمی کے مقابلے میں" وہ حیثیت رکھتا ہے جو ایک قطرے کی سمندر کے سامنے ہوتی ہے۔

ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم حیوانات کے اسرار آمیز حواس کی کماحقہ،معرفت سے عاجز ہیں اور اس سے بالاتر خود اپنی ذات کے اسرار کی معرفت سے ناتواں اور عاجز ہیں، البتہ ہم صرف اتنا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان اسرار میں سے صرف چند ایک ہی کو پہچان سکے ہیں۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس بات پر اصرار کریں کہ ہم کائنات کی ہر چیز کو اپنے معلوماتی اصولوں کے مطابق ہی تسلیم اور اس کی تفسیر کریں پس ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ وحی ایک واقعی حقیقت ہے جس کے آثار ہم دیکھتے ہیں لیکن اس کے اسرار سے بے خبر ہیں۔

۴۔وحی کے غریزی ہونے کا مفروضہ

بعض مسلم مفکّرین نے وحی کے بارے میں یورپی دانشوروں کے افکار سے مرعوب ہو کر ایک اور مفروضے کا اظہار کیا ہے جو اصولی طور پر بھی ان کے ساتھ یکساں ہے، ہر چند کہ ظاہری طور پر ان سے مختلف ہے۔

یہ مفروضہ مندرجہ ذیل اصولوں پر استوار ہے:

۱۔لغت میں ”وحی“ کا معنیٰ ”آہستہ اور سرگوشی کہ صورت میں بات کرنا“ ہے اور قرآن مجید میں اس کا وسیع مہوم ہے جو مخفی ہدایتوں کی مختلف انواع کو بھی شامل ہے وحی کے ذریعہ جمادت، نباتات اور حیوانات کی ہدایت سے لے کر انسانوں کی ہدایت سب اس میں آجاتی ہیں۔

۲۔وحی، عزیزہ کی ایک قسم ہے اور ہدایتِ وحی، ہدایتِ عزیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۳۔اجتماعی نقطۂ نظر سے وحی، انسان کی ہدایت ہوتی ہے۔یعنی انسانی معاشرہ اس لئے اسے کہ وہ ایک اکائی ہے جس کی اپنی ایک راہ، کچھ قوانین اور حرکت وتحرک ہے، لہٰذا اسے ہدایت کی ضرورت ہے اور ”نبی“ اس وحی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جو اپنے عزیزے کے طور پر وہ سب کچھ حاصل کرتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ضروری ہے۔

۴۔تمام جاندار چیزیں ابتدائی مراحل میں عزیزہ کے ذریعہ ہی ہدایت کی جاتی ہیں اور وہ ارتقاء کے درجات میں جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہیں اور ان کے حسّ تخیل اور افکار کی طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر ان کی قدرتِ غریزہ میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حشرات میں نہایت ہی طاقتور غرائز پائے جاتے ہیں جبکہ انسانوں میں ان کی نسبت بہت ہی کم۔

۵۔اجتماعی نقطۂ نظر سے انسانی معاشرہ تسلسل کے ساتھ ایک ارتقائی راستے پر گامزن ہے جیسا کہ حیوانات ابتدائی مراحل میں غریزہ کے محتاج ہوتے ہیں اور جوں جوں حسّ وتخیّل، حتیٰ کہ تفکّر کی طاقت ان میں ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر حسّی اور فکری ہدایت، غریزی ہدایت کی جانشین ہوتی جاتی ہے۔اسی طرح انسانی معاشرہ بھی ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے بالتدریج ایسی جگہ پر پہنچ چکا ہے کہ جہاں پر تعقّل کی طاقت ترقی کر چکی ہے۔اسی لیے وہ غریزہ (وحی) کی کمزوری کا سبب بن چکی ہے۔

۶۔انسانی کائنات کے دو بنیادی دورانیے ہیں۔۱۔ہدایتِ وحی کا دورانیہ۔۲۔طبیعتِ تاریخ میں تفکّر اور تدبّر کا دورانیہ۔

۷۔پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خاتم النبیّین کا تعلق قدیم دنیا سے بھی ہے اور جدید دنیا سے بھی اپنے منبع الہام یعنی وحی کے لحاظ سے نہ کہ طبیعت اور تاریخ کے تجرباتی مطالعہ کی رو سے ان کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، اور اپنی تعلیمات کی روح کے لحاظ سے کہ جس میں طبیعت اور تاریخ کے بارے میں تدبّر، تفکّر اور مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے، جب یہ امور پیدا ہو جاتے ہیں تو وحی کا سلسلہ رُک جاتا ہے، ان تمام باتوں کا تعلق نئی اور جدید دنیا سے ہے۔[1]

اس مفروضے کا نچوڑ یہ ہے کہ وحی ناخودآگاہانہ معرفت کی ایک قسم ہے جیسے غرائز ہیں جو کہ خودآگاہانہ معرفت سے کم درجہ پر ہے جو کہ حسّ، تجربہ، اور عقل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اور فکر وعقل کے ارتقاء کے ساتھ ہی وحی کا مجموعی ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عقل

---

[1] شہید مطہری کی کتاب ”مقدمہ بر جہان بینی اسلامی“، (مرحوم شہید مطہری نے مندرجہ بالا سات امور کو جس میں وحی کے سلسلہ میں علامہ اقبال لاہوری کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے، ان کی کتاب ”اسلام میں فکر دینی کا احیاء“ سے خلاصہ کر کے پیش کیا ہے اور پھر اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے)۔

لے لیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، اورختمِ نبوت کا نظریہ یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ مفروضہ اگر چہ ایک اسلامی دانشور کی طرف سے ظاہر ہوا ہے لیکن کئی جہالت سے مغربی دانشوروں اور اہلِ قلم کے مفروضات سے کئی درجے پست اور کمزور ہے، جو وہ وحی کے بارے میں قائم کیے ہوئے ہیں ہر چند کہ دلیل کے فقدان کے لحاظ سے ان کے اب تک مفروضات سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا وحی کے بارے میں اب تک پیش ہونے والے نظریات میں سے بدترین نظریہ ہے۔ کیونکہ:

اوّلاً: مغربی مفکرین وحی کو انسان کے حسّی اور عقلی ادراک سے مافوق سمجھتے ہیں جبکہ اس مفروضہ کے تحت وحی کا درجہ حسّ اور عقل سے کمتر ہے۔اور یہ واقعاً عجیب سوچ ہے!!!

ثانیاً: ایک مسلمان جو قران سے آشنا ہے، اس کے لیے یہ بہت اچھی طرح واضح ہے کہ قرآنی نقطہِ نظر سے ''وحی'' خدا کے علم کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ اور تعلق ہے۔ وہ عظیم ترین معارف جنہیں انسان عقل کے ذریعہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتا وہ وحی کے بیکراں سمندر سے حاصل ہوتے ہے۔

قرآنی نقطہ نظر سے ''وحی'' مکمل طور پر خود آ گاہ ہدایت کا نام ہے جو 'ہدایت عقلی' سے کئی درجے بالاتر ہے اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے تشبیہ کے طور پر بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم عقل کو ایک طاقتور چراغ سمجھیں تو وحی کا درجہ آفتاب عالمتاب کا ہو گا۔

قرآن مجید نے ایک طرف تو انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" یعنی تمہارے پاس علم ودانش کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

اور دوسری طرف علمِ الٰہی کی وسعت کون الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم، پھر بھی اس کے لامتناہی علم کو ہرگز نہیں لکھ پائیں گے۔ (لقمان ۲۷)

اور نبوت کی وحی کا اسی لامتناہی علم کے ساتھ ہی تعلق ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کھلم کھلا لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا معلّم خود خدا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ

یعنی خداوندِ عالم نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور جو چیز آپ نہیں جانتے تھے اس کی آپ کو تعلیم دی۔ (نساء ۱۱۳)

انسانی علم ودانش جس قدر بھی ترقی کر جائے پھر بھی اس کے بس سے باہر ہے کہ انسان کو وحی کی ہدایت کے بغیر سعادت وخوش بختی کے پُر پیچ راستوں سے باخبر کرے چنانچہ بہت سے فلاسفہ کا عجیب وغریب انحراف کا شکار ہو جانا ہمارے اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہے۔

بہت سے لوگ اسلامی مفکّر کے عنوان سے مشہور ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلامی مفکّر کی نسبت ”مغربی مفکّر“ زیادہ ہیں اوران کے نظریات میں ”مغربی مفکرین“ کا رنگ غالب ہے۔اسی وجہ سے وہ مافوق الطبیعۃ حقائق کے لیے طبیعی توجیہات کرتے ہیں۔

اگر یورپی مفکرین کا اسی معنی پر اصرار ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عالمِ ماوراءِ الطبیعۃ کے منکر ہیں۔لیکن کسی مسلمان کو اسلامی نظریہ کا حامل ہونے اور وسیع ترین ماوراءالطبیعۃ کائنات پر ایمان رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا پیروکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے تمام مسائل کے لیے سائنسی اور طبیعی توجہیں پیش کرتا رہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں جو لوگ مسلمان گھرانے سے تو تعلق رکھتے ہیں لیکن یورپ میں تعلیم حاصل کی ہے اوران کی اسلامی معلومات مغربی معلومات کی نسبت کمزور ہیں،ان کی تحریر میں مغربی مفکرین کی اتباع پائی جاتی ہے۔

۵۔پیغمبر کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے ہے؟

وحی کے بارے میں ہونے والے سوالات میں سے ایک یہی سوال ہے کہ جب پہلی مرتبہ کسی پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے تو اسے کیونکر یقین آجاتا ہے کہ ”یہ خدا کی طرف سے وحی ہے نہ کہ شیطان القاء؟ اس علم اور یقین کا منبع اور مرکز کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کے مطالب اور موضوعات کے لحاظ سے رحمانی پیغامات اور شیطانی القائات کا زمین وآسمان جتنا فرق ہوتا ہے،اور ہر ایک کے مطالب سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اسے کہاں سے بھیجا جارہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر عالم وراءالطبیعۃ یا وحی کے قاصد کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے تو وہ اندرونی مشاہدہ کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح طور پر دریافت کرلیتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ٹھیک اسی طرح جیسے ہم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہوں اگر اس موقعہ پر کوئی یہ کہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ اس وقت عالمِ بیداری میں تم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہو؟ شاید یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہے ہو؟ تو صاف سی بات ہے کہ ہم اس کی اس قسم کی باتوں کو ہرگز لائقِ اعتناء نہیں سمجھیں گے،کیونکہ جو چیز ہم محسوس کررہے ہیں وہ قطعی اور ناقابلِ تردید ہے۔

آیہ”فلما اتاها نودی یاموسی انی انا ربك“(سورہ طہ ۱۱،۱۲) کی تفسیر میں علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی مرحوم کے بقول:

> ”جب خدا کا کوپیغمبر اور رسول پہلی بار وحی اور رسالت کا سامنا کرتا ہے تو اس کے لیے کسی قسم کے شک وشبعے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وحی کے بھیجنے والا خداوندِ سبحان ہی ہے۔اور اسے اس بارے میں تحقیق،استدلال اور حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر ضرورت محسوس ہو تو وہ غیبی اور بلاواسطہ وحی نہیں ہوگی بلکہ برہانِ عقلی سے استدلال اور استفادہ کی ایک قسم ہوگی“۔[1]

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ بعض روایات جعلی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے

[1] المیزان،جلد ۱۴ ص ۱۴۹

پہلی وحی نازل ہوئی اور آپؐ ''کوہِ حرا'' سے حضرت خدیجہؓ کے گھر تشریف لاے اور جو کچھ دیکھا تھا وہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کر دیا، پھر فرمایا'' مجھے اپنا خوف ہے'' (یعنی میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ یہ خدا کی وحی نہ ہو!!) جناب خدیجہؓ نے انہیں تسلی دی اور اپنے چچا زاد بھائی ''ورقہ بن نوفل'' کے پاس جا کر تمام ماجرا بیان کیا۔

ورقہ وہ شخص ہے جس نے زمانہ جاہلیت میں دینِ مسیحی اختیار کیا ہوا تھا، ایک پڑھا لکھا اور عربی و عبری (عبرانی) زبانوں سے واقف تھا۔

اس نے آنحضرتؐ سے تمام ماجرا بیان کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے سب کچھ اس کے سامنے بیان فرما دیا، یہ سن کر اس نے کہا:

''یہی تو وہ ناموس (فرشتہ وحی) ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوتا تھا۔

پھر کہا'' کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جس وقت آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکالے گی، اور میں آپؐ کی مدد کرتا۔ [1]

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی روایات کا شمار جعلی روایات میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جو پیغبر واضح طور پر عالمِ غیب سے تعلق پیدا کر لیتا ہے اسے کیا ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ورقہ بن نوفل جیسے عیسائی کاہنوں کی پیش گوئیوں اور غیب کی خبروں کا محتاج ہو، اور اس طرح کی وحی پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

جب جناب موسیٰؑ علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی وادیٔ طور پر نازل ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیوں نہ کیا جب کہ انہوں نے تو صرف آواز ہی سنی تھی اور فرشتہ کو نہیں دیکھا تھا؟ آیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمن کے مخفی ہاتھوں نے وحی اور نبوتِ اسلامی کی بنیادیں کمزور کرنے کے لیے اس قسم کی خرافات کو جعل کر کے اسلامی کتب میں درج کرا دیا ہے!!

٦۔ اسلامی روایات میں قرآن مجید معرفت کا اہم ترین منبع ہے

ہم اس بحث کو اس اشارے کے ساتھ مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ وحی کے عظیم ترین مصداق یعنی قرآن مجید کی عظیم پیشواؤں کے کلام میں کس قدر اہمیت ہے اور وہ کس حد تک جامع اور مستغنی ہے تا کہ ایک تو اصل مسئلۂ کی تاکید ہو جائے اور معرفت کے اس عظیم منبع کی اپنی ذاتی حیثیت کا بھی پتہ چل جائے۔ دوسرے ان'' کج اندیش دانشوروں'' کا جواب بھی ہو جائے جو وحی کو'' حیوانات کے غرائز'' میں شمار کرتے اور عقلی ادراکات سے کم درجے میں شکار کرتے ہیں اور اس بات کے معتقدؔ ہیں کہ انسانی عقول کی پیش رفت سے نہ تو وحی کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی ان معارف کی وحی جن کا سرچشمہ ہے، تا معلوم ہو جائے ؎

صلاح کار و من خراب کجا
ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟

[1] اس موضوع کو اہلسنت کے بہت سے محدثین اور مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ منجملہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، تفسیر فی ظلال القرآن (سورہ علق کے آغاز میں) اور دائرۃ المعارف، قرن بیستم (مادہ وحی) جیسی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۔پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اذا التبت علیکم الامور کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن.....من جعله امامه قاده الی الجنة، ومن جعله خلفه ساقه الی النار، وهو اوضح دلیل الی خیر سبیل، من قال به صدق، ومن عمل به اجر، ومن حکم به عدل"۔

''جب تم پر رات کے تاریک ٹکڑوں کی مانند اور مشتبہ ہونے لگ جائیں تو تمہیں چاہئیے کہ قرآن کے دامن سے متمسک ہوجاؤ......جو شخص قرآن کو اپنے آگے قرار دے قرآن اسے بہشت تک لیجائے گا، جو اسے پسِ پشت ڈال دے گا وہ اسے جہنم کی طرف پہنچا دے گا۔قرآن بہترین راہوں کی طرف بہترین رہنما ہے، جو اس کے مطابق بات کرے گا وہ سچا ہوگا، جو اس پر عمل کرے گا اسے اجر ملے گا اور جو اس کے مطابق فیصلے کرے گا وہ عادل ہوگا۔''[1]

۲۔حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"ثم انزل علیه الکتاب نورا لا تطفا مصابیحه، وسراجا لا یخبو توقده، وبحرا لایدرك قعره، ومنهاجا لایضل نهجه، وشعاعا لایظلم ضوئه، وفرقانا لایخمد برهانه، وتبیانالاتهدم ارکانه، وشفاء الا تخشی اسقامه، وعزالاتهزم انصاره، وحقالا تخذل اعوانه"

"فهو معدن الایمان وبحبرحته، وینابیع العلم وبحوره، وریاض العدل وغدرانه، واثافی الاسلام وبنیانه"

یعنی پھر خداوندِ عالم نے آپؐ پر ایک کتاب نازل فرمائی وہ ایک ایسا نور ہے جو بجھنے میں نہیں آتا، ایسا چراغ ہے جس کے فروغ کو زوال نہیں، ایسا سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک رسائی نہیں، ایسا راستہ ہے جس میں گمراہی

---

[1] اس حدیث کو مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں درج کیا ہے جسے ابوسعید خدری نے آنحضرتؐ کے ایک خطبہ کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ (جلد ۷۴،ص ۱۷۷)

نہیں، ایسی روشنی ہے جس میں تاریکی نہیں حق اور باطل کو اس طرح جدا کرتا ہے کہ جس کی دلیل کی روشنی کبھی نہیں بجھتی، ایسی بنیاد ہے جس کے ستون منہدم نہیں ہوتے، ایسی شفا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بیماریوں سے خوف نہیں کھایا جا سکتا، ایسی قدرت ہے جس کے معاونین کو شکست نہیں ہوتی، ایسا حق ہے جس کے مددگاروں کو کبھی تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔

قرآن ایمان کا مرکز و معدن ہے، علم کا چشمہ اور سمندر ہے، عدل و انصاف کا منبع اور سرچشمہ ہے، نیز اسلام کی بنیاد اور اساس ہے۔[۱]

۳۔حضرت امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا:

"ما بال القرآن لا یزداد علی النشر و الدرس الا عضاضة"

یعنی کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید نشر و شاعت اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ طراوت ہی پیدا کرتا ہے؟

تو امام عالی مقامؑ نے ارشاد فرمایا:

"لان الله تبارك و تعالى لم يجعله لزمان دون زمان، ولا لناس دون ناس، فهو فی کل زمان جديد وعند کل قوم عض الی یوم القيامة"

کیونکہ خداوند عالم نے اسے کسی مقرر اور معیّن زمانے کے لیے قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی خاص قوم کے لیے قرار دیا ہے۔لہٰذا وہ ہر زمانے میں تر و تازہ اور تا روزِ قیامت ہر قوم کے لیے سرسبز و شاداب ہے۔[۲]

اس سلسلے کی بہت سی روایات موجود ہیں، شیعہ منابع میں بھی اور سنی منابع میں بھی۔ہم نے صرف نمونے کے طور پر مندرجہ بالا تین حدیثیں پیش کی ہیں، ایک حدیثِ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، ایک حدیث حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے اور ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے۔

۷۔غیر انبیاء کی وحی (یا وحی الہامی)

جیسا کہ ہم نے بحث کے آغاز میں کہا تھا "وحی" کے وسیع معنی ہیں جن میں سے ایک معنی کا تعلق، وحیِ نبوت و رسالت سے ہے جبکہ اس کی ایک اور قسم ہے جو غیر انبیاء کے دل پر اترتی ہے، یا وہ پیغام ہے جو بعض فرشتوں کے ذریعہ غیر انبیاء تک پہنچایا جاتا ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۸

[۲] بحار الانوار، جلد ۸۹، ص ۱۵

اس کا پہلا نمونہ تو وہی ہے جو قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں کہا ہے:

"واوحینا الی ام موسی ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی"

یعنی ہم نے مادرِ موسیٰؑ کے دل میں الہام کیا کہ تو (اپنے نومولود کو) دودھ پلا اور جب تو اس کے بارے میں (دشمنوں سے) ڈرے تو اسے دریائے (نیل) میں ڈال دے اور نہ تو ڈر اور نہ ہی غمگین ہو۔ (قصص ۷)

اس قسم کی گفتگو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے بارے میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:

وَاِذۡ اَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَبِرَسُوۡلِیۡ ۚ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ، تو انہوں نے کہا ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ (مائدہ ۱۱۱)

نیز حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی مقامِ نبوت پر پہنچنے، سے قبل وحی ہوئی تھی۔ جب ان کے بھائیوں نے طے کر لیا کہ انہیں کنویں میں ڈالیں، تو اسی موقع کی مناسبت سے قرآن کہتا ہے:

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾

ہم نے اس وقت یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ مستقبل میں (جب تم اقتدار حاصل کر لو گے) انہیں ان کی ان کارستانیوں سے باخبر کرو گے، جبکہ وہ تمہیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ (یوسف ۱۵)

اسی سورت کی بائیسویں آیت کے بموجب یہ وحی "وحیِ نبوت" نہیں تھی، بلکہ خدا کی طرف سے یوسفؑ کے دل میں ایک الہام تھا تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ خدا ان کا محافظ ہے اور وہ ہی نہیں اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے بھائی اپنی ان کارستانیوں پر پشیمان ہوں گے۔ اور یہی چیز ان دردناک لمحات میں وحی تھی جس نے یوسفؑ کے دل میں امید کی کرن کا کام کیا۔

فخر رازی نے سورہ طٰہٰ کی ۳۸ ویں آیت کے ذیل میں مادرِ موسیٰؑ پر وحی کے بارے میں گفتگو کے ضمن میں چھ احتمال پیش کیے ہیں جن میں سے بیشتر خلافِ ظاہر ہیں، کیونکہ اس کا ظاہری معنی تو "قلب میں القا" ہے یا "فرشتے کی آواز کا سننا، ہے جو اس کے لغوی معنی سے بھی ہم آہنگ ہے۔ [۱]

اور دوسری قسم وہ پیغام ہے جو خدا کے کسی فرشتے کے ذریعہ جناب مریمؑ تک ان کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کی ولادت کے بارے میں

---

[۱] مزید تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی بائیسویں جلد کے صفحہ ۵۱ کا مطالعہ فرمائیں۔

بھیجا گیا، اورقرآن مجید نے سورہ مریم کے اوائل میں جناب مریمؑ کی اس فرشتے کے ساتھ تفصیلی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو ایک خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے مجسم ہوکر آ گیا تھا۔

اس قسم کی وحی کا روشن نمونہ وہ الہام ہے جو آئمہ معصومین علیہم السلام کے مقدس دلوں میں ہوتا ہے اور روایات میں اس سلسلے میں کئی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے آئمہ اطہار علیہم السلام کے منبعِ علم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"مبلغ علمنا ثلاثة وجوه، ماض، وغابر وحادث، فاما الماضی فمفسر، واما الغابر فمزبور واما الحارث فقذف فی القلوب، ونقر فی الاسماع، وهو افضل علمنا ولانبی بعد نبینا"

یعنی ہماری علمی حدود (اور اس کا منبع) تین قسموں پر ہے، گزشتہ، آئندہ اور حادث۔ جو گزشتہ ہے وہ وہ ہے جس کی (ہمارے لیے گزشتہ آئمہ اور حضرت رسول اکرمؐ کی طرف سے) تفسیر کی گئی ہے جو آئندہ ہے وہ لکھا جا چکا ہے (اور وہ ایسی تعلیمات ہیں جو گزشتہ معصومینؑ کی طرف سے ہمارے لے یادگار کے طور پر موجود ہیں) اور جو حادث ہے وہ وہ ہے جو ہمارے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (اور الہام ہوتا ہے) اور آہستہ سی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں جا پہنچتی ہے۔ اور یہ قسم ہمارے علوم کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ البتہ ہمارے پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی اور پیغمبر کبھی نہیں آئے گا۔[1]

ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"واما النكت فی القلوب فهوالالهام، واما النقرفی الاسماع فحديث الملائكة، نسمع كلامهم ولانری اشخاصهم"

جو دلوں میں اشارہ ہوتا ہے، وہ وہی الہام ہے۔ جو کانوں میں اشارہ ہوتا ہے وہ فرشتوں کا کلام ہے۔ ہم ان کی باتوں کو سنتے ہیں لیکن ان کے جسموں کو نہیں دیکھتے۔[2]

تقریباً روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام معصوم علیہ السلام کے علوم چند ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں! وہ علوم جو انہیں پیغمبر اکرمؐ یا سابق امام سے انہیں وراثت میں ملتے ہیں، یا دستور العمل کی صورت میں لکھے ہوئے ان کے دے دیئے جاتے ہیں اور بعض اوقات روایات

[1] بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۵۶

[2] ارشاد مفید، جلد ۲، ص ۸۰، بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۱۸

میں اسے ''جامعۃ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا مسئلہٗ درپیش آجاتا ہے جو ان منابع میں نہیں ہوتا تو خداوند عالم کی طرف سے انہیں یا تو قلبی الہام ہوتا ہے یا پھر فرشتے کی آوز کے ذریعہ آگاہ ہوجاتے ہیں (جیسا کہ حضرت مریمؑ آگاہ ہوئی تھیں)۔

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس وحی کا ''وحیِ نبوت'' سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی وحی کی قسم سے ہوتی ہے۔

اصولی طور پر آج کی اصطلاح میں عام طور پر وحی کا اطلاق ''وحیِ نبوت'' پر ہوتا ہے، اور ان جیسے حالات کو ''الہام'' کہتے ہیں اور علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول کیا ہی بہتر ہے کہ ہم ایسی چیزوں کو 'الہام کہیں' کیونکہ یہ دینی ادب کے لحاظ سے نہایت ہی مناسب ہے۔[1]

اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے بحارالانوار جلد ۲۶، ابواب علوم آئمہ اور اصول کافی' جلد اوّل' باب "ان الائمۃ محدثون" کی طرف رجوع کریں۔

۸۔ پیغمبرِ اسلامؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی تھی؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ہم وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ اس کا تعلق ایسے ادراک اور بصیرت سے ہے جو ہمارے احساس اور عقل کی دنیا سے باہر ہے۔ ہم تو صرف وحی کے آثار کو ہی دیکھتے ہیں اور اثر سے مؤثر کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں۔ اسی لیے اس اسرار آمیز کائنات تک رسائی کی کوشش بیہودہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی معصوم امام علیہ السلام سے کیفیت وحی کے بارے میں سوال ہوتا تو وہ اس کا سربستہ جواب دیتے جو ''وحی'' کی حقیقت کا فقط ایک پرتو ہوتا۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے ''اعتقادات'' میں وحی کے بارے میں ایک تفصیلی گفتگو کی ہے جو تقریباً اخبار اور روایات ہی سے لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''ہمارا عقیدہ ہے کہ اسرافیل کے سامنے ایک لوح ہے، جب خداوند عالم کوئی وحی بھیجنا چاہتا ہے تو وہ لوح اسرافیل کی پیشانی سے جا ملتی ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ درج ہوتا ہے اسے پڑھ لیتے ہیں۔ پھر وہ سب کچھ میکائیل کو القاء کرتے ہیں۔ میکائیل جبرائیل کو اور جبرائیل انبیاء کو القاء کرتے ہیں۔ لیکن وہ بیہوشی کی حالت جو آنحضرتؐ کو عارض ہوجاتی بدن سنگین ہوجاتا اور پسینہ سے شرابور ہوجاتے تھے، وہ اس وقت ہوتی تھی جب خداوندِ عالم انہیں راہِ راست مخاطب فرماتا تھا لیکن جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے پاس کبھی بھی بغیر

[1] المیزان، جلد ۱۲، ص ۳۱۲

اجازت کے نہیں آتے تھے اور آپؐ کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے تھے۔[۱]

اس قسم کی حدیث کا روایات میں اجمالی ذکر موجود ہے۔

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوئی تو آپؐ اپنے چہرے کے سامنے آہستہ سے زمزمہ کی آواز کو ساعت فرماتے تھے۔[۲]

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب سرکارِ رسالتؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے پسینہ جاری ہو جاتا تھا خواہ وہ دن سخت سردی ہی کیوں نہ ہوتا۔[۳]

بہرصورت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی مختلف صورتوں میں نازل ہوتی تھی اور ہر ایک صورت کے اپنے آثار ہوتے تھے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کبھی تو اپنی اس اصلی صورت میں نازل ہوتے جو خدا نے بنائی ہے اور ایسا تقریباً آنحضرتؐ کی ساری زندگی میں صرف دوبار ہوا ہے (جیسا کہ بعض تفاسیر کی بناء پر سورہ نجم میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔[۴] اور کبھی فرشتۂ وحی ''توحید کلبی'' کی صورت میں نمایاں ہوتے۔[۵] و [۶]

۹۔غریزی الہامات

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید اور اسی طرح لغت کی کتابوں میں ''وحی'' کا ایک نہایت ہی وسیع معنی ہے، جن میں سے ایک کا ایک مصداق خاص ''غریزی ادراک'' ہے جو حیوانات میں پایا جاتا ہے اور اس کی کوئی مساوی تفسیر نہیں کی جاسکتی، بلکہ ان کا وجود عالمِ مادرائے طبیعت

---

[۱] اعتقادات، صدوق ص ۱۰۰

[۲] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۵۴، حدیث ۹ و ص ۲۵۶ حدیث ۶

[۳] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۱

[۴] فی ظلال القرآن، جلد ۷، ص ۳۰۶

[۵] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۷

[۶] ''وحیہ بن خلیفہ کلبی'' پیغمبر اکرمؐ کے رضاعی بھائی تھے اور اس دور کے خوبصورت ترین انسان تھے۔ جب جبرائیل امینؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تو انہی کی صورت میں ظاہر ہوتے (مجمع البحرین، مادہ وحی) ان کا شمار آنحضرتؐ کے مشہور اصحاب میں ہوتا ہے اور خوبصورتی میں مشہور تھے۔ حضور اکرمؐ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر روم کے بادشاہ ''ہرقل'' کی طرف بھی بھیجا تھا۔ ۶ ھ یا ۷ ھ میں معاویہ کی حکومت کے زمانے تک زندہ رہے۔ (لغت نامہ دہخدا)

میں علم وقدرت کے اس عظیم منبع کے وجود پر ایک دلیل ہے۔

قرآن مجید نے شہد کی مکھی کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ سورہ نحل کی آیات ۶۸، ۶۹ میں اس جانور کی حیران کن کیفیت کی طرف ایک پُرمعنی اشارہ ہے۔

دورِ حاضر میں دانشوروں نے شہد کی مکھیوں پر زبردست تحقیق کی ہے جس سے آج تک حاصل ہونے والے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعجب آور اور حیران کن اجتماعی زندگی اور تمدن ہے جو انسانی زندگی اور تمدن پر کئی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ایسی خوبصورتی اور چابکدستی سے گھر تیار کرتی ہیں کہ انجینئر نگ کے تمام قواعد کو پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔شہد کی جمع آوری، اسے تیار کرنے، اکٹھا کرنے اور اسے ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کے طور طریقے، اولاد کی تربیت کا انداز، دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع، بچوں کی پرورش، پھولوں کے وجود کا پتہ لگانے والی مکھیوں کا چھتے میں رہنے والی دوسری مکھیوں کو مطلع کرنے کا طریقہ کار، اور انہیں اس جگہ کے فاصلے، درجے اور زاویئے کے لحاظ سے صحیح صحیح نشاندہی کرنا تاکہ وہ وہاں تک اجتماعی صورت میں پہنچ سکیں، وغیرہ ایسے امور میں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ ایسے امور ہیں جن کی انجام دہی ''غریزی الہام'' کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔

بعض ماہرین کے بقول اب تک جنگلی زنبور عسل کی ۴۵۰۰ قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں، لیکن جو باعثِ تعجب ہے وہ یہ کہ ان سب کی ہجرت، چھتہ بنانے اور پھولوں وغیرہ سے رس حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔[1]

افسوس کہ ہماری بحث کی نوعیت ہی اس قسم کی ہے کہ اصل موضوع سے باہر نہ ہوں، ورنہ زنبورِ عسل اور ان کی اسرار آمیز زندگی کے بارے میں گفتگو کے لیے بہت کچھ ہے، جن میں سے ان کا صرف ایک نمونہ اس کا چھ ضلعی گھر بنانا ہے جس میں انجنیئر نگ کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے زاویوں کی صحیح معنوں میں رعایت کی گئی ہے۔

ماہرینِ تعمیرات بڑی کاوشوں، تجربوں اور مطالعات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کے کمروں میں رہنے والوں کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے لیکن ان پر مواد (میٹریل) بہت کم خرچ آتا ہے، کیونکہ ہندسی اشکال میں سے صرف تین شکلیں ایسی ہیں کہ جن سے گھر کی صورت بنتی ہے جبکہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔(مثلث متساوی الاضلاع، چار ضلعی اور چھ ضلعی) لیکن انجنیئر نگ کے نقطہ نظر سے چھ ضلعی کمرے کے بنانے پر تعمیراتی سامان بھی کم خرچ آتا ہے اور اس میں پائیداری اور قوتِ مزاحمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ زنبورِ عسل نے دوسری دو قسموں کو چھوڑ کر اسے اپنایا ہے۔۔

اس نے یہ غریزی الہامات کہاں سے حاصل کیے؟ کس یونیورسٹی میں یہ درس پڑھا؟

لیکن یہ غریزی الہامات شہد کی مکھیو ہی میں منحصر نہیں بہت سے دوسرے حیوانات میں بھی اس قسم کے محیرالعقول نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوتا ہے، بطور نمونہ: ایک دانشور اپنی کتاب بنام ''دریا دیارِ عجائب'' میں رقمطراز ہے کہ:

---

[1] کتاب ''اولین دانشگاہ''، جلد ۵، ص ۵۵

''بعض مچھلیوں کا طریقہ کار اسرارِ فطرت میں شمار ہوتا ہے اور کوئی بھی شخص اس کی علت بیان نہیں کرسکتا۔

''قزل آلا' نامی مچھلی سمندر کو ترک کر کے دریاؤں کے ان میٹھے پانیوں کی طرف لوٹ جاتی ہے جہاں اس نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دریا کی مخالف سمت میں تیرتی ہوئی وہاں پہنچتی ہے۔ اگر درمیان میں پتھر کی کوئی چٹان آجائے تو وہ اس پر سے کود جاتی ہے، حتیٰ کہ آبشاروں کے نیچے سے بھی کود کر اوپر آجاتی ہے بعض اوقات ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ تمام راستہ ان سے اٹ جاتا ہے، اور جب یہ مچھلیاں اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں جس کی جستجو میں ہوتی ہیں تو وہیں پر انڈے دیتی ہیں اور پھر مر جاتی ہیں۔

یہ مچھلیاں کیونکر کسی مناسب نہر یا دریا کو حاصل کر لیتی ہیں' یہ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بھی زیادہ عجیب کام ہے کیونکہ نہ تو ان کے پاس کوئی نقشہ ہوتا ہے اور نہ ہی پانی کے نیچے ان کی نگاہ زیادہ دور تک جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی ہوتا ہے جو ان کی راہنمائی کرے۔

پھر کہتا ہے کہ:

''اس سے زیادہ عجیب''مار ماہی'' کا طریقہ کار ہے برطانوی مار ماہی جب آٹھ سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو اس جھیل یا دریا کو ترک کر دیتی ہیں جس میں وہ رہ رہی ہوتی ہیں اور سانپ کی مانند رات کے وقت گیلی گھاس میں جا چھپتی ہیں اور چھپتے چھپاتے سمندر کے کنارے پہنچ جاتی ہیں اور پھر تیر کر اوقیانوس اطلسی کو (چوڑائی میں) طے کرتی ہیں اور ''برمودا کے نزدیکی پانیوں مین جا پہنچتی ہیں۔ وہاں پر پانی کی تہہ میں جا کر انڈے دیتی ہیں اور پھر مر جاتی ہیں۔۔۔ مار ماہی کے بچے پانی کی سطح پر آکر اپنے مادری وطن کی جانب سفر کا آغاز کرتے ہیں (وطن پہنچتے پہنچتے) انہیں دو تین سال لگ جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا کہ مار ماہی نے یہ راستہ اس پہلے سے نہیں دیکھا تھا پھر کہ کیونکر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے؟

اور یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آپ بھی دوسرے عقلمندوں کی طرح دے سکتے ہیں (یعنی منفی جواب) کیونکہ اس کا سوال جواب کسی کو معلوم نہیں۔ [1]

بعض مہاجر پرندے بہت طویل راستے طے کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ یورپ سے جنوبی افریقہ تک کی دور دراز راہوں کو طے کرتے ہیں اور اپنے راستے میں کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے ایک لمبے عرصے تک یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ یہ پرندے اس قدر دشواری کے باوجود ایسے کٹھن راستوں کو کیونکر طے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کافی مدت تک یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا۔

---

[1] ''دریا در یارِ عجائب'' ص ۱۱۶، ص ۱۱۷

چنانچہ بعض دانشوروں نے مفصل اور پیچیدہ تجربات سے ثابت کے ہے کہ ان میںسے کچھ پرندے ایسے ہیں جو اپنی رواہوں کو آسمانی ستاروں کے ذریعہ متعیّن کرتے ہیں۔

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ غریزی طور پر ہی ستاروں کے مجموعوں کو پہنچانتے ہیں او جانتے ہیں کہ وہ آسمان میں کیونکر اپنی جگہ بدلتے ہیں اور سال کے بارہ مہینوں میں ان کی جگہ کہاں کہاں ہوتی ہے۔ حتّی کہ جب موسم ابر آلود ہو اور کبھی کبھار ایک ستارہ چمکتا ہوا نظر آجائے تو بھی اس کے ذریعہ وہ اس راہ کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

تجربات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان پرندوں کی آسمان 'فلکی صورت حال' ستاروں کی حرکات وغیرہ کی شناخت انہیں وراثت میں ملی ہے یعنی اگر انھوں نے آسمان کو نہ بھی دیکھا ہو تو بھی وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔

دانشوروں کو اب تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ آسمان اور دیگر ماحول کی اس قدر تفصیلی تصویر ان جانوروں کو کیونکر وراثت میں ملتی ہے، جبکہ صدیاں ڈ گزرنے کے ساتھ ساتھ آسمان کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ (تو پھر) ابتدائی نسلیں یہ معلومات کہاں سے حاصل کر پائی ہیں؟[1]

اس موضوع کا ایک اور واضح نمونہ وہ عمل ہے جو ''آکسیک لوپ'' نامی پرندہ انڈے دیتے وقت انجام دیتا ہے۔ ایک فرانسیسی دانشور مسٹر ''وارڈ'' اس پرندہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس پرندہ کے بارے میں کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب اس کے انڈے دینے کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو اور مر جاتا ہے یعنی اس نے کبھی بھی اپنے نومولود چوزوں کی صورت نہیں دیکھی۔ اسی طرح نومولود بچوں نے کبھی اپنی مہربان ماں کا چہرہ نہیں دیکھا جب وہ انڈوں سے باہر آتے ہیں تو بے پروبال کیڑوں کی مانند ہوتے ہیں اور اپنی خوراک حاصل کرنے پر قادر نہیں ہوتے حتّی کہ ان حوادث کا دفاع بھی نہیں کر سکتے جوان کی زندگی سے جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ایسی حالت میں کسی محفوظ مقام پر ایک سال تک رہنا چاہیئے اور اس عرصے کی غذا بھی ان کے پہلو میں موجود رہنی چاہیئے یہی وجہ کہ جب مادہ پرندہ کو اس احساس ہوتا ہے کہ اس کے انڈے دینے کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ بڑی لکڑی کا ایک ٹکڑا تلاش کرتی ہے اور اس میں ایک بہت گہرا سوراخ کرتی ہے پھر وہ اپنی خوراک کی تلاش میں نکل جاتی ہے اور درخت کے نرم پتے اور شگوفے اکٹھے کرتی ہے جو نومولود کے لیے غذا کی صورت میں قابلِ استفادہ ہوتی ہے یہ ایک سال کی مدت تک کے لیئے نوزاد کے لیے کافی ہوتی ہے اور اسے وہ سوراخ کے آخر میں جمع کر دیتی ہے پھر اس کے اوپر ایک انڈہ دیتی ہے اور لکڑی کے برادے کے خمیر کی ایک مضبوط سی چھت اس کے بنا دیتی ہے پھر غذا کی تلاش میں نکل

---

[1] کتاب ''حواس اسرار آمیز حیوانات'' از ''ویٹس ڈروچز'' ترجمہ لالہ زاری ص ۱۶۷ و ص ۱۷۱

جاتی ہے اور ایک سال کی غذا جمع کرنے کے بعد اس پر ایک اور انڈہ دیتی ہے اور اس کا اسی طرح منہ بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح کی کئی منزل تیار کر کے انڈوں کا نصاب مکمل کر لینے کے بعد مر جاتی ہے۔[1]

اس قسم کی وسیع معلومات پرندوں اور جانوروں کو کس نے بہم پہنچائی ہیں جنھوں نے ماں کی صورت تک کو نہیں دیکھا ہوتا' یا ماؤں نے بچوں کے چیزوں کو نہیں دیکھا ہوتا کسی کے پاس اس کا سوال کا جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ ''خداوندِ بزرگ و برتر کی طرف سے غریزی الہامات ہی نے انہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔

[1] کتاب ''فیسوف نما'' ص ۲۲۹

چھٹا منبع

کشف شہود

اشارہ

معرفت کا چھٹا اور آخری منبع ''قلبی مشاہدہ اور مکاشفہ'' ہے۔

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس منبع کی تعریف کی جائے جس سے بہت لوگ ناواقف ہیں، تاکہ اس طرح سے ایک تو اس کا دوسرے منابع یعنی وحی والہام' فطرت' اور عقلی ادراکات سے فرق واضح ہو جائے اور دوسرے نادان اور بے سمجھ لوگ اسے وہم وخیال پر محمول نہ کریں۔

اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے جو لوگ ناجائز مفاد اٹھاتے ہیں وہ رستے بھی بند ہو جائیں کیونکہ اس طرح سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اس منبع کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

اصولی طور پر اس کائنات کی تمام چیزیں دو قسموں پر ہیں۔

۱۔ وہ چیزیں جو حسّ کے ساتھ قابل ادراک ہیں اسے ''عالمِ حسّ'' کہتے ہیں۔

۲۔ وہ جبیں جو ہماری حسّ سے مخفی اور غائب ہیں اسے ''عالمِ غیب'' کہتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک تازہ ادراک اور نظر پیدا کر لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ غیب کی دنیا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور اپنی قدرت وتوانائی کے مطابق اس عالم کے کچھ حصے کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، باالفاظ دیگر درمیان سے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور غیب کی دنیا کے بعض حقائق اس پر منکشف ہو جاتے ہیں، بلکہ اسی طرح جس طرح انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ عالمِ محسوسات میں دوسری چیزوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی کئی درجے تسلی بخش اور واضح تر صورت میں۔اور اس حالت کو ''مکاشفہ' یا شہود باطن'' کہتے ہیں اور وہ وہی چیز ہے جسے قرآن مجید نے سورہ تکاثر کی پانچویں اور چھٹی آیت میں یوں پیش کیا ہے:

''کلالو تعلمون علم الیقین الترون الجحیم'' ایسا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو اگر تمہارے پاس علم الیقین ہو تو تم دوزخ کو اپنی انہی آنکھوں سے دیکھ لو۔

مختلف اسلامی روایات میں ''مجرمین'' اور ''مومنین'' جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو ان پر شہود کی حالت'' طاری ہو جاتی ہے اور وہ فرشتوں کا یا خدا کے نیک بندوں کی ارواح کا مشاہدہ کرتے ہیں جبکہ ان کے بالکل ہی قریب کے لوگ اس قسم کے ادراک سے قطعاً

عاجز ہوتے ہیں۔

بعینہ اسی طرح جس طرح جنگِ خندق میں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طاری ہوئی تھی۔ جب آپؐ نے پتھر پر ہتھوڑا مارا تو اس سے ایک چنگاری اٹھی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ''میں نے کسریٰ یا قیصرِ روم یا یمن کے شاہی محلات کو دیکھا ہے (چنانچہ اس کی شرح آگے آئے گی) [۱]

وہی کچھ جو اس مشہور و معروف حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادرِ گرامی جناب آمنہؑ کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا جب سرکار رسالت مآبؐ میرے شکم مبارک میں تھے ''میَں نے دیکھا کہ ایک نور مجھ سے باہر آیا ہے جس کی روشنی میں میَں نے شام میں سر زمین ''بصریٰ'' کو دیکھ لیا'' اور اس قسم کے دوسرے بہت سے نمونے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز بعد میں آیات واحادیث کے ذریعہ ان سب کی طرف اشارہ کیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ یہ نہ تو وحی ہے اور نہ ہی قلبی الہام، بلکہ ایک قسم کا مشاہدہ اور درک و دید ہے جو حسّی مشاہدہ سے بالکل ہی مختلف ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے مشہور و معروف عارف اور سخن سنج نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

''اگر تمہاری آنکھ غیب کو دیکھ سکتی ہو تو اس دنیا کا ایک ایک ذرہ تمہارا ہمراز ہوسکتا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہوجائے گی تو کائنات میں موجود تمام چیزوں کی تسبیح کے غلغلہ کو سن کر ہر قسم کی تاویلوں کے وسوسے تم سے دور ہوجائیں گے نامحرم لوگوں کے کان ایسے حقائق کو نہیں سن سکتے۔ لیکن جو لوگ محرم راز بن جاتے ہیں وہی ان آوازوں کے سننے اور رازوں کو پہچاننے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ [۲]

بنابریں ''کشف شہود'' کی ان مختصر الفاظ میں یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ:

کشف وشہود نام ہے حس سے ماوراء ایک اور عالم تک رسائی کا اور اندر کی آنکھوں کے ذریعہ اس عالم کے حقائق کے مشاہدہ کے ایسا مشاہدہ جو بالکل حسّی مشاہدہ کی مانند ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طاقتور، یا گوشِ جان سے ان زمزموں کے سننے کا۔

البتہ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس جو بھی اس چیز کا دعویٰ کرے اسے قبول کرلیا جائے اور نہ ہی ہر مدعی کی باتوں پر کان دھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری گفتگو معرفت کے اس منبع کے اصل وجود کے بارے میں ہے اور بعد میں یہ بتایا جائے گا کہ وہاں تک کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے اور آخر میں اس منبع کے سچے اور جھوٹے دعویداروں کی شناخت کا طریقہ بتایا جائے گا۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا ثواب حاصل کرتے ہیں:

---

[۱] تاریخ کامل، ابن اثیر جلد ۲، ص ۱۷۹

[۲] مشہور اشعار کا خلاصہ

آیات

۱۔ وَ كَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ
الۡمُوۡقِنِيۡنَ﴿۷۵﴾ (سورہ انعام ۷۵)
۲۔ وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ وَسَتُرَدُّوۡنَ اِلٰى
عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴿۱۰۵﴾ (سورہ توبہ ۱۰۵)
۳۔ مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰى﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوۡنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى﴿۱۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً
اُخۡرٰى﴿۱۳﴾ عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى﴿۱۴﴾ (سورہ نجم ۱۱ تا ۱۴)
۴۔ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ﴿۶﴾ (سورہ تکاثر ۵ تا ۶)
۵۔ يَوۡمَ يَرَوۡنَ الۡمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشۡرٰى يَوۡمَئِذٍ لِّلۡمُجۡرِمِيۡنَ وَيَقُوۡلُوۡنَ حِجۡرًا
مَّحۡجُوۡرًا﴿۲۲﴾ (سورہ فرقان ۲۲)
۶۔ وَاِذۡ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الۡيَوۡمَ مِنَ
النَّاسِ وَاِنِّيۡ جَارٌ لَّكُمۡ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الۡفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيۡهِ وَقَالَ اِنِّيۡ
بَرِيۡٓءٌ مِّنۡكُمۡ اِنِّيۡۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّيۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ﴿۴۸﴾
(سورۃ انفال ۴۸)
۷۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّيۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ﴿۹۴﴾
(سورۃ یوسف ۹۴)
۸۔ فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۫ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا
سَوِيًّا﴿۱۷﴾ (سورۃ مریم ۱۷)

ترجمہ

۱۔ہم نے یوں ابراہیم کو زمین و آسمان کی ملکوت دکھائیں تا کہ وہ اہلِ یقین بن جائے۔

۲۔ کہہ دو کہ عمل کیے جاؤ۔ خدا' اس کا رسول اور مؤمنین تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں ۔ اور تم بہت جلد ہی اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو چھپی ہوئی اور ظاہری چیزوں کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے تمہیں باخبر کرے گا۔

۳۔ جو کچھ اس (پیغمبرؐ) نے دیکھا، اس کے دل نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔ کیا تم اس کے ساتھ اس چیز میں جھگڑتے ہو جو کچھ اس نے دیکھا ہے اور ایک اور مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہے، سدرۃ المنتہٰی کے قریب؟

۴۔اس طرح نہیں ہے جیسے تم سمجھتے ہو۔ اگر تم علم الیقین رکھتے ہو تو دوزخ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھو گے۔

۵۔جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ دن مجرمین کی خوشخبری کا نہیں ہوگا (بلکہ ان کی سزا کا دن ہوگا)۔ وہ کہیں گے ہمیں امان دو ہمیں معاف کر دو۔

۶۔ اور (جنگ بدر کے دن کو یاد کرو) جب شیطان نے ان (مشرکین) کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر کے کہا آج لوگوں میں سے کوئی شخص تمہارے اوپر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اور میں تمہارے ساتھ ساتھ (تمہارا پشت پناہ) ہوں۔ لیکن جب انہوں نے (مسلمانوں اور ان کے حامی فرشتوں کے) دو گروہوں کو دیکھا تو وہ پیچھے پلٹ کر کہنے لگا میں تم سے بیزار ہوں میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے میں خدا سے ڈرتا ہوں' اور خدا تو شدید العقاب ہے

۷۔ جب (مصر کی سرزمین سے) قافلہ جُدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوبؑ) نے کہا: میں یوسف کی خوشبو کو محسوس کر رہا ہوں' اگر تم مجھے نادانی اور بے عقلی کی نسبت نہ دو تو!!

۸۔اور (مریمؑ نے) ایک پردہ اپنے اور ان کے درمیان ڈال دیا (تا کہ اس کی خلوت کا مقام ہر لحاظ سے آمادہ ہو) اور اس حالت میں ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا اور وہ (روح) ایک بے نقص و عیب انسانی شکل و صورت میں مریمؑ پر ظاہر ہوئی۔

الفاظ کی تشریح

"ملکوت" دراصل ''مُلک'' (بروزن حُکم) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنیٰ ''حاکمیت'' اور ''مالکیت'' ہیں اور اس کے ساتھ ''و'' اور ''ت'' کا اضافہ تاکید اور مبالغہ کے لیے کیا گیا ہے اور "ملکوۃ" (بروزن مرُدمک) کے معنیٰ ''حکومت اور عزت'' ہیں۔

علامہ ''طریحی'' مجمع الجرین'' میں کہتے ہیں کہ ''ملکوت'' (بروزن برہُوت) عزت، سلطنت اور مملکت کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض ارباب لغت نے تو اس کا معنی ''عظیم حکومت'' کیا ہے اور وہ ''مفرداتِ راغب'' کے معنی کے بھی مطابق ہے۔ اور تفسیر المیز ان میں اس کے متعلق یوں تحریر ہے:

عرفِ قرآن میں ''ملکوت'' کے معنی چیزوں کی باطنی صورت'' ہیں، جس کا ہمیشہ خداوند متعال سے رابطہ اور تعلق رہتا ہے اور ہمیشہ اس باطنی صورت کا مشاہدہ ''یقینی ایمان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے' جیسا کہ سورہ یٰس کی ۸۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے ''فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شی'' یعنی پاک ومنزہ ہے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے۔ [۱]

''فؤاد'' کے بارے میں جیسا کہ پہلے بھی تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے، اس کے معنی ''قلب'' اور ''روح'' ہیں جب وہ پختگی کی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اور ''وأد'' (بروزن ابر) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ''بھوننا'' ہے۔

''آجِدُ'' ''وجود'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ''پانا'' ہے کبھی تو یہ ''پانا'' حواس کی ظاہری صورت سے عمل میں آتا ہے، جیسے کہ آنکھ کے ساتھ دیکھنا کان کے ساتھ سننا خوشبو یا بدبو کا قوتِ شامہ کے ذریعہ سونگھنا اور کبھی اندرونی حواس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس، یا سیر ہونے کا احساس یا رنج وغم کا احساس، اور کبھی عقل کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے خدا کو مختلف دلائل کے ساتھ پالینا۔

''تمثل'' ''مثول'' (بروزن عقول) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی شخص یا چیز کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا، کیونکہ ''مُمثِل'' بروزن مفصل اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے شخص یا دوسری چیز کے سامنے نمایاں یعنی ظاہر ہو، اسلامی روایات اور تواریخ میں ''تمثل'' کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ''دارالندوہ'' میں ابلیس کا عرب کے مشرکین کے سامنے ظاہر ہونا، جس دن کہ وہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے اکٹھے ہو کر سازشیں تیار کرنے میں مصروف تھے، تو وہ (ابلیس) خیر اندیش اور خیر خواہ شخص کی صورت میں ''متمثل'' (ظاہر) ہوا۔ [۲]

اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام کے سامنے ''دنیا'' کا ایک دلربا اور دلفریب عورت کی صورت میں ظاہر ہونا اور آنجنابؑ پر اس کا کوئی جادو نہ چلنا کہ یہ داستان بہت مشہور ہے۔

یا قبر اور قیامت میں انسان کے اعمال کا مناسب صورت میں مجسم ہو کر سامنے آجانا، جسے اسلامی روایات میں ''تمثل'' کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

اور ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی صورت ایک اور شکل اختیار کرلے گی لیکن اس کے باطن اور ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی

---

[۱] تفسیر المیز ان، جلد ۸ ص ۳۶۴

[۲] تفسیر المیز ان، جلد ۱۴ ص ۳۷

رونما نہیں ہوگی۔ [۱]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

غیب کا مشاہدہ

زیرِ بحث آیات کے سلسلے کی پہلی آیت میں توحید کے علمبردار نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شرک اور بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمائی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ابراہیمؑ ہی کے ایمان ویقین کی بلند منزلوں اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔ اور شاید یہ اُن حضرتؑ کے لیے خداوندِ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا انعام ہو جو انہوں نے بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمائی کی ہے اور وہ یہ کہ خدا نے انہیں آسمان اور زمین کی ملکوت دکھائیں اور وہ اہلِ یقین ہو گئے یعنی عین الیقین اور حق الیقین کے مقام ومرتبے تک پہنچ گئے۔

"السمٰوات" جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف لام بھی داخل ہے جو عموم کے معنی میں ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی ملکوت یعنی حاکمیت سے آگاہ کیا، خواہ وہ آسمانوں میں تھی یا کواکب اور ثوابت وسیار اور کہکشانوں وغیرہ میں۔ اسی طرح تمام روئے زمین کی حاکمیت سے بھی آگاہ کیا خواہ وہ ظاہری تھی یا باطنی۔ اور قرآن مجید نے اس آگاہ سازی کو 'اراۃ'' (دکھلانے) سے تعبیر کیا ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ انسان ظاہری آنکھ اور عقلی دلائل سے ان تمام حقائق کا مشاہدہ نہیں کرسکتا اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اندرونی شہود کے ذریعہ اور ان پردوں کو ہٹا کر ہی یہ حقائق ابراہیمؑ کو دکھلائے جو عام طور پر ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں اور ہم سے بہت سے حقائق کو چھپائے ہوئے ہیں۔

''فخرالدین رازی'' نے اپنی تفسیر میں اس "ارائه" (دکھلانے) کے بارے میں دو احتمال ذکر کیے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد "حسی ارائه" ہے اور دوسرا یہ کہ عقلی دلائل کے ذریعہ اراۃ ہے۔ پھر اس بارے میں نومختلف دلائل بیان کرنے کے بعد دوسرے احتمال کی آیت کی تفسیر میں وضاحت کرتے ہیں۔ [۲]

لیکن جس طرح کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوئی انسان نہ تو حس کے ذریعہ اور نہ ہی عقل کے ذریعہ تمام کائنات پر خدا کی حاکمیت کے تمام اسرار سے مطلع ہوسکتا ہے، بلکہ اس بات کے لیے ایک اور ادراک اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں پڑھتے ہیں کہ:

''اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ کو آفرینش کے مخفی امور سے آگاہ کرنا ہے اور ان آیات سے پردہ اٹھانا ہے جو کتابِ ہستی (کائنات)

---

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ص ۳۷

[۲] تفسیر کبیر، جلد ۱۳ ص ۴۳

کے اوراق پر مشتمل ہیں، تاکہ وہ یقینِ کامل کے درجہ تک پہنچ جائیں[1]۔

باالفاظ دیگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے فطری اور استدلالی توحید کے مراحل کو سورج چاند اور ستاروں کے طلوع اور غروب سے طے کیا، اور بُت پرستوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں لگ گئے اور اس عظیم جہاد کے پرتو میں توحید کے مراحل یکے بعد دیگر لے طے کرتے رہے۔ آخر کار اس مرحلہ تک جا پہنچے کہ خداوند نے ان کے دل میں تمام پردے ہٹا دیئے اور وہ عالم کے باطن کے شہود تک جا پہنچے۔

اسی لیے ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک حدیث پڑھتے ہیں:

"کشط لابراھیم علیہ السلام السموات السبع حتی نظر مافوق العرش و کشط له الا رضون السبع و فعل بمحمد مثل ذالك .... والائمة من بعده قد فعل بھم مثل ذالك"

''خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے سے ساتوں آسمانوں کے پردے ہٹا دیئے، حتٰی کہ ان کی نگاہیں عرش کے اوپر تک پہنچ گئیں۔ اسی طرح ساتوں زمینوں کے پردے بھی ہٹا دیئے، اور یہی کام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا...... اور آپؐ کے بعد آنے والے آئمہ علیہم السلام کے ساتھ بھی۔[2]

تفسیر ''برہان'' میں اس بارے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں جو ساری کی ساری اس بات کی شاہد ہیں کہ اس قسم کا درک اور بصیرت، حسّی اور عقلی درک وبصیرت سے بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، تفسیر المیزان میں ہے کہ ''ملکوت'' اشارہ ہے اشیاء کے وجود کی طرف کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ہوتی ہے اور وہ اس کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا ابراہیمؑ نے مشاہدہ فرمایا تھا اور جس کے ذریعہ وہ خالص توحید سے آشنا ہوئے تھے۔[3]

تفسیر ''درمنثور'' میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت ابن عباس کے ذریعہ نقل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے پردے ہٹا دیئے تھے اور ملکوتِ آسمانی یعنی پوری کائنات پر اپنی قدرت اور حاکمیت کے اسرار ابراہیم علیہ السلام کو دکھا دیئے تھے۔[4]

دوسری آیت میں زکوٰۃ، صدقات اور توبہ کے حکم کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۳ ص ۲۹۱

[2] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۵۳۱ حدیث ۲ (حدیث ۳ و ۴ بھی اسی چیز کو بیان کررہی ہیں)۔

[3] المیزان، جلد ۷، ص ۱۷۸

[4] المیزان، جلد ۳، ص ۲۴

''مومنین سے کہہ دیجئے کہ عمل بجالاتے رہو کیونکہ خدا، رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کی طرف سے اعمال کا مشاہدہ تمام انسانوں کے تمام اعمال کا مشاہدہ ہے، خواہ وہ نیک ہیں یا بد کسی کے سامنے انجام دیئے جائیں یا چھپ کر۔ اسی دلیل کے تحت (سیاق کے اتحاد کے پیشِ نظر) پیغمبرِ اکرمؐ کا مشاہدہ بھی اسی قسم کا ہونا چاہیئے، کیونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے۔ لیکن ''مومنین'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ اگر مختلف قرائن کو دیکھا جائے تو اس سے مراد پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم جانشین ہیں (نہ کہ تمام مؤمنین)۔

اور چونکہ حسّی مشاہدہ یا عقلی دلائل کے ساتھ تمام انسانوں کے تمام اعمال سے آگاہی حاصل نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ آیت بھی اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہارؑ ایک اور ادراک وبصیرت کے حامل ہیں جو مومنین کے نیک وبد اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اور فخر رازی نے اپنی تفسیر میں جو یہ کہا ہے کہ ''اس سے مراد تمام مومنین ہیں'' تو پھر وہ اس مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ تمام مومنین ایک دوسرے کے اچھے اور برے اعمال سے باخبر نہیں ہوتے۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''ان اعمال کی خبر ان تک پہنچ جاتی ہے'' حالانکہ یہ ایک لا حاصل تکلف ہے اور مکمل طور پر ظاہر کے خلاف ہے

علاوہ ازیں اسی آیت کی تفسیر میں آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ ''ہر صبح کو (صبح کے ذکر کے بغیر) بندوں کے اعمال پیغمبرِ خداؐ اور آئمہ اطہارؑ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اگر یہ اعمال معصیت اور گناہ پر مبنی ہوں تو وہ غمگین ہوجاتے ہیں (اور اگر اطاعت پر مبنی ہوں تو خوش ہوتے ہیں)[1]۔

یہ آیت، اس قدر روایات کے ساتھ تمام راہیانِ راہِ حق کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے اعمال ہمیشہ عظیم ہستیوں کے زیرِ نگرانی انجام پا رہے ہیں، اور اس حقیت پر ایمان زبردست تربیتی اثر کا حامل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے معصوم امام کے بارے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ امام فرماتے ہیں:

''اذا صار الامر الیه جعل الله له عمودا من نور یبصر به مایعمل به اهل کل بلدة''

جب امام کے پاس امامت پہنچتی ہے تو خداوندعالم اس کے لیے نور کا ایک ستون قرار دیتا ہے جس کے ذریعہ سے

---

[1] تفسیر برہان، اسی آیت کے ذیل میں۔ بحار الانوار جلد ۲۳، ص ۳۲۶ اور اس کے بعد بیسیوں روایات اس بارے میں نقل کی گئی ہیں اور انہیں مجموعی طور پر تواتر کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور اصول کافی، جلد ۲، ص ۱۵۷ اور جلد اول ''باب عرض الاعمال'' میں تفصیل کے ساتھ یہ ذکر موجود ہے۔

وہ ہر شہر کے لوگوں کے اعمال دیکھ سکتا ہے۔[۱]

اسی سلسلے کی تیسری آیت بہت سے مفسرین کے بقول پیغمبرِ اکرمؐ کے حضرت جبرائیلؑ کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تمام عمر میں دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں مشاہدہ کیا۔ ایک مرتبہ تو بعثت آغاز میں ''جبرائیل'' بالائی افق میں ظاہر ہوئے اور تمام مشرق اور مغرب کو اپنے احاطہ میں لے لیا اور اس قدر باعظمت تھے کہ آنحضرتؐ بھی متعجب ہو گئے۔ اور دوسری مرتبہ معراج کے موقعہ پر۔ اور سوہ نجم کی آیات بھی اس سے پہلے اور دوسرے مشاہدات کی طرف اشارہ ہیں۔

ان دونوں مشاہدات کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ شہود ہے جو آپؐ کو ذاتِ کردگار کی طرف سے نصیب ہوا۔ ذاتِ باری تعالی کا یہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ باطنی آنکھوں سے تھا، اور اس دنیا میں ''لقاء اللہ'' کا روشن مصداق تھا۔ اس کی تفصیل تفسیرِ نمونہ میں سورہ نجم کی آیات کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔[۲]

بہرحال زیرِ بحث آیات کہہ رہی ہیں کہ پیغمبرؐ نے دل کی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ حق اور سچ تھا۔ ان کے دل نے جو کچھ دیکھتا تھا سب صحیح تھا اور ہرگز جھوٹ نہ تھا۔

یہ تعبیر صورت کشف اور شہود باطنی کے مسئلہ پر ایک شاہد ہے جو انسان کی معرفت کے منابع میں سے ایک منبع ہے۔ انسان بھی عام نہیں رسولِ اکرمؐ جیسے انسان۔

تفسیر المیزان میں ہم پڑھتے ہیں کہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ خداوندِ عالم نے یہاں پر مشاہدہ کو قلب کی طرف نسبت دی ہے، کیونکہ انسان ایک اور قسم کے شہودی ادراک کا حامل ہے جو ظاہری حواس کے ساتھ ادراک اور باطنی قوتوں کے ساتھ تخیل اور تفکر سے ماوراء ہے، جیسا کہ ہم اسی شہد کے ساتھ اپنے وجود کا ادراک کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم موجود ہیں، ہماری اپنے وجود سے یہ آگاہی نہ تو ظاہری آنکھوں کے ساتھ ہے اور نہ ہی غور و فکر کے ذریعہ سے بلکہ نفس کے سامنے ایک قسم کا ظہور اور حضور ہے، قرآن میں جسے ''فؤاد'' کہا گیا ہے۔[۳]

بعض اور مفسرین نے بھی صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس آیت میں ''رؤیت'' سے مراد وہی دل کی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام علی بن موسیٰؑ (رضا) علیہ السلام سے آپ کے ایک صحابی نے پوچھا:

''هل رای رسول الله (ص) ربه عزوجل؟'' آیا پیغمبرِ کریمؐ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو آپؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

---

[۱] ''منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغۃ'' جلد ۵ ص ۲۰۰ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس بارے میں احادیث بہت ہیں جو اسی کتاب میں جمع کی گئی ہیں) اور تفسیر برہان میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[۲] تفسیر نمونہ، جلد ۲۲۔

[۳] تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۲۹

"نعم بقلبه رآه. اما سمعت الله عزوجل يقول: ما كذب الفواد مارای، لم يره بالبصر ولكن رأه بالفواد"۔ جی ہاں! انہوں نے خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا کہ قلب نے جو کچھ دیکھا جھوٹ نہیں بولتا۔ یقیناً پیغمبرِ اکرمؐ نے خدا کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ چشمِ دل کے ساتھ مشاہدہ فرمایا۔[1]

یقیناً ''مشاہدۂ قلبی'' سے مراد فکر و استدلال نہیں کیونکہ یہ چیز تو دنیا کے تمام خدا پرستوں اور صاحبانِ ایمان کو حاصل ہے، صرف پیغمبرِ اکرمؐ ہی سے مخصوص نہیں۔

چوتھی آیت میں مومنین یا تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''یہ بات وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں علم الیقین حاصل ہوتا تو تم جہنم کو دیکھ لیتے'' پھر فرماتا ہے ''ثم لترونها عين اليقين'' پھر تم اس کے بعد جہنم کو عین الیقین کے ساتھ دیکھ لو گے۔

آیا یہ مشاہدہ دنیا میں ہوگا یا آخرت میں؟ یا پہلا مشاہدہ دنیا میں اور دوسرا آخرت میں؟ تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ جو کچھ ظاہری طور پر آیات سے سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسری آیت (ثم لترونها عين اليقين) آخرت میں دوزخ کے مشاہدے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس کے بعد فرماتا ہے ''ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم''۔ یعنی پھر اس دن تم سے الٰہی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

بنابریں قاعدہ کی رو سے پہلی آیت یعنی (لترون الجحيم) دنیا کی طرف اشارہ ہونا چاہیئے۔

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ اس آیت کا ظاہر روزِ قیامت سے قبل دوزخ کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی دل کی آنکھوں کے ساتھ جو ایمان اور یقین کے آثار میں سے ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی داستان میں آسمان و زمین کے ملکوت کے مشاہدہ کی بابت مذکور ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بعض مفسرین ہر دو طرح کی رؤیت کو قیامت سے مربوط سمجھتے ہیں، لیکن ان دونوں کے فرق و بیان کرنے میں سخت مشکل میں پھنس گئے، جیسا کہ فخر رازی کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔[2]

بہر حال زیرِ بحث آیت کا ظاہر بتا رہا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص یقین کے اس مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں اور وہ عالمِ غیب کے بعض حقائق کو دیکھ لے۔

پانچویں آیت کافروں کے بار بار کے تقاضوں کی طرف اشارہ ہے جب وہ کہتے تھے ''ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے یا ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھتے'' (فرقان ۲۱)

قرآن اس سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ جب وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور وہ اس وقت خدا کے عذاب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے اور اس دن مجرمین کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ۱۵۳ حدیث ۳۴۔

[2] تفسیر کبیر، فخر رازی، جلد ۳۲ ص ۸۰

''اس دن'' سے مراد کونسا دن ہے، اس بارے میں مفسرین کے دو نظریۓ ہیں۔ کچھ تو اسے روزِ قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ انسان فرشتوں کو دیکھیں گے، لیکن بعض دوسرے حضرات ان آیات کو پیشِ نظر رکھ کر جو ''قبضِ ارواح'' کے فرشتوں کے بارے میں ہیں، کہ اس سے مراد جان کنی کے موقع پر فرشتوں کا مشاہدہ ہے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۹۳ میں ہے:

"ولو تری اذا الظالمون فی غمرات الموت والملائکة باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم"

اگر تو ظالموں کو اس وقت دیکھے جب وہ موت کی لہروں میں پھنسے ہوئے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ اپنی جانوں کو باہر نکالو۔

یا پھر اس سے مراد مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے فرشتوں کا مشاہدہ ہے۔ اور یہ نظریہ مشہور مفسر ابنِ عباس سے نقل ہوا ہے۔[۱]

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

''جب جان کفار کے گلے تک پہنچ جائے گی تو فرشتے ان کے چہرے اور پشت پر ماریں گے اور کہیں گے اپنی جانوں کو باہر نکالو......

اور یہی ہے معنی اس آیت کا کہ جس میں کہا گیا ہے "یوم یرون الملائکة لابشری یومئذ للمجرمین"[۲]

اس تفسیر کے مطابق، موت کے قریب ہی انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھا دیۓ جائیں گے اور وہ خدا کے فرشتوں کو دیکھیں گے اور ان پر کشف وشہود کی حالت طاری ہوجاۓ گی۔

چھٹی آیت ''جنگِ بدر'' سے متعلق ہے جس دن کہ شیطان نے مشرکین کے اعمال کو مزین کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا تا کہ وہ کاموں سے امیدوار، دلگرم اور مطمئن رہیں۔

ادھر دوسری طرف سے مشرکین کی فوجِ قریش اپنی بھاری تعداد اور پوری قوت کے ساتھ (مسلمانوں کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ) مسلمانوں کی صفوں کے سامنے کھڑے تھے اور شیطان مسلسل ان کے دلوں میں یہ بات ڈال رہا تھا کہ اس قدر وسیع، آمادہ اور اسلحہ سے لیس لشکر کے ہوتے ہوۓ تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور میں بھی تمہارے دوش بدوش تمہاری حمایت کررہا ہوں۔

لیکن جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور فرشتے حکمِ خدا سے لشکرِ توحید کی حمایت میں کمربستہ ہو کر کھڑے ہوگئے تو شیطان پیچھے ہٹ گیا اور آواز دے کر کہا: ''اے مشرکین! مَیں تم سے بیزار ہوں'' میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ مَیں مسلمانوں کی فتح کے آثار اور خدائی رحمت اور غیبی امدادوں کی علامتیں دیکھ رہا ہوں میں خدا کی دردناک سزا سے ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ خدا کی سزا بہت ہی سخت ہے۔

اس آیت کے دو حصوں کے بارے میں مفسرین کے درمیان تفصیلی گفتگو ہے۔

---

[۱] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۲۴، ص ۷۰

[۲] تفسیر برہان، جلد ۳، ص ۱۵۸، حدیث ۱

ا۔آیا واقعاً ’’شیطان‘‘ انسانی صورت میں مجسم ہوکر مشرکین کے سامنے آ گیا تھا اوران کے دلوں میں اس قسم کی باتیں ڈالی تھیں یانہیں بلکہ معمول کے مطابق باطنی طور پر ان میں نفوذ کر کے ان کے دلوں میں اثر ڈال رہا تھا؟ بہت سے مفسرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اورمعروف روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ وہ ’’سراقہ بن مالک‘‘ جو قبیلہ ’’بنی کنانہ‘‘ کا مشہور و معروف شخص تھا، کی صورت میں ان کے سامنے ظاہر ہوا۔

جس طرح کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کی داستان میں ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے ’’دارالندوۃ‘‘ میں اکٹھے ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی تجویزوں پر غور وخوض کرنا شروع کیا تو شیطان نے بھی ’’نجدیوں‘‘ کی صورت اختیار کرکے ان کی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ شیطان مجسم ہوکر سامنے آجائے،جس طرح کہ فرشتوں کے بارے میں یہ بات ممکن ہے۔(جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور جناب مریمؑ کی داستان میں بیان ہوا ہے)۔

ب۔آیا واقعاً شیطان نے فرشتوں کو دیکھ لیا تھا کہ وہ میدان میں اتر چکے ہیں یا نہیں۔بلکہ جب اس نے میدانِ جنگ میں غیر متوقع کامیابی کے آثار دیکھے تو اس نے فرشتوں کے نزول اور غیبی امداد کا یقین کرلیا؟ تو اس مقام پر بھی دو نظر یئے ہیں۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد وہی فرشتوں کا دیکھنا ہے اور بعد کی آیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو میدانِ بدر میں فرشتوں کے نزول کو صریحاً بیان کررہی ہیں،آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔

اس طرح سے ’’مومنین‘‘ اور ’’مشرکین‘‘ میں سے کوئی بھی میدانِ جنگ بدر میں فرشتوں کی موجودگی کو نہیں دیکھ رہا تھا جبکہ شیطان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹائے جاچکے تھے اور وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

یہ شیطان کے لیے ایک قسم کا کشف وشہود تھا جو ایک خاص مقصد کے تحت خدا کے حکم سے معرضِ وجود میں آیا۔

ساتویں آیت حضرت یوسفؑ کی داستان کی طرف اشارہ کررہی ہے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت یعقوبؑ کے فرزند ایک کاروان کے ہمراہ خوشی خوشی مصر سے کنعان کی طرف چل پڑے تھے اوراپنے بھائی جنابِ یوسفؑ کو تختِ قدرت پر دیکھ چکے تھے اوران کا کُرتا باپ کی ’’روشنی چشم کے لیے‘‘ تحفہ لیے جارہے تھے۔جونہی قافلے نے مصر سے حرکت کی یعقوب علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا ’’میں یوسفؑ کی خوشبو سونگھ رہا ہوں،اگر تم مجھے نادانی کی نسبت نہ دو‘‘یقیناً یعقوب علیہ السلام سچ فرمارہے تھے اور دور دراز کے فاصلے سے یوسفؑ کے کُرتے کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔یہ ایک ایسا کام تھا جو عام قسم کی قوتِ شامہ کے بس کی بات نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس چیز کو باور نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔اسی لیے انہوں نے اللہ کے بزرگ نبی کو گمراہی کی نسبت دیتے ہوئے کہا: ’’تاللہ انك لفی ضلالك القدیم‘‘ یعنی خدا کی قسم تم تو اپنی سابقہ غلط فہمیوں اور گمراہی پر ہی ہو۔

لیکن جب برادرانِ یوسف آگئے تو معلوم ہوا کہ حق پیر کنعانؑ کے ساتھ ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ ’’مصر‘‘ اور ’’کنعان‘‘ کے درمیان دس دن کا فاصلہ ہے اور بعض میں آٹھ دن کا اور بعض میں دس

فرسخ کا۔[۱]

کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس آیت کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھنا اس بات سے کنایہ تھا کہ ان کی عنقریب ملاقات ہونے والی ہے اور یہ چیز باپ کے دل پر الہام ہوئی تھی (جیسے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی کی خوشبو سونگھنے میں آ رہی ہے) کیونکہ ادبیات کے مسلّم قواعد کی رو سے جب تک الفاظ کا حقیقت پر عمل کرنا ممکن ہے، مجاز پر حمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اور آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ''مکاشفہ'' ہوا تھا، پردے ہٹ چکے تھے اور وہ اس ظاہری احساس سے مافوق ایک اور احساس کی وجہ سے اپنے فرزند یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔

زیرِ بحث آیات کے سلسلے میں آٹھویں اور آخری آیت حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے خدا کے فرشتے کا مجسم اور ممثل ہو کر آنے کو قرآنِ مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے:

> ''مریم اپنے کنبے سے جدا ہو کر مشرقی طرف (بیت المقدس) چلی گئیں۔ اپنے اور لوگوں کے درمیان پردہ ڈال دیا (یہ پردہ یا تو اس لیے تھا تاکہ اطمینانِ خاطر کے ساتھ مکمل طور پر اپنے رب کی عبادت کر سکیں اور اس کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہیں۔ یا پھر نہانے دھونے کے لیے تھا) جو کچھ بھی تھا، ایسی حالت میں خدا کی روح یعنی وہ عظیم فرشتہ ان کی طرف آیا اس وقت وہ بالکل صحیح سالم اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک، انسانی صورت میں ان کے سامنے آموجود ہوا۔ مریمؑ نے پہلے تو اس سے وحشت کی، لیکن پھر فوراً سمجھ لیا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور حضرت مسیحؑ کی ولادت کی خوشخبری دینے کے لیے آیا ہوا ہے، اور وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگیں۔

یہ داستان سورہ مریم کی آیات میں تفصیل سے مذکور ہے۔[۲]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا کا فرشتہ حضرت مریمؑ کی حسِ بینائی کے سامنے یوں مجسم ہوا (نہ کہ ظاہری حالت میں) لیکن یہ نظریہ آیت کے ظاہر کا مخالف ہے اور اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہود صرف اور صرف حضرت مریم علیہا السلام کے لیے واقع ہوا تھا، اگر کوئی اور وہاں پر موجود ہوتا تو شاید وہ اسے نہ دیکھ سکتا۔ بنابریں ممکن ہے کہ یہ آیت غیرِ انبیاء کے لیے امکانِ شہود کے مسئلہ پر ایک اور قرینہ ہو۔

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۶۲، تفسیر فخر رازی، جلد ۱۸، ص ۲۰۷

[۲] تفسیر نمونہ، جلد ۱۳ سورہ مریم کی تفسیر۔

نتیجہ

اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شناخت اور معرفت کے جو منابع اب تک شمار کیے گئے ہیں ان کے علاوہ ایک اور منبع بھی ہے جو کئی لحاظ سے ہمارے لیے نامعلوم اور مبہم ہے، لیکن قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ اس قسم کا منبع موجود ہے جو صرف انبیاء اور آئمہ ہی کو نہیں بعض اوقات کئی دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، کیونکہ بالفرض اگر ہم مندرجہ بالا بعض آیات کی دلالت کے بارے میں شک بھی کریں تا ہم مجموعی طور پر مدعا کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہر اس شخص کی باتوں کو مان لیں جو بھی اس کا دعویٰ کرے۔ اس سے تو ناجائز مفاد اٹھانے کی راہیں کھل جائیں گی۔ اسی لیے اس موضوع کے لیے کئی علامات ہیں جو انشاء اللہ بعد میں بیان ہوں گی۔

چند توضیحات

ا۔ روایت میں کشف وشہود کے چند دلچسپ نمونے

معرفت کے اس منبع پر دلالت کرنے والی روایات کم نہیں ہیں۔ اور ''علم حدیث'' کی اصطلاح میں حدِ ''استفاضہ'' تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مندرجہ ذیل روایات اس قسم کے چند نمونے ہیں۔

ا۔ جنگ ''احزاب'' (خندق) کی تاریخ میں ہے کہ ایک دن مدینہ کے اطراف میں خندق کی کھدائی کے دوران (جو کہ مشرکین کے لشکر کے حملوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھا) سخت اور بڑے پتھر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا۔ یہ ایک ایسا پتھر تھا جس کو نہ تو مجاہدینِ اسلام ہلا سکتے تھے اور نہ ہی توڑ سکتے تھے، کیونکہ اس پر کوئی بھی ہتھوڑا کارگر نہیں ہوتا تھا مسلمانوں نے رسالت مآبؐ کی خدمت میں یہ خبر پہنچائی تو آنحضرتؐ بذاتِ خود خندق میں تشریف لے گئے اور ہتھوڑا پتھر کے سر پر مارا جس سے کچھ حصے ٹوٹ کر الگ جا گرا، اور ایک بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح کی تکبیر بلند کی۔ یہ سن کر مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے پھر زور سے ہتھوڑا مارا، اسی طرح کچھ پتھر اور ٹوٹ کر اس سے الگ ہو گئے اور بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی آنحضرتؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

آپؐ نے پھر تیسری بار وار کیا تو تمام پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسی طرح آپؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

حضرت سلمان کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان تکبیروں کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

بجلی کی پہلی چمک میں میں نے سرزمین ''حیرہ'' اور ''ایرانی بادشاہوں کے محلات دیکھا'' اور جبرائیل نے مجھے خوشخبری دی ہے کہ میری امت انہیں فتح کرے گی، دوسری چمک میں ''روم اور شام کے سرخ محلات'' کو دیکھا

اور جبرائیل نے مجھے خبر دی کہ میری امت انہیں بھی فتح کرے گی، اور تیسری چمک میں مجھے صنعا، اور یمن کے محلات نظر آئے اور جبرائیل نے انہیں بھی فتح کرنے کی خوشخبری سنائی ہے۔ مسلمانو! تمہیں بھی خوشخبری ہو!![1]

البتہ اس دور کے منافقین ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس چیز کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور کہنے لگے: ''یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مدینے میں بیٹھ کر ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے محلات کی خوشخبری دے رہے ہیں، حالانکہ اس وقت خود مُٹھی بھر عربوں کے گھیرے میں ہیں۔ کیا بے بنیاد اور بے تکی باتیں ہیں؟

لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دکھایا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاص شہود میں اپنی آنکھو سے جو کچھ دیکھا تھا وہ بالکل حقیقت تھی۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس موقع پر ''مشاہدہ'' اور ''رؤیت'' کو اس کے مجازی معنوں پر محمول کریں لیکن ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ہم اسے مجازی پر حمل کریں جبکہ حقیقی معنی پر حمل کرنا ممکن ہے۔

۲۔ جنگ موتہ'' (جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں مشرقی روم اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہوئی) اس جنگ کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(جب مسلمان جعفر بن ابی طالب کی کمان میں رومی فوجوں سے لڑنے کے لیے ''مُوتہ' جا چکے تھے تو) ایک دن پیغمبر اکرمؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اچانک زمین کی تمام بلندیاں اور پستیاں آپؐ کے سامنے ہموار ہو گئیں اور آپؐ نے (میدانِ موتہ) میں جعفر کو دیکھا کہ وہ کفار کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جعفر شہید ہو گئے۔[2]

بعض روایات میں اس بارے میں قدرے زیادہ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اولوگوں کے سامنے جنگِ موتہ کے تفصیل حالات بیان کرنے لگے اور حضرات جعفر صادق بن ابی طالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کے تفصیلی حالات بیان فرمائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپؐ میدانِ جنگ کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مشہور تاریخوں کے مطابق آپؐ نے اسی دوران یہ بھی فرمایا:

''یہ تینوں شہد سونے کے تخت پر بہشت کی جانب لے جائے جا چکے ہیں اور مَیں نے اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا، جعفر اور زید نے پورے عزمِ راسخ کے ساتھ قدم بڑھائے لیکن عبداللہ نے اپنے اندر تھوڑے سے

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۱۷۹ اور سیرت ابن ہشام میں بھی یہی ماجرا تھوڑے سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

[2] بحارالانوار، جلد ۲۱، ص ۵۸، حدیث ۹

شک سے کام لیا پھر آگے بڑھا۔[1]

(''میں نے دیکھا'' کی تعبیر روایت کے اس حصے میں بڑی معنی خیز ہے جو شہود کا ایک نمونہ ہے)۔

۳۔"وان من اھل الکتاب لمن یومن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم" کی تفسیر میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ''حبشہ'' کا بادشاہ ''نجاشی'' ہے۔ چنانچہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی موت کی خبر آنحضرتؐ کو جبرائیل امینؑ نے پہنچائی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''باہر آجاؤ اور اپنے اس بھائی پر نماز پڑھو جو دوسری سرزمین میں فوت ہوا ہے'' صحابہ کرام نے عرض کی ''حضور وہ کون ہے؟'' تو آپؐ نے فرمایا ''نجاشی'' ہے!

پھر سب لوگ قبرستان بقیع میں آئے اور مدینہ سے سرزمین حبشہ آنحضرتؐ کی مبارک آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئی، آپؐ نے نجاشی کے تابوت کو دیکھا اور اس پر نماز (جنازہ) پڑھی۔[2]

۴۔حضور پاکؐ کی والدہ گرامی جناب آمنہ علیہا السلام کی تاریخ زندگی میں لکھا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے شکم مبارک میں تھے تو ایک فرشتے نے جناب آمنہؑ سے کہا ''آپ کے شکم بارک میں اس امت کا سردار اور آقا ہے۔ جب وہ پیدا ہو تو آپ کہیں کہ میں اسے ہر حاسد کے شر سے خدا کی پناہ میں دیتی ہوں۔ پھر آپ اس کا نام ''محمد'' رکھیں''

چنانچہ اس معظم خاتون نے حمل کے دوران ہی مشاہدہ فرمایا کہ آپ کے جسم مبارک سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے انہوں نے سرزمین شام میں ''بصریٰ'' کے محلات کا مشاہدہ کیا۔[3]

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء اور آئمہ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی کشف وشہود طاری ہو سکتا ہے۔

۵۔حضرت علی علیہ السلام سے ایک مشہور روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:

''میں ایک دن فدک کے ایک باغ میں کام کر رہا تھا جبکہ فدک حضرت زہراؑ کو منتقل ہو چکا تھا، تو اچانک دیکھا کہ ایک اجنبی عورت بڑے اطمینان کیساتھ میرے پاس آپہنچی، اس وقت میرے ہاتھ میں بیلچہ تھا جس سے میں کام میں مشغول تھا۔ اس نے آتے ہی کہا:

''دائے ابوطالب کے بیٹے! کیا آپؑ میرے ساتھ عقد کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اس طرح سے میں آپؑ کو بیلچے چلانے سے بے نیاز کر دوں گی اور زمین کے ایسے خزانے آپؑ کو بتاؤں گی کہ آپؑ اور آپؑ کی اولاد ساری زندگی دولت سے مالا مال رہیں گے''

میں نے کہا: تُو کون ہے؟ تاکہ تیرے خاندان والوں سے تیری خواستگاری کروں گا''

اُس نے کہا: میں دنیا ہوں''

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۲۳۷

[2] بحار الانوار، جلد ۸، ص ۴۱۱

[3] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۶۶

میں نے کہا: تُو واپس چلی جا، اور میرے علاوہ کسی اور کو جا کر اپنا شوہر بنا، پھر میں نے یہ اشعار پڑھے"

(ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امامؑ لوگوں کو دنیا کے فریب سے باخبر کرتے ہوئے اس سے جینے کی تاکید کرتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی کی ناپائیدری کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار فرماتے ہیں اور اسے فرماتے ہیں کہ جا کسی اور کو جا کر فریب دے، کیونکہ میں تجھے اچھی طرح پہچانتا ہوں)۔ [۱]

ممکن ہے کچھ لوگ اس روایت کو بھی "تشبیہ"، "تمثیلی یا مجاز" پر محمول کریں، لیکن اگر ہم روایت کے ظاہر کا بھی تحفظ کریں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ عالمِ مکاشفہ میں دنیا کی حقیقت ایک فریب کار خوب صورت عورت کی صورت میں امامؑ کے سامنے آئی اور آپؑ نے اسے نفی میں جواب دے کر واپس بھیج دیا۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ہے کہ دنیا ان کے سامنے بھی ایک فریب کار عورت کی صورت میں مجسم ہو کر آئی تھی۔ [۲]

۶۔ حضرت امام سجاد علی بنؑ الحسین زین العابدین کے حالات میں ہے کہ (جب عبداللہ بن زبیر کے فتنہ نے تمام حجاز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سب لوگ اس فکر میں تھے کہ آخر اس کا کیا انجام ہوگا؟) امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میں گھر سے باہر آیا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے پاس پہنچ کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ (اور سوچ رہا تھا) کہ اچانک ایک مرد کو دیکھا جس نے سفید کپڑے زیبِ تن کیے ہوئے تھے، وہ میرے پاس آکر کہنے لگا:

"اے علی بن الحسینؑ آپ کیوں غمگین اور مغموم نظر آرہے ہیں۔ آیا آپؑ کو دنیا کا غم ہے؟

خدا کا رزق تو ہر نیک اور بد سب کے لیے آمادہ ہے

میں نے کہا: نہیں، مجھے دنیا کا غم نہیں ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔

اس نے کہا: پھر آخرت کا غم ہے؟ وہ تو خدا کا وعدہ برحق ہے، سلطانِ قاہر (یا قادر) اس دن فیصلہ کرے گا۔

میں نے کہا: نہیں آخرت کا غم بھی نہیں ہے! اور حقیقت وہی ہے جو آپ کہتے ہیں"۔

اس نے کہا: "تو پھر غم کس بات کا ہے؟"۔

میں نے کہا: عبداللہ بن زبیر کے فتنہ سے گھبرا رہا ہوں کہ لوگوں کی کیا حالت ہو رہی ہے"۔

وہ مسکرا کر کہنے لگا: اے علی بن الحسینؑ! آیا آپؑ نے اب تک کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا کو پکارا ہو اور خدا نے اسے جواب نہ دیا ہو؟

---

[۱] مکاسب شیخ انصاری، منقول از "امام جعفر صادق علیہ السلام کا خط والی اہواز "نجاشی" کے نام" (بحث ولایت جائر)

[۲] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۱۲۶، باب "حب الدنیا وذمھا" حدیث ۱۲۰۔

میں نے کہا: نہیں!''

اس نے کہا: ''اچھا تو کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا پر توکل کیا ہو اور خدا نے اس کی مشکل دور نہ کی ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں!''

اس نے کہا: ''تو پھر کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا سے درخواست کی ہو اور خدا نے اسے عطا نہ کیا ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں!''

اس نے کہا اور میری آنکھوں سے غائب ہو گیا''۔[1]

۷۔ انہی حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

''گویا میں دیکھ رہا ہوں قبر حسین علیہ السلام کے ارد گرد محل اور خوبصورت عمارتیں بن چکی ہیں اور گویا مَیں دیکھ رہا ہوں کہ قبر کے چاروں طرف بازار لگے ہوئے ہیں۔ کوئی دن اور رات ایسی نہیں ہے جس میں روئے زمین کے لوگ وہاں نہ آ رہے ہوں، اور یہ اس وقت ہوگا جب بنی مروان کی حکومت منقرض ہو جائے گی۔[2]

۸۔ امالی شیخ صدوق میں ''حُر بن یزید ریاحی'' کے حالات میں مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

''لماخرجت من الكوفة نوديت ياحربالجنة، فقلت ويل للحريبشر بالجنة وهو يسيرالى حرب ابن بنت رسول الله (ص)''

''جب میں کوفہ سے باہر نکلا تو مجھے ایک آواز سنائی دی کہ اے حُر! تجھے جنت کی خوشخبری ہو، لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا پھٹکار ہے حُر پر! اسے بہشت کی کیونکر خوشخبری دی جا رہی ہے جبکہ وہ رسولؐ کے نواسے کے ساتھ جنگ کرنے جا رہا ہے۔[3]

۹۔ ایک اور روایت میں رسول پاکؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ ہے جس میں امام علیہ السلام نے انہیں سر زمین کربلا کی زیارت کرائی اور اپنی شہادت کا مقام انہیں دکھایا۔[4]

۱۔ مکاشفہ کے بارے میں بزرگ علماء، باتقویٰ افراد اور سچے مؤمنین کے حالات میں بھی بہت سے مکاشفات نقل کیے گئے ہیں جن کو بیان کرنے سے کتاب طولانی ہو جائے گی۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان مکاشفات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ خبرِ واحد سے باہر اور علم

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب تفویض الی اللہ، حدیث ۲۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۹۸، ص ۱۱۴، ''کتاب المزار''، حدیث ۳۶۔

[3] امالی صدوق، ص ۹۳، مجلس ۳۰۔

[4] مدینۃ المعاجز، ص ۲۴۴

حدیث کی اصلاح میں خبر مستفیض کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور اس بارے میں ہماری بہترین موید ثابت ہوسکتی ہے۔

۲۔ پردے کیونکر اٹھتے ہیں؟

مندرجہ بالا احادیث وروایات جو کہ کشف وشہود کا عملی نمونہ ہیں کے علاوہ کچھ ایسی تعبیرات بھی روایات میں بیان ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے انسان کا ایمان اور یقین جتنا پڑھتا جائے گا اور گناہوں اور بُری صفات کی وجہ سے جو پردے دل پر پڑے ہوئے ہیں، وہ اس سے ہٹتے جائیں گے، اس کے لیے کائنات کے بہت سے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے۔ آخر کار وہ یقین کی اس منزل تک جا پہنچے گا کہ ابراہیمؑ کی مانند زمین وآسمان کی ملکوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

انسان کا قلب وروح اس آئینہ کی مانند ہے جس پر گاہے گناہ ومعصیت کا زنگ اور برے اخلاق کی گرد پڑ جاتی ہے اور وہ کسی حقیقت کو منعکس نہیں کر پاتا، لیکن جب وہ توبہ کے پانی سے اس گردوغبار کو دھوڈالتا ہے اور تہذیبِ نفس کے ذریعہ اس زنگ کو دور کرکے اسے صیقل کر دیتا ہے تو حقیقت اس میں پرتو افگن ہوجاتی ہے اور صاحبِ قلب محرم اسرارِ الٰہی بن جاتا ہے اور جن پیغامات کو نامحرم لوگوں کے کان سننے سے محروم ہوتے ہیں، وہ انہیں سن لیتا ہے۔

درج ذیل احادیث اس بات کی گواہ ہیں۔

۱۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"لولا ان الشیاطین یحرمون الی قلوب بنی آدم لنظر والی الملکوت"

''اگر شیاطین نے بنی آدم کے دلوں کو نہ گھیرا ہوا ہوتا تو وہ ملکوتی کائنات کو دیکھ لیتے۔''[1]

۲۔ ایک اور روایت میں آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے:

"لیس العلم بکثرة التعلم و انما العلم نور یقذفه الله فی قلب من یحب، فیفتح له، ویشاهد الغیب، وینشرح صدره، فیتحمل البلاء، قیل یا رسول الله وهل لذالك من علامة؟ قیل التجا فی عن دار الغرور، والا نابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزوله"

''(حقیقی) علم زیادہ پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسا نور ہوتا ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈال دیتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔ اس کے دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو

---

[1] بحارالانوار، جلد ۷ ص ۵۹، باب باب القلب وصلاحه، حدیث ۳۹

دیکھنے لگتا ہے، سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور وہ بلا اور آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے پختہ ہوجاتا ہے! کسی نے پوچھا یا رسول اللہؐ! اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا اس کی علامت دنیا سے بے اعتنائی اور آخرت کی طرف توجہ اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے (اعمالِ صالح کے ساتھ) مکمل تیاری ہے۔" [1]

۳۔ نہج البلاغہ میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو زمین میں لوگوں پر خدا کی حجت ہیں، علیؑ فرماتے ہیں:

"ججم بهم العلم على حقيقة البصير و باشروا روح اليقين، واستلانوا ما استعوره المترفون، وانسوا بما استوحش منه الجاهلون، وصحبوا الدنيا بابدان، ارواحها معلقة بالمحل الاعلى، اولئك خلفاء الله في ارضه، و الدعاة الى دينه"

"علم اور دانش ان کی حقیقت بینائی کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور خود وہ روح یقین کے ساتھ مل چکے ہیں، جس چیز کو ہوس باز دنیا پرست مشکل سمجھتے ہیں وہ ان کے لیے آسان ہے اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت کھاتے ہیں وہ اس کے ساتھ مانوس ہیں اور دنیا میں ایسے ابدان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں کہ جن کی روحیں عالم بالا کے ساتھ پیوند ہیں۔ وہ زمین میں خدا کے ہیں اور دین خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔" [2]

۴۔ "ذعلب یمانی" حضرت امیر علیہ السلام کے سخنور اور زیرک دوستوں میں سے تھے۔ نہج البلاغہ میں ان کی ایک مشہور داستان ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک دن حضرت امیرؑ سے یہ عجیب سوال کیا:

ذعلب: "هل رأيت ربك يا امير المومنين؟" یا علی! آپؑ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟

امامؑ: "افاعبد مالا ارى" تو کیا جس کو میں نہ دیکھوں اس کی عبادت کروں؟

ذعلب: "و كيف تراه؟" تو پھر آپؑ اسے کیونکر دیکھتے ہیں؟

امامؑ: "لاتدركه العيون بمشاهدة العيان، ولكن تدركه القلوب بحقائق الايمان" ظاہری آنکھیں حسی مشاہدہ کے ساتھ اسے نہیں دیکھ سکتیں، لیکن قلوب (دل) اسے حقائق ایمان کے ساتھ درک کر لیتے ہیں۔ (اور دیکھ لیتے ہیں)۔

پھر فرمایا:

"قريب من الاشياء غير ملابس، بعيد منها غير مباين"

---

[1] تفسیر الصراط المستقیم جلد ا ص ۲۶۷

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

''وہ ہر شے کے نزدیک لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہو اور ہر چیز سے دور ہے لیکن ایسے نہیں کہ اس سے بیگانہ ہو۔''[۱]

ظاہر ہے امام علیہ السلام کی مراد عقلی دلائل کے ساتھ وجود خدا کی پہچان نہیں ہے کیونکہ یہ مقام تو ہر خدا پرست کو حاصل ہے حتی کہ وہ بڑھیا بھی اس راہ کو طے کرچکی ہے جس نے اپنے چرخے کے معروف استدلال سے عظیم چرخ گردوں کے چلانے والے کا پتہ بتایا۔

پس اس سے مراد وہ درک اور نظر ہے جو اس درک ونظر سے بالاتر ہے اور اندرونی شہود ہے جو اس قدر روشن ہے کہ گویا اسے یہ آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔(غور کیجیے گا)

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام ہی کی ایک معروف حدیث ہے کہ:

"لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا"

''اگر پردے ہٹا بھی دیئے تاہم میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔''[۲]

یعنی میں اس وقت تک تمام حقائق کو غیب کے پس پردہ سے اندرونی شہود کے ساتھ دیکھ رہا ہوں اور میری چشم بصیرت پردوں کو شگافتہ کرکے غیب کے پردوں سے پار نکل جاتی ہے۔

٦۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الا ان للعبد اربع اعین: عینان یبصر بھما امر دینه و دنیاه، وعینان یبصر بھما امر آخرته، فاذا اراد الله بعبد خیرا فتح له العینین اللتین فی قلبه، فابصر بھما الغیب وامر آخرته"

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر بندے کی چار آنکھیں ہیں۔ دو آنکھیں تو وہ جن کے ذریعہ وہ دین اور دنیا کے کاموں کو دیکھتا ہے اور دو آنکھیں وہ ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی آخرت کے کاموں کو دیکھتا ہے۔ جب خداوند عالم کسی بندے سے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے دل کی اندرونی آنکھوں کو کھول دیتا ہے تا کہ وہ غیب اور

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۹

[۲] اس حدیث کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ابن سینا نے ''معراج نامہ'' میں ''علی بن فضل اللہ جیلانیؒ سے یہ چیز نقل کی ہے کہ ''یقینا چونکہ بصیرت کی آنکھوں کے ساتھ ہی عقل اسرار کا ادراک کرتی ہے جو تمام حقائق کے درک کرنے اور دیکھنے کا حکم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولا علیؑ نے فرمایا "لو کشف الغطا لما ازددت یقینا"۔ (منقول از ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ جلد ۷ ص ۱۴۹)

آخرت کے امر کو دیکھے۔"[1]

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت ہے جو حقیقی شیعوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔[2]

۷۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا آپؐ کے ایک صحابی "حارثہ" سے ہوا۔ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا:

"حارثہ! تمہارا کیا حال ہے؟"

حارثہ: "انا یا رسول الله مومن حقا" اے رسولؐ خدا! میں صحیح معنوں میں مومن ہوں

فرمایا: "لك شیء حقیقة وما حقیقة قولك؟" ہر چیز کی حقیقت اور علامت ہوتی ہے، تمہاری اس بات کی کیا علامت ہے؟

حارثہ: "وہ علامت یہ ہے کہ میں دنیا سے بالکل بے اعتنا ہوں، رات کو بیدار رہتا (اور عبادت کرتا) ہوں، سخت گرمی میں پیاسا رہتا (اور روزہ رکھتا) ہوں، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے پروردگار کا عرش حساب کے لیے آمادہ ہے اور گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ اہل بہشت، بہشت میں ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے ہیں اور گویا میں جہنمیوں کی جہنم میں چیخ و پکار سن رہا ہوں"

فرمایا: "عبد نور الله قلبه، ابصرت فاثبت" یہ ایسا بندہ ہے خدا نے جس کے دل کو نورانی بنا دیا ہے۔ تو نے حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ اسی پر ثابت قدم رہ۔

حارثہ: "یا رسول الله! ادع الله لی ان یرزقنی الشهادة معك" اللہ کے رسولؐ! آپ خدا سے دعا کریں کہ میں آپؐ کی مدد کرتا ہوا شہید ہو جاؤں۔"

فرمایا: "اللهم ارزق حارثه الشهادة" خداوند! حارثہ کو شہادت نصیب فرما۔

ابھی چند دن ہی گزرے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے کچھ لوگوں کو جنگ کے لیے بھیجا جس میں یہی "حارثہ" بھی تھے۔ انہوں نے جنگ کی اور ۸ یا ۹ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش فرمایا۔[3]

۸۔ کتب اہلسنت میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث درج ہے کہ:

"لولا تکثیر فی کلامکم و تمریج فی قلوبکم لرأیتم ما اری و لسمعتوم ما اسمع"

"اگر تم زیادہ باتیں نہ کرتے ہوتے اور فساد کے لیے تمہارے دلوں میں آزادی نہ ہوتی تو تم بھی وہی کچھ دیکھتے

---

[1] خصال صدوق ص ۲۶۵ حدیث ۹۰

[2] بحار الانوار جلد ۶۷ ص ۵۸ حدیث ۳۵

[3] اصول کافی جلد ۲، باب حقیقة الایمان والیقین، حدیث ۳

جو میں دیکھتا ہوں، اور وہی کچھ سنتے جو میں سنتا ہوں۔[1]

یہ اور اس قسم کی دوسری احادیث روحانی مکاشفات کے ایمان اور یقین کے ساتھ رابطے کو واضح کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسان کے معنوی ارتقاء کے ساتھ ممکن ہے کہ اسے اس طرح ادراک اور نظر حاصل ہو جائیں، ایسے ادراک اور نظر جن کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں کہ یہ ہیں اور بس!

۳۔ قرآن میں سات سچے خواب

شہود اور مکاشفہ کی ایک قسم ''رویائے صادقہ'' ہیں، یعنی ایسے خواب جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کو مکاشفہ کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ روحانی فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ خواب اور رویا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں جبکہ اس کے برخلاف مادی فلاسفہ خواب اور رویا کو روزمرہ کے کاموں کا براہ راست نتیجہ یا حاصل نہ ہونے والی آرزوؤں کا نتیجہ یا مختلف امور کی بدولت حاصل ہونے والے خوف اور وحشت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال روحانی فلاسفہ کے خوابوں کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔ ایسے خواب کہ جن کا تعلق ماضی کی آرزوؤں اور تمناؤں سے ہوتا ہے۔

۲۔ ایسے خواب جو پریشان اور غیر مفہوم ہوتے ہیں، عرب جنہیں ''اضغاث احلام'' کہتے ہیں اور یہ نتیجہ ہوتے ہیں قوت خیال اور قوت وہم کا۔

۳۔ ایسے خواب جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور وہ مستقبل کے کئی رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ایسا شہود ہوتا ہے جو حالت خواب میں انجام پاتا ہے۔

مادی فلاسفہ کے پاس تیسری قسم کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایسے بہت سے شواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم واقعیت اور حقیقت کی حامل ہے۔ ہم نے اس کے کئی زندہ نمونے جو قطعاً ناقابل انکار ہیں، تفسیر نمونہ میں ذکر کیے ہیں۔[2]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی کم از کم سات مقامات پر ان رویائے صادقہ (سچے خوابوں) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تفسیر موضوعی کی بحث میں جن کا ذکر بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ قرآن مجید سورہ ''فتح'' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سچا خواب بیان کرتا ہے کہ ''آنحضرت نے خواب میں دیکھا کہ اپنے

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۵ ص ۲۹۲

[2] تفسیر نمونہ جلد ۹

ساتھیوں کے ہمراہ خانہ خدا کی زیارت اور عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے۔" آپؐ نے اپنا یہ خواب اپنے ساتھیوں سے بیان کیا۔ سب لوگ خوش ہوگئے۔ لیکن انہوں نے پہلے تو گمان کیا کہ اس کی تعبیر ہجرت کے چھٹے سال ظاہر ہوگی جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی تھی۔ لیکن یہ تعبیر اس سال ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یقین دلایا کہ یہ خواب سچا تھا اور ضرور پورا ہوکر رہے گا۔

قرآن مجید نے اس بارے میں ان لوگوں کو مندرجہ ذیل جواب دیا ہے جن کے دلوں میں شکوک پیدا ہوگئے تھے۔

لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَـقِّ‌ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَۙ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَۙ لَا تَخَافُوۡنَ‌ؕ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ﴿۲۷﴾ (فتح ۲۷)

"جو خواب خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دیکھایا وہ سچ ہے۔ یقیناً تم سب انشاء اللہ مسجد الحرام میں امن کے ساتھ داخل ہوگے (عمرہ کے مناسک کے مطابق) اپنے سروں کو مونڈے ہوئے اور اپنے ناخنوں کو کوتاہ کیے ہوئے، اور تم کسی سے کسی قسم کا خوف کھائے بغیر یہ کام انجام دوگے۔ خداوند عالم وہ کچھ جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے (اور اس تاخیر میں بھی کوئی حکمت ہے) اور اس سے پہلے قریبی فتح قرار دی۔ (خیبر کے مضبوط قلعوں کی فتح یا صلح حدیبیہ جو بذات خود ایک عظیم فتح ہے)۔"

یہ خواب ہجرت کے ساتویں سال ذوالقعدہ کے مہینے میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پورا ہوگیا۔ جو تاریخ میں "عمرة القضاء" کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ مسلمان تو چاہتے تھے کہ یہ عمرہ اس کے ایک سال قبل بجالائیں لیکن قریش کی ممانعت کی وجہ سے اس سال ایسا نہ ہوسکا۔ باوجود یکہ تمام مسلمان غیر مسلح ہوکر ہی مکہ میں داخل ہوئے تھے، جو اس وقت دشمن کی طاقت کا مرکز تھا۔ لیکن ان کی عظمت اور دبدبہ اس قدر محیط تھا کہ "آمنین" (مطمئن ہوکر) اور "لا تخافون" (کسی سے خوف کھائے بغیر) کی تعبیر ان پر مکمل طور پر صادق آرہی تھی۔ انہوں نے دشمن سے خوف کھائے بغیر خانہ خدا کی زیارت کے مراسم انجام دیئے، جو تاریخ اسلام کے عجائبات میں سے ایک ہے۔

اس طرح سے وہ خواب اپنی تمام خصوصیات سمیت پورا ہوگیا جس کی ایسے حالات میں پیش گوئی کسی طرح بھی ناممکن تھی۔

۲۔ سورہ بنی اسرائیل میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور خواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اشارہ بھی مختصر اور نہایت سربستہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِىۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الۡمَلۡعُوۡنَةَ فِى الۡقُرۡاٰنِ‌ ؕ وَنُخَوِّفُهُمۡۙ فَمَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا طُغۡيَانًا كَبِيۡرًا ﴿۶۰﴾ (بنی اسرائیل ۶۰)

"جو خواب ہم نے آپ کو دیکھایا وہ تو لوگوں کے لیے صرف ایک آزمائش تھا۔ اسی طرح جس شجرہ ملعونہ (لعنت

شدہ درخت) کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے ہم انہیں ڈراتے (اورتنبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔“

ایک مشہور ومعروف حدیث جسے بہت سے شیعہ اورسنی مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مشہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ بندر آپؐ کے منبر پر اچھل کود رہے ہیں اس پر آپؐ بہت غمگین ہوئے کیونکہ یہ خواب آپؐ کے بعد مسلمانوں کی قیادت کے بارے میں ناخوشگوار حوادث کی طرف اشارہ تھا۔ (اس خواب کی حکومت بنی امیہ سے تفسیر کی گئی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے رسول اللہؐ کے منبر پر بیٹھے، انہوں نے رسوم جاہلیت میں ایک دوسرے کی تقلید کی، وہ بے حیثیت افراد تھے، وہ اسلامی حکومت اورخلافت رسول اللہ کو تباہی کی طرف لے گئے)۔ [۱]

بعض مفسرین نے اس رویا سے مراد مسجد الحرام میں داخل ہونے کے رویا کو لیا ہے جبکہ سورہ بنی اسرائیل مکہ میں نازل ہوئی اور یہ رویا مسلم طور پر مدینہ میں دیکھا گیا اور وہ بھی ۶ھ میں حدیبیہ کے ماجرا سے بھی پہلے۔

”فخر رازی“ کی طرح کے دوسرے علماء نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رویا کے معنی رویت یعنی بیداری کی حالت میں دیکھنا ہے اور وہ واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے۔ [۲]

یہ احتمال بہت کمزور ہے کیونکہ ”رویا“ کا اصل لغوی معنی نیند کی حالت میں دیکھنا ہے، نہ کہ بیداری کی حالت میں بنا بریں صحیح وہی پہلی تفسیر ہے۔

”شجرہ ملعونہ“ (لعنت شدہ درخت) سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو اس کی ”شجرۂ زقوم“ سے تفسیر کی ہے جو سورہ صافات کے مطابق جہنم کی بنیادوں میں اگتا ہے اور نہایت ہی بدمزہ اور ناخوشگوار پھل ہے اور سورہ دخان کی ۴۶ ویں اور ۴۷ ویں آیت کے مطابق جہنمیوں اور گناہ گاروں کی غذا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہودی کی سرکش قوم سے کی ہے۔ وہ ایسے درخت کی مانند تھی کہ جس کی شاخ وبرگ بہت ہوں، لیکن درگاہ رب العزت سے دھتکاری ہوئی قوم۔

لیکن بہت سی شیعہ اورسنی مشہور کتابوں میں ”شجر ملعونہ“ سے ”بنی امیہ“ تفسیر کیے گئے ہیں۔ امام فخر رازی نے مشہور اسلامی مفسر ابن

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۰، ص ۲۳۶

[۲] یہ روایت تفسیر قرطبی، مجمع البیان، صافی اور تفسیر فخر رازی میں بیان ہوئی ہے اور مرحوم فیض کاشانی فرماتے ہیں کہ یہ ایسی روایت ہے جو خاصہ اور عامہ (شیعہ اورسنی) کے درمیان مشہور ہے۔

عباس سے یہی تفسیر نقل کی ہے [1] اور یہ تفسیر اس موضوع سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے خواب کے بارے میں بیان ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ قرآن مجید میں اس شجرہ ملعونہ کا کہیں ذکر نہیں ہوا ہے، لیکن اگر اس بات پر توجہ دی جائے کہ قرآن مجید نے منافقین کو سخت لعنت کی ہے (ملاحظہ ہو سورہ محمد آیت ۲۳) اور بنی امیہ ایسے منافقین کے سرغنے تھے، تو یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ "نخوفھم فما یزیدھم الا طغیانا کبیرا" (ہم انہیں ڈراتے اور تنبیہ کرتے ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا) کی تعبیر بھی پوری طرح انہی پر صادق آتی ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کچھ صحابیوں نے آپؑ سے (یا آپؑ کے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے) اسی آیت کے بارے میں سوال کیا تو انہیں نے فرمایا "شجرہ ملعونہ سے مراد بنی امیہ ہیں۔" [2]

یہی چیز امیر المومنین علیؑ اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوئی ہے اور علی بن ابراہیم نے اسے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [3]

"سیوطی" نے بھی تفسیر "درمنثور" میں "شجرۂ ملعونہ" اور "پیغمبر اکرمؐ کے خواب" کے بارے میں متعدد روایات بیان کی ہیں، جن میں سے بعض میں "بنی امیہ" بعض میں "بنی الحکم" اور بعض میں "بنی العاص" کا ذکر ہے (جو سب کے سب ایک ہی شجرہ خبیثہ سے ہیں)۔ [4]

بہر حال یہ خواب بعد از وفات پیغمبر شرمندہ تعبیر ہوا اور آخر کار اس شجرہ ملعونہ کے افراد یکے بعد دیگرے پیغمبرؐ کی جگہ پر بیٹھتے رہے اور عظیم بلاؤں اور فتنوں کو وجود میں لاتے رہے اور مسلمانوں کے لیے بہت بڑی آزمائش کا سبب بنے۔

۳۔ ایک اور رویا صادقہ (سچا خواب) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہے جو ان کے فرزند (حضرت اسماعیلؑ) کے ذبح کے بارے میں ہے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کہ مخلوق خدا کی رہبری اور امامت کے منصب تک پہنچنے کے لیے آزمائش کی عظیم وادی میں قدم رکھ چکے تھے، انہیں اپنے عزیز بیٹے "اسماعیل" کے ذبح کا حکم ہوا اور عجیب بات یہ ہے کہ انہیں یہ حکم خواب کے عالم میں دیا گیا۔ ایسا خواب جوان کے لیے وحی کی حیثیت رکھتا تھا اور وحی کی مانند حقیقت کا حامل تھا۔ چنانچہ سورہ صافات کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

"فلما بلغ معه السعی قال یبنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا

---

[1] قرطبی نے اس روایت کو ابن عباس سے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (جلد ۶ ص ۳۹۰۶ اور فخر رازی نے بھی اسے ابن عباس ہی سے نقل کیا ہے) (جلد ۲۰ ص ۲۳۷)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۸۰، حدیث ۲۷۸

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳، ص ۱۸۰، ۱۸۱، حدیث ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۶

[4] تفسیر المیزان، جلد ۱۳ ص ۱۵۷

تری قال یا ابت افعل ماتومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین"

''جب (حضرت ابراہیمؑ) ان (حضرت اسماعیلؑ) کے ساتھ مقام سعی پر پہنچے تو کہا میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کروں، دیکھو تو تمہاری کیا رائے ہے؟ تو (اسماعیلؑ) نے) کہا بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔''

لفظ "اری" (میں دیکھ رہا ہوں) فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ خواب کئی مرتبہ دیکھا: اس حد تک کہ انہوں نے مکمل اطمینان پیدا کرلیا کہ حکم خدا ہے۔ اسی لیے ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے انہیں کہا: بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا ہوا ہے اور صبر کروں گا۔

نیز اسی دلیل کی بنا پر، اسی سورہ کی آیت ۱۰۴ اور ۱۰۵ میں آیا ہے ''ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! جو حکم تمہیں خواب میں دیا گیا تھا وہ تم نے سچ کر دکھایا'' (ونادیناہ ان یا ابراھیم قدصدقت الرویا)۔

یہ ماجرا ان لوگوں کے لیے روشن دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین کے لیے خواب بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ:

"ان الرویا الصادقة جزء من سبعین جزءا من النبوة"

''یعنی سچا خواب نبوت کی نوے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔'' [1]

اگرچہ بعض اصولیوں نے اس حکم کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکم الٰہی عمل کیے جانے سے پہلے ہی منسوخ ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر بتایا جا چکا ہے یہ اس وقت ہے جب ''امتحان کا حکم'' نہ ہو کہ جس سے کسی شخص یا چیز کو آزمایا جاتا ہے اور "قد صدقت الرویا" (جو خواب تو نے دیکھا ہے اس کی تصدیق کر دی اور اسے سچا کر دکھایا) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کے ذبح کے تمام مقدمات تیار کر لیے تھے اور بے نظیر اور عظیم ایثار کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکے تھے اور جو ان کا فریضہ تھا وہ سارے کا سارا انجام دے دیا تھا۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد کے گھر میں خواب ہے جو دوسرے سچے خوابوں میں شمار ہوتا ہے، جس کے بارے میں سورہ یوسف کے آغاز میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝۴ (یوسف ۴)

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۸، ص ۱۶۷، ۱۷۷، ۱۷۸

''اس زمانے کو یاد کرو جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: باب جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو اپنے لیے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

باپ نے یہ خواب سن کر آئندہ کے حادثات کی پیش گوئی کر دی اور انہیں کہا'' خدا تمہیں ایک بلند مقام عطا فرمائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی پوری نعمتیں کرے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب بارہ سال کی عمر میں دیکھا اور اسے پورا ہوتے ہوتے چالیس سال کا عرصہ لگ گیا، اس وقت کہ جب وہ مصر کی حکومت پر فائز اور تختِ حکومت پر براجمان ہوئے اور انکے گیارہ بھائی اور ماں، باپ انہیں کنعان سے ملنے مصر تشریف لے گئے اور انہیں خضوع کے لیے، یا نعمت کے شکرانہ کے طور پر خدا کا سجدہ ادا کیا۔ چنانچہ اسی سورت کے اواخر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ‌ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِيۡلُ رُءۡيَاىَ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّىۡ حَقًّا‌ ؕ (یوسف ۱۰۰)

''اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب ان کے لیے سجدہ میں گر گئے اور کہا: بابا جان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔ خدا نے اسے سچ کر دکھایا۔''

اس ماجرا سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ جو حوادث چالیس سال بعد واقع ہوں، وہ ایک سچے خواب کی صورت میں ایک پاک اور ذی استعداد دل میں منعکس ہو جائیں۔ اگر چہ چالیس کا عدد قرآنی آیات کے متن میں مذکور نہیں ہے، لیکن آیات کے قرائن سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ خواب دیکھنے اور اس کی تعبیر ظاہر ہونے کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس خواب کے دیکھنے کے بعد اپنے معصوم چھوٹے بچے کو جو خوشخبری دی وہ یہ تھی:

وَيُعَلِّمُكَ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ (یوسف ٦)

''تجھے تعبیر خواب کی تعلیم دے گا۔''

اس جملہ کی خواہ علم تعبیر خواب کے معنی میں تفسیر کی جائے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے، خواہ تفسیر المیزان کی تصریحات کے مطابق اس کی تعبیر خواب کے علم سے بھی وسیع تر معنی میں تفسیر کی جائے، یعنی اس کے حوادث اور نتائج کے سرچشمہ کی معرفت،[1] صورت حال خواہ کچھ بھی ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ بعض خواب سچے ہوں اور ان کی تاویل عینی اور واقعی ہو۔

٥، ٦۔ جب حضرت یوسفؑ پاکدامنی کے جرم میں عزیز مصر کی قید میں تھے اس وقت ان کے ساتھ زندان میں رہنے والے دو قیدیوں نے دو

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۱، ص ۸٦

الگ الگ خواب دیکھے۔ قرآن نے ان خوابوں کو اسی سورہ یوسف میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶ (یوسف ۳۶)

"دو جوان اس کے ہمراہ قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ روٹیوں کو سر پر اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر سے آگاہ کرو کیونکہ ہم آپ کو نیکوکاروں میں سے دیکھتے ہیں۔"

یوسف علیہ السلام نے پہلے تو انہیں خدائے واحد کی توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔ پھر ان کے لیے خواب کی یوں تعبیر بیان کی۔

جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہے، اس سے کہا:

"تم قید خانے سے رہا ہو جاؤ گے۔"

لیکن دوسرے شخص سے، جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ روٹیاں سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور اس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، کہا:

"تمہیں سزائے موت ہو گی۔"

چنانچہ دونوں کی تعبیریں سچی ثابت ہوئیں۔ (فطری بات ہے کہ مصر جیسے فاسد ماحول میں جہاں خودخواہ اور جبار بادشاہوں کی حکومت ہو اور یوسفؑ جیسے معصوموں کو پاکدامنی کے جرم میں زندان میں ڈالا جاتا ہو، وہاں پر ظالم حکام کے ساتھ سودے بازی اور ان کے لیے شراب تیار کرنا آزادی کا موجب ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگوں میں مظلوم اور مستضعف لوگوں کی حمایت کا جذبہ اور پرندوں کو کھانا کھلانے کی فکر ہو انہیں سزائے موت ہی مل سکتی ہے)۔

بہر حال یہ دونوں خواب کہ تشریح قرآن مجید میں بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ کبھی خواب بھی معرفت کے منبع کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، ہاں البتہ نہ تو ہر خواب اور نہ ہی ہر تعبیر وتفسیر کرنے والے کے لیے۔

۷۔ سلطان مصر کا خواب

یوسف علیہ السلام کی اسی داستان میں، قرآن مجید میں ایک اور خواب کا بھی ذکر ہے جو سچے خوابوں کا ایک روشن اور واضح نمونہ ہے۔

بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ:

"سات دبلی پتلی گائیں، سات موٹی تازی گایوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئی ہیں اور گندم کی سات خشک بالیاں، سات سرسبز بالیوں

کے گرد لپٹ کر انہیں چٹ کر گئی ہیں۔"

وہ اس خواب سے وحشت زدہ ہو گیا اور اپنے اطراف والوں سے اس کی تعبیر کا مطالبہ کیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ ۖ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَأُ أَفْتُونِى فِى رُءْيَٰىَ إِن كُنتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ (یوسف ۴۳)

اور چونکہ اس کی اطراف والے خواب کی تعبیر کو نہیں جانتے تھے، لہٰذا انہوں نے کہا:

"یہ تو خواب پریشاں ہیں جن کی تعبیر نہیں ہوتی اور ہم تاویل خواب سے بھی بے خبر ہیں۔"

شاید اس طرح سے وہ سلطان مصر کو اس پریشانی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ (توجہ رہے کہ مصر کا بادشاہ یا فرعون مصر، اس پورے ملک کا حاکم تھا۔ بعض مفسرین کے مطابق "عزیز مصر" اس ملک کے وزیر خزانہ کو کہتے تھے۔ جو فرعون مصر جناب یوسف علیہ السلام کا ہمعصر تھا اس کا نام "ریان بن ولید" تھا اور عزیز مصر کا نام "قطفیر" یا "عطفیر" تھا)۔ [1]

لیکن یہاں پر بادشاہ کے ساقی (یاندیم) جو اپنے خواب کے ماجرا کے بعد قید خانے سے رہا ہو چکا تھا، کو ایک مرتبہ اپنے عالم، زیرک اور صدیق اور راستباز دوست یعنی یوسفؑ کی یاد آئی اور تمام ماجرا بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ نے یوسفؑ کو قید خانے سے باہر نکالا اور اپنے پاس بلا کر ان سے اپنا خواب بیان کیا تو انہوں نے خواب کی یوں تعبیر ارشاد فرمائی:

"تمہارے آنے والے سات سال نہایت ہی بابرکت ہوں گے۔ ہر چیز کی فراوانی ہوگی۔ خوب محنت سے کام لو، زراعت پر زیادہ توجہ دو، گندم کے جو کھیت کاٹو انہیں بالیوں سمیت اکٹھا کرتے جاؤ، اپنی ضروریات کی حد تک ہی اس سے مصرف کرو، بچت سے کام لیتے رہو، کیونکہ ان سات سالوں کے بعد دوسرے سات سال نہایت ہی خشک ہوں گے، بارشیں بہت کم ہوں گی، کھیتی باڑی میں نہایت کمی واقع ہو جائے گی، اس لیے تمہیں اس غلے سے سات سال تک استفادہ کرنا ہوگا ورنہ ہلاک و برباد ہو جاؤ گے اور پھر قحط کے ان سات سالوں میں تمہیں تمام غلے کو بھی خرچ نہیں کرنا ہوگا بلکہ کچھ غلہ اس سے اگلے سال کے لیے بھی بچائے رکھنا جو بارشوں اور برکتوں کا سال ہوگا۔" (یوسف ۴۷ تا ۴۹)

---

[1] فخر رازی کی تفسیر کبیر میں یہی معنی بعض مفسرین سے نقل کیے گئے ہیں۔ (جلد ۱۸، ص ۱۰۸) اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے کتاب "اعلام القرآن" ص ۶۷۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ابوالفتوح رازی نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ یوسف علیہ السلام انجام کار سلطنت مصر کے عہدہ تک جا پہنچے۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۶، ص ۴۰۱

یہ تعبیر بھی حرف بحرف پوری ہوئی اور چونکہ اس میں یوسفؑ کی صداقت، راست بازی، معرفت اور ذکاوت نمایاں تھی لہٰذا اس کی آزادی وزارت خزانہ تک پہنچنے کا سبب بن گئی۔ پھر ان کی حکومت تمام مصر پر مسلم اور مستحکم ہوگئی۔

نتیجہ

ان مجموعی آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کچھ خواب ایسے ہوں جو کچھ حقائق کے ادراک کا منبع بن جائیں۔ یا بالفاظ دیگر ممکن ہے کہ کشف وشہود کا مسئلہ خواب میں جامہ عمل پہنے لیکن بیداری میں نہیں۔ تو صرف اس قسم کے خواب کی آیات بالا کی دو سے تین قسمیں ہیں:

۱۔ بعض تو بعینہ اور بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے بیداری ہی میں نظر آجاتے ہیں جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت کر رہے ہیں اور جس کا تذکرہ سورہ فتح میں آیا ہے۔

۲۔ ایسے خواب بھی ہیں جو تعبیر کی صورت میں جامہ عمل پہنتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تفسیر کی جائے اور تفسیر بھی ایسے جسے صاحب علم وآگاہ معبر ہی جانتا ہے (جیسے حضرت یوسف، سلطان مصر اور قیدیوں کے خواب میں جو سارے کے سارے سورہ یوسف میں بیان کیے گئے ہیں)۔

۳۔ ایسے خواب جو حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور نیند کی حالت میں وحی کی حیثیت رکھتے ہیں (جیسے حضرت ابراہیمؑ کا خواب ہے)۔

لیکن اس قسم کی گفتگو کا یہ مقصد نہیں کہ ہر ایک خواب کو کشف وشہود سمجھا جائے، بلکہ بہت سے ایسے خواب ہیں جو ''اضغاث احلام'' (پریشان خواب) ہوتے ہیں اور ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ ایسے خواب ہوتے ہیں جو وہم کی طاقتوں کی فعالیت کا نتیجہ ہوتے ہیں یا پھر محرومیوں، ناکامیوں اور پرکار ردعمل ہوتے ہیں۔

سوال

ممکن ہے کہ اس مقام پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ آیا آئندہ کے حالات کے ساتھ خوابوں کا تعلق علمی حیثیت کا حامل ہوتا ہے، جبکہ مشہور ماہر نفسیات ''فرائیڈ'' کی پیروی کرتے ہوئے کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ خواب تو صرف پوری نہ ہونے والی خواہشات اور ضروریات کا ردعمل ہوتے ہیں جو ''من'' کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ذہن کے خود آگاہ میدان میں آپہنچتے ہیں، یا بالالفاظ دیگر ضمیر باطن میں جو خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور کبھی تو بغیر تعبیر کے ظاہر ہوتے ہیں (جیسا کہ وہ عاشق کا محبوب اس سے جدا ہوگیا ہو اور وہ اسے خواب میں دیکھتا ہے) اور کبھی شکل تبدیل کرکے مناسب صورت میں منعکس ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس کی تعبیر کی ضرورت ہوگی۔

جواب

یہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس مدعا کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ خواب ایسے ہوں لیکن یہ دعویٰ کہ تمام خواب ایسے ہیں، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ [1]

اس میں شک نہیں ہے کہ خوابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم ایسی ہے جس کا نام ''رویا صادقہ'' ہے اور یہ بعض حقائق کے انکشاف کی دلیل ہے۔ ان حقائق کو ہم نے سب سے پہلے مرحلے میں تو قرآن پاک سے اخذ کیا ہے جو کہ خدائی وحی ہے اور دوسرے مرحلہ پر وہ تجربات ہیں جو اس بارے میں انجام پائے ہیں۔ اس سے مراد بے بنیاد قصے کہانیاں نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے زمانے میں یا اس سے پہلے کے زمانے میں عظیم اور مشہور و معروف افراد کے درپیش آئے ہیں اور انہوں نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ (ہم نے بھی تفسیر نمونہ، جلد ۹ میں، اس کے کئی واضح نمونے درج کیے ہیں)۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ خواب کو خواب ہونے کی حیثیت سے ''معرفت کے منبع'' کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خواب حجت نہیں بن سکتا، بلکہ کئی دوسرے بیرونی قرائن اور شواہد کا بھی ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے تا کہ اس طرح سے وہ واضح اور ناقابل تردید اور ٹھوس ثبوت بن سکیں۔

۴۔ ''رحمانی'' اور ''شیطانی'' مکاشفے

شاید اس بات کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو کہ حقیقی اور واقعی کشف و شہود وہ ہوتا ہے جو یا تو کامل ایمان اور یقین کی وجہ سے وجود میں آتا ہے یا پھر ریاضتوں اور مشقتوں کے بعد۔ اس کے مقابلے میں بہت سے کشف اور شہود ایسے ہوتے ہیں جن کا منبع اور مرکز وہم اور خیال ہوتے ہیں، جو یا تو فکر و ذہن کے بار بار کی راہِ راست سے لغزشوں یا کبھی شیطانی وسوسوں کی وجہ سے ایسی صورت حال انسان کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے جس کا حقیقت اور واقعیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سوائے چند وہم و خیال کے اور کچھ نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر ''صوفیا'' جس قسم کے کشف و شہود کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سادہ لوح مرید آغاز کار میں کچھ لوگوں کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر معتقد ہو جاتا ہے اور خواب اور رویا کے ذریعہ اپنے حقیقی راہنما اور ''مرشد'' کو تلاش کرنا چاہیے اور روز بروز اس کی یہ فکر مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ عالم خواب میں اپنے مرشد کی زیارت کرے (غالباً وہ کچھ لوگوں کو اپنی نگاہوں میں اس منصب کے لیے منتخب کر لیتا ہے، اگرچہ بطور کامل کسی کو منتخب نہ بھی کرے کئی لحاظ سے

---

[1] دور حاضر کے دانشمند آج تک اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ خود ''نیند'' کی اصل وجہ کیا ہے؟ آیا انسان کسی ''فزیکل'' عامل کی وجہ سے نیند کرتا ہے یا کسی ''کیمیکل'' وجہ سے سوتا ہے، یا دونوں کی وجہ سے؟ یا بلکہ اعصاب کی فعالیت کا ایک علیحدہ سسٹم ہے۔ خود ''نیند'' کا اصل مسئلہ ہی معمہ بنا ہوا ہو تو پھر وہاں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ ''خواب'' کے مسئلہ کو حل کیا جائے جو نیند سے کئی درجے پیچیدہ ہے۔

اس کی حدود اور خاص امتیاز صفات کو ذہن میں ضرور مدنظر رکھتا ہے)۔

کبھی مشقت آور ریاضتوں اور مزاجی انحراف کی وجہ سے انسان اپنی فکر کے طبعی توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور اس میں قوت خیال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ناگہاں ایک رات عالم خواب میں اشخاص کو اپنے مقصود کی حدود میں دیکھ لیتا ہے۔ اگر مکمل طور پر انہیں نہ بھی دیکھ سکے تو تھوڑی سی توجیہہ اور تفسیر کے ساتھ اس میں ترمیم کر لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی ''مریدی'' عملی جامہ پہنتی ہے۔

ممکن ہے یہی صورتِ حال اسے عالم بیداری میں بھی حاصل ہو جائے، کیونکہ اس سادہ لوح اور سادہ ذہن ''مرید'' کی آنکھیں اور کان راہ پر لگے ہوئے ہیں اور وہ عالم غیب کی طرف متوجہ ہے۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس جہان کا کوئی دروازہ اس پر کھل جائے یا اس کے کان میں کوئی آواز پہنچ پائے۔ وہ ہمیشہ اسی چیز کو اپنے اندر دہراتا رہتا ہے اور عالم ذہن میں اسے پروان چڑھاتا رہتا ہے اور رات دن اسی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ قوت خیالی کی سرگرمیوں کی وجہ سے اچانک اس کے کان میں کوئی آواز پہنچتی ہے یا کوئی صورت اس کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے اور وہ اسے بنیاد بنا کر اپنے عقائد کی عمارت اس پر استوار کرتا ہے۔

ذوق پر مبنی اور نشاط آور مطالب جو کبھی تو دلچسپ اشعار اور دماغ کو مسحور کر دینے والی دھنوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس قسم کی صورت حال کو جلا بخشتے ہیں۔

صوفیاء کا وہ گروہ جو وجد اور سماع[1] کا حامی ہے، وجد اور سماع کی حالت میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ جوش وخروش میں آ کر بے خود اور بے سدھ ہو جاتے ہیں اور قوت عاقلہ کو گم کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قوت وہمیہ کی فعالیت کے لیے میدان خالی ہو جاتا ہے اور جو لوگ ہمیشہ عالم غیب کے کشف اور مشاہدہ کے خیال میں مگن رہتے ہیں انہیں تمام عالموں کی سیر کے لیے لے اڑتی ہے اور ان عالموں کی سیر کراتی ہے جو ان کی قوت خیال میں سمائے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے نور کے دریا اور کوہ طور کو اور ساتوں طبق آسمان اور زمین کو مجسم دیکھتے ہیں۔ ان کی قوت وہمیہ جس شکل وصورت کو پسند کرتی ہے وہی ان کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے۔

وہ ایسی صورت حال کو دیکھ کر زبردست مسرور اور شادمان ہوتے ہیں اور اس گمان سے کہ وہ اپنے مطلوب ومقصود کو بالمشاہدہ پا چکے ہیں، نعرے لگانا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور یہی چیز ان کی کیفیت میں شدت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ آخر میں غشی جیسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں اور جب اس سے افاقہ ہوتا ہے تو اس دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا ہوتا ہے وہ اپنے مکاشفات کے عنوان سے دوسروں کو بتاتے ہیں۔

درحقیقت وہ لوگ ''آب'' کے گمان سے ''سراب'' کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی جگہ تک پہنچے بغیر ان امور میں پھنس جاتے ہیں جو کلی طور پر حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔

---

[1] ''سماع'' سے مراد موسیقی کی مختلف دھنیں یا گانے والوں کے نغمے ہیں جو صوفیوں کی بعض مجالس میں رائج ہیں اور ''وجد'' سے مراد ذوق اور شوق کی وہ حالت ہے جو سماع پسند صوفیوں کی حالت ہوتی ہے اور رقص سے ملتی جلتی حرکات سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔

قصہ مختصر ایسی بات ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص بھی کشف وشہود کا دعویٰ کرے اس کو کسی حیل وحجت کے بغیر تسلیم کرلیا جائے، یا اگر کوئی صورت اس کی نگاہوں میں مجسم ہوکر آجائے، یا کوئی آواز اس کے کانوں میں پہنچ جائے، اسے خدائی اور واقعی سمجھا جائے، کیونکہ شیطانی مکاشفے بھی تو کم نہیں ہیں۔

کتاب ''احتجاج طبرسی'' میں ایک روایت ابن عباس سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ''حسن بصر'' کے پاس گزر رہے تھے اور وہ (حسن بصری) وضو میں مشغول تھے۔ (اور وہ وضو کا پانی استعمال کرنے میں سختی سے کام لیتے تھے) حضرت امامؑ نے ان سے فرمایا ''حسن! وضو کو زیادہ پانی کے ساتھ انجام دیا کرو (سختی سے کام نہ لیا کرو)۔''

حسن بصری نے کہا: ''اے امیر المومنین! آپ نے کل (میدانِ جنگ جمل میں) ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے جو خدا کی وحدانیت، پیغمبرؐ کی رسالت کی گواہی دیتے تھے، پنجگانہ نمازیں پڑھتے تھے وضو کے لیے کھلا پانی استعمال کرتے تھے۔''

امام نے فرمایا: ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم نے ان کی مدد کیوں نہیں کی؟''

حسن نے کہا: ''خدا کی قسم میں آپ کی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں اے امیر المومنین! سو اس بارے میں عرض ہے کہ میں پہلے دن باہر آیا، غسل کیا، حنوط ملا اور اسلحہ اٹھا کر چل پڑا اور مجھے اس بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ عائشہ کی امداد سے دستبرداری کفر ہے۔ چنانچہ جب میں (بصرہ کے قریب) ''حزینہ'' کے مقام پر پہنچا تو ایک آواز میرے کان میں پہنچی کہ اے حسن! کہاں جا رہے ہو؟ واپس لوٹ جاؤ کیونکہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہیں۔ میں گھبرا کر واپس آ گیا اور گھر میں بیٹھ گیا۔

دوسرے دن بھی مجھے یقین کامل تھا کہ عائشہ کی امداد نہ کرنا کفر ہے۔ چنانچہ میں نے پہلے دن کی طرح غسل وحنوط کا بندوبست کیا اور ہتھیار لگا کر باہر آ گیا اور کل والی جگہ پر پہنچا تو وہی آواز سنی کہ اے حسن! بار بار کہاں جا رہے ہو؟ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔''

حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا، لیکن معلوم بھی ہے کہ وہ ندا دینے والا کون تھا؟''

حسن نے کہا: ''نہیں!''

امام نے فرمایا: ''وہ تمہارا بھائی شیطان تھا اور ایک لحاظ سے اس نے ٹھیک کہا تھا، کیونکہ اس گروہ کے قاتل اور مقتول دونوں قسم کے لوگ جہنمی ہیں۔ (کیونکہ وہ جمل کے بلوائی تھے جنہوں نے مسلمانوں کی حکومت اور امام وقت یعنی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا)۔ [1]

اس قسم کے غیبی مکاشفے اور آوازیں بعینہ وہی چیزیں ہیں جن کو قرآن مجید میں ''شیطانی وحی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام ۱۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى

---

[1] احتجاج طبرسی جلد ا ص ۲۵۰

بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ

''اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے مقابلے میں جنوں اور انسانوں سے کچھ شیاطین قرار دیئے ہیں جو بے بنیاد اور دھوکے پر مبنی باتوں کو مخفی طور پر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ ایک قسم کی آزمائش عمل میں آتی ہے اور امتحان ہوتا ہے کہ مومنین کی صفیں غیر مومنین سے جدا ہو جائیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں سورہ انعام ہی کی ۱۲۱ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ لَيُوۡحُوۡنَ اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓـئِهِمۡ

''یعنی شیاطین مخفی طور پر کچھ باتیں اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ جب انسان ''صوفیا'' کی کتابوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو انہیں ایسے مکاشفوں سے لبریز دیکھتا ہے جو نہایت ہی وحشت ناک ہوتے ہیں اور جن کے غلط آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر ہم صرف چند نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ہم اصل مطلب سے دور نہ نکل جائیں۔ اس اجمال سے آپ خود ہی تفصیلی جائزہ مرتب فرمالیں۔

۱۔ کتاب ''صفوۃ الصفا'' جو ''شیخ صفی الدین اردبیلی'' کے حالات میں اس کے ایک مرید نے لکھی ہے، میں یوں لکھا ہوا ہے:

''ایک کارکن شخص نے شیخ سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شیخ کی آستین کا سرا عرش سے تحت الثریٰ تک پہنچا ہوا تھا تو شیخ نے کہا یہ تو تجھے تیرے حوصلے کے مطابق دکھایا گیا ہے۔''

۲۔ ''محی الدین عربی'' کتاب ''مسامرۃ الابرار'' میں کہتے ہیں:

''رجبیون وہ لوگ ہیں جن میں ایک قسم کی ریاضت پائی جاتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ مکاشفے کی حالت میں وہ ''رافضیوں'' (شیعوں) کو خنزیر کی حالت میں دیکھتے ہیں۔''

۳۔ شیخ عطار کتاب ''تذکرۃ الاولیاء'' میں ''بایزید بسطامی'' کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بایزید نے کہا میں ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا جب میں حق تک پہنچ گیا تو خانہ کعبہ کو دیکھا کہ وہ میرے گرد گھوم رہا ہے...... حق تعالیٰ نے مجھے ایسے مقام تک پہنچا دیا کہ تمام مخلوق کو دو انگلیوں کے درمیان دیکھنے لگا۔''[1]

۴۔ اسی کتاب میں لکھا ہے ''بایزید'' نے کہا:

''حق تعالیٰ نے مجھے دو ہزار مقام اپنے سامنے حاضر کیا اور ہر مقام میں مجھے ایک مملکت پیش کی لیکن میں نے قبول نہیں کی۔''[2]

یہ اس قسم کے دعوے ہیں کہ جن کے متعلق نہ تو کسی نبی مرسل سے اور نہ ہی کسی معصوم امام سے سنا گیا ہے بلکہ بارگاہ رب العزت اور

---

[1] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۲

[2] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۱

خانہ کعبہ کے پاس دعائیں اور مناجاتیں ان کے خضوع وخشوع اور تذلل وزاری کی غماز ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے مکاشفات اگر چہ عمدی طور پر نہ بھی ہوں، شیطانی اوہام اور خیالات ضرور ہیں، جو مختلف عوامل کی بناء پر جن میں سے بعض کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے بعض لوگوں کے ذہن منقش ہوجاتے ہیں اور اس کی وسعت ان لوگوں کے تخیلات اور بلند پروازی کے مطابق ہی ہوا کرتی ہے۔

سوال

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ آیا ''رحمانی'' اور ''شیطانی'' مکاشفات یا ''واقعیت'' اور ''خیال'' کی کوئی شناختی علامات ہیں یا نہیں؟

جواب

جی ہاں! اس کی تین اہم ترین علامتیں ہیں اور اجمالی طور پر ان دونوں کا آپس میں فرق یوں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ:

''رحمانی مکاشفے'' یقینی اور قطعی ہونے کے ساتھ ساتھ یقین، ایمان، معرفت، اخلاص، توحید اور عمل صالح کے اعلیٰ معیار سے مزین ہوتے ہیں، جبکہ ''شیطانی مکاشفے'' اور خیالات واوہام ان چیزوں سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ بنا بریں اگر اس قسم کی باتیں ان لوگوں سے سنی جائیں جن میں یہ شرائط نہیں پائے جاتے تو وہ ہر لحاظ سے ناقابل اعتبار ہوں گے۔

ہم ابھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''علم ایک نور ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈالتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔ دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور وہ مشکلات وآزمائش کو برداشت کرتا ہے۔''

آپؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہؐ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو فرمایا:

''ہاں اس کی نشانی یہ ہے کہ اس فریب کار اور دھوکہ باز دنیا سے بے اعتنائی، ہمیشگی سرائے جاودانی کی طرف پوری توجہ اور (ایمان و عمل صالح کے ذریعہ) موت کے لیے آمادگی قبل اس کے کہ وہ نازل ہو۔''[۱]

دوسری بات یہ ہے کہ ''حقیقی مکاشفات'' ہمیشہ کتاب اور سنت کے ہم آہنگ ہوتے ہیں، آیات الٰہی اور اقوال معصومین کی روشنی میں ہوتے ہیں اور سوئی کی نوک کے برابر خدا کی اطاعت سے باہر نہیں ہوتے اور گناہ وعصیان سے ذرہ بھی ملوث نہیں ہوتے۔

تیسرے یہ کہ ان کے مضامین اور متعلقات مکمل طور پر عقل کے دوش بدوش ہوتے ہیں اور نامعقول بلند پروازیوں اور خیالی پلاؤ پکانے سے بالکل پاک صاف ہوتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مکاشفہ کی حالت میں ''رافضیوں'' کو سور کی شکل میں دیکھا ہے درحقیقت انہوں نے اپنے اندرونی آئینہ میں اپنی ہی صورت کو دیکھا ہے۔

اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے خدا کا اس قدر قرب حاصل کرلیا کہ خانہ کعبہ کو اپنے گرد گھومتے دیکھا ہے، درحقیقت وہ خودسر گردانی کا

---

[۱] تفسیر الصراط المستقیم، جلد ا، ص ۲۶۷

شکار ہوا ہے کیونکہ وہ خود کو خدا کے گھر کے طواف سے بے نیاز اور اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ خود سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری سال میں ''حجۃ الوداع'' ادا کیا، مراسم حج کے طور پر خانہ کعبہ کا طواف اور دیگر مراسم بجالائے۔

کشف وشہود کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ معرفت کا یہ منبع، دوسرے منابع کی مانند نہیں ہے جیسے عقل، حس اور تاریخ وغیرہ ہوتے ہیں، بلکہ یہ ایک خصوصی منبع ہے جس کی سخت اور کڑی شرطیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

اشارہ

اب تک ہم معرفت اور شناخت کی منزلیں طے کرنے کے سلسلے میں کئی منازل طے کر چکے ہیں۔

ہم اپنے فکر اور عقل سے باہر کی حقیقتوں اور واقعیتوں کو قبول کر چکے ہیں اور یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کسی حد تک ان حقائق تک پہنچ سکتا ہے۔

حقیقت کی شناخت و معرفت کے لیے چھ منابع کو بھی اچھی طرح پہچان چکے ہیں۔

اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے پانچ منابع یعنی ''حس''، ''عقل''، ''فطرت''، ''تاریخ'' اور ''وحی'' کی عمومی حیثیت ہوتی ہے لیکن چھٹا منبع شہود باطنی کی حیثیت عمومی نہیں ہوتی بلکہ یہ مومنین اور اللہ کے اولیاء کے لیے خاص ہے۔

اب ہمارے راستے میں صرف دو منزلیں باقی رہتی ہیں جن سے گزر کر ہم اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔ ایک تو ہے ''معرفت کی راہ میں رکاوٹیں'' اور دوسری ہے ''معرفت کے معاونین'' لیکن اس وقت ہماری بحث کا موضوع ''معرفت کی راہ میں رکاوٹیں'' ہے۔

اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں کہ دنیا کی مختلف موجودات اور اشخاص کے چہروں کو دیکھنے کے لیے صرف دو آنکھیں ہی کافی نہیں، بلکہ درمیان میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ اور حجاب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہماری فضا کے اطراف کو سیاہ دھوئیں یا گہرے گرد وغبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو تو ہم اپنے پاؤں کے ساتھ تک کی چیزوں کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح اگر آفتاب عالمتاب کہ جس کی روشنی ہر جگہ ضرب المثل ہے، تاریک اور گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ جائے تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک چڑھائے تو وہ یقینا کسی بھی چیز کو نہیں دیکھ سکے گا اور اگر وہ رنگین ہو تو سب کچھ رنگین نظر آئے گا اگر اس کے شیشے میلے اور ناموزوں ہوں تو چیزوں کے چہرے کج مج یعنی ٹیڑھے ہی نظر آئیں گے۔ اگر کوئی شخص یرقان کی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ ہر چیز کو زرد ہی دیکھے گا۔ اگر بھینگا کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اسے خلاف حقیقت نظر آتی ہے۔

بعینہ اسی طرح اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت کے لیے کچھ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور تاریخ کے آئینہ کے سامنے ممکن ہے کہ کچھ موانع معرض وجود میں آ جائیں۔ جب رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں یا موانع ایجاد ہو جاتے ہیں تو ان کی وجہ سے وحی کا صحیح معنی میں ادراک اور کلام معصومین علیہم السلام کا صحیح معنی میں سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ ایسی رکاوٹوں اور موانع کے بارے میں تحقیقات کتنا ضروری ہے؟

چونکہ تفسیر موضوعی کی بحثوں میں ہم قرآنی روایات کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا اس بارے میں بھی سب سے پہلے آیات کو بیان کریں گے اور ہم صرف ان موانع اور آفات کی بحث کریں گے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور یہ کام بنیادی ہے۔

معرفت کی رکاوٹوں کے بارے میں آیات قرآنی نے دو طرح سے بحث کی ہے، ایک تو کلی بحث ہے جو "خبردار کرنے والی" ہے اور دوسری جزئی بحث ہے جو "آگاہ کرنے والی" ہے۔ لیکن فی الحال ہم کلی بحث کو شروع کرتے ہیں۔

کلی طور پر معرفت کے پردے

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ (سورہ فاطر ۸)

(۲) وَلٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾

(سورہ انعام ۴۳)

(۳) فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ

(سورہ آل عمران ۷)

(۴) کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ (سورہ مطففین ۱۴)

(۵) یَجۡعَلَ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ (سورہ حج ۵۳)

(۶) وَّجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَفِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا ؕ

(سورہ بنی اسرائیل ۴۶)

(۷) وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

(سورہ بقرہ ۸۸)

(۸) وَنَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (سورہ اعراف ۱۰۰)

(۹) وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۸۷﴾ (سورہ توبہ ۸۷)

(۱۰) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫

(سورہ بقرہ ۷)

(۱۱) اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (سورہ جاثیہ ۲۳)

(۱۲) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (سورہ محمد ۲۴)

(۱۳) فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

(سورہ حج ۴۶)

(۱۴) لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(سورہ اعراف ۱۷۹)

ترجمہ

(۱) آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے......

(۲) لیکن ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں شیطان نے انہیں ان کے لیے مزین کر دیا ہے۔

(۳) لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی اور انحراف ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تا کہ وہ فتنہ انگیزی کریں۔

(۴) بات وہ نہیں ہے جو وہ لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ کی طرح بیٹھ چکے ہیں۔

(۵) مقصد یہ تھا کہ خداوند عالم نے شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دیا جن کے دل میں بیماری ہے۔

(۶) جن کے دلوں پر ہم نے پردے قرار دیئے ہیں تا کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہیں۔

(۷) اور انہوں نے (مذاق کے طور پر) کہا ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی وجہ سے دور کر دیا ہے۔ (اسی وجہ سے وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے) اور بہت کم ایمان لے آتے ہیں۔

(۸) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تا کہ وہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

(۹) اوران کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

(۱۰) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

(۱۱) آیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات کو معبود قرار دے دیا ہے؟ اور خداوند عالم نے اسے جانتے ہوئے (کہ ہدایت کے لائق نہیں) گمراہ کیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔

(۱۲) آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

(۱۳) ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو دل سینوں میں ہیں وہ بینائی اور بصیرت کو کھو چکے ہیں۔

(۱۴) ان کے دل (عقلیں) ہیں وہ ان کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں۔ وہ تو چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی تو غافل ہیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

سب سے پہلے ہم ان مختلف اور ظریف الفاظ پر ایک تحقیقی نظر ڈالتے ہیں جو مندرجہ بالا آیات میں انسان کے معرفت سے محروم ہونے اور شناخت کے مانع ہونے کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک انسانی فکر کے انحراف اور معرفت سے محروم ہونے کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ کمزور مرحلے سے شروع ہو کر سخت اور خطرناک قسم کے مراحل تک جا پہنچتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تشخص کی حس اس سے سلب ہو جاتی ہے، بلکہ حقیقت کا چہرہ اس کی نگاہوں میں الٹا نظر آتا ہے۔ وہ دیو کو فرشتہ، بدصورتی کی خوبصورتی اور باطل کو حق کی صورت میں دیکھتا ہے۔

"زیغ" ارباب لغت کے بقول "انحراف" یا "حق و صداقت سے انحراف" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے ہم قرآن میں پڑھتے ہیں "ربنا لا تزغ قلوبنا" اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ایمان اور حق سے منحرف نہ فرما۔[1]

"ران" "رین" (بروزن عین) کے مادہ سے ہے جس کے معنی وہ زنگ ہے جو قیمتی اشیاء پر چڑھتا ہے۔ یہ قول "مفردات" میں راغب" کا ہے۔ بعض دوسرے ارباب لغت نے کہا کہ "وہ سرخ رنگ کی تہہ ہے جو ہوا کی نمی کی وجہ سے لوہے جیسی دھاتوں پر چڑھ جاتی ہے" جسے اردو میں "زنگ" اور فارسی میں "زنگ" یا "زنگار" کہتے ہیں۔ اور یہ چیز عام طور پر دھات کی چیزوں کے گلنے سڑنے اور ضائع ہونے کی علامت اور ان کی چمک اور شفافیت کے ختم ہو جانے کا سبب بنتی ہے۔

بعض ارباب لغت نے اس کی "ایک چیز کا دوسری چیز پر تسلط" یا "ایسے حادثے کا شکار ہونا جس سے نکلنا دشوار ہو" کے معنی میں تفسیر کی

[1] آل عمران ۸

ہے۔اسی لیے ”شراب“ کو بھی ”رینه“ کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی عقل پر غالب آجاتی ہے۔[1]

”وقر“ (بروزعقل) اس قدر بہرے پن کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی بات کو بڑی مشکل سے سن سکے۔

”وقر“ (بروزن فکر) ہرطرح کے بوجھ کو کہتے ہیں خواہ وہ انسان کی پیٹھ پر ہو یا سر پر اور بوجھل اور بھاری چیزوں کو ”وقر“ بھی کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ صاحبان عقل و متانت کو ”صاحب وقار“ کہتے ہیں۔

”غشاوة“ کا معنی ہے ہر وہ چیز جو دوسری چیز کو چھپا لے۔اسی لیے پردے کو ”غشاوة“ کہتے ہیں اور قیامت کو بھی اسی لیے ”غاشیه“ کہتے ہیں کہ اس سے اٹھنے والے ہر قسم کے اضطراب اور بے چینی سے سب چیزیں چھپ جائیں گی اور رات کی ایسی گہری تاریکی کو بھی ”غشاوة“ کہتے ہیں جو پردے کی مانند سطح زمین پر پڑتی ہے اور یہ لفظ ”خیمہ“ کے معنی میں بھی بولا گیا ہے۔

”اکنة“، ”کنان“ (بروزن زیان) کی جمع ہے جو دراصل ہر قسم کے اس پردے کے معنی میں ہے جس سے کسی چیز کو چھپایا جاتا ہے اور ”کن“ (بروزن جن) اس ظرف (برتن) کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھیں اور گھر پر بھی اور ہر اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے اور دلوں پر ”اکنه“ کے پڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے تشخص کی قوت سلب ہوگئی ہے۔

”غلف“ (بروزن قفل) ”اغلف“ کی جمع ہے جو ”غلاف“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں تلوار یا کسی اور چیز کا پردہ (نیام) وغیرہ اور ”قلوب غلف“ ایسے دلوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حقائق اور واقعیت کے درک کی قدرت نہیں ہوتی۔گویا کہ وہ غلاف میں بند پڑے ہیں۔

”قست“، ”قسوه“ (بروزن مرده) اور ”قساوت“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں سخت اور ٹھوس ہونا اور نرمی اور جھکاؤ کو ختم کر دینا اور ”قسی“ ناخالص چاند کو کہتے ہیں اور ”باقساوت دل“ وہ دل ہوتے ہیں جو حق اور عدالت کے سامنے ہر قسم کی نرمی اور جھکاؤ سے عاری ہوں۔

”نطبع“، ”طبع“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز پر نقش قائم کرنا ہے۔اسی لیے کرنسی سکوں اور ان پر قائم ہونے والے نقوش کو ڈھالنے کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے اور ان مہروں کو ”طابع“ (بروزن خاتم) کہتے ہیں جن کے ذریعہ خطوط پر مہر لگائی جاتی ہے۔

اور جب یہ کلمہ ”عقل“ اور ”دل“ کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ ان میں حقیقت کے درک کرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔کیونکہ ان کے دروازے بند کر کے ان پر مہر لگا دی گئی ہے۔

”طبع“ (بروزن عمل) کا لفظ ایسے زنگ کے معنی میں ہے جو تلوار پر چڑھ جاتا ہے اور جو گناہ اور معصیتیں انسان کے دل کو ڈھانپ دیتی ہیں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

”ختم“ (بروزن حتم) دراصل کسی چیز کے ختم کر دینے کو کہتے ہیں۔چونکہ خط کے مضمون کو مہر لگا کر ختم کیا جاتا ہے لہٰذا مہر کو

---

[1] تفسیر فخر رازی، سورہ مطففین کی ۱۴ ویں آیت کے ذیل میں اور ”المنجد“ مادہ ”دین“۔

''خاتم'' کہتے ہیں اور چونکہ گزشتہ زمانے میں بہت سے لوگوں کے نام کی مہر ان کی انگوٹھیوں پر ہوتی تھی اور وہ اپنی انگوٹھی کے ساتھ خطوط پر مہر لگایا کرتے تھے اس لیے مہر کو ''خاتم'' کہا جاتا ہے۔

گزشتہ زمانے سے اب تک یہ دستور چلا آرہا ہے کہ جب کسی خط، صندوق یا گھر کو بند کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسے کوئی نہ کھول سکے تو پہلے اسے دھاگے یا تالے سے بند کردیتے ہیں پھر اس پر لاکھ یا مٹی رکھ کر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی اسے کھولنا بھی چاہے تو حتماً اس لاکھ اور مہر کو توڑے۔

دلوں اور عقلوں کے بارے میں ایسی تعبیر کا استعمال کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر ناقص اور بے کار ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی بھی صورت میں نہیں کھولا جاسکتا اور نہ ہی معرفت اور شناخت کی راہوں کو ان تک باز کیا جاسکتا ہے۔

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

معرفت کی آفات کا بالتدریج اثر و رسوخ (کجی، زنگ، بیماری، پردہ اور تالہ)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''معرفت کی رکاوٹوں'' کی بحث کی اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے دو مرحلوں میں پیش کیا جائے۔

مرحلہ اول میں ان آفات اور موانع کے اجمالی وجود کا تذکرہ ہے۔ اس مرحلے میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ انسان کی عقل، ادراک اور فطرت پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اور معرفت کے ان عظیم سرچشموں کو کیونکر آلودہ کردیتے ہیں؟ اور پھر انہیں معرفت کے کاموں سے کس طرح بیکار کردیتے ہیں؟

مرحلہ دوم میں ان آفات و موانع میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی گفتگو، ان کے جزئیات اور خصوصیات کا بیان ہوگا اور اس بارے میں وارد ہونے والی قرآنی آیات کا ذکر ہوگا۔ یہ نہایت ہی مفصل، مدلل اور سبق آموز بحث ہوگی۔

سب سے پہلے ہم مرحلہ اول کا ذکر کریں گے۔ قابل توجہ یہ چیز ہے کہ قرآن مجید ان آفات کے بالتدریج اور مخفی اثر و رسوخ کے بارے میں اس قدر جچی تلی اور دقیق گفتگو کرتا ہے کہ علم و دانش اور معرفت کے راہیوں کو ان عظیم خطرات سے مکمل طور پر آشنائی حاصل ہوجاتی ہے اور انہیں پے در پے متنبہ کرر رہا ہے کہ مبادا ہماری زندگی آب کی بجائے سراب کی تلاش میں گزر جائے اور ہم اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور سالہا سال حقیقت کی تلاش میں گزارنے کے بعد بھی ہم باطل کے دروازے پر کھڑے نظر آئیں۔

اب ہم مل کر مندرجہ بالا آیات کی تحقیق کرتے ہیں۔

پہلی اور دوسری آیات میں انسانی اعمال کے مزین ہونے کی بات ہو رہی ہے اور تزیین یا تو شیطان کے ذریعے عمل میں آتی ہے (جیسا کہ دوسری آیت میں بیان ہوا ہے) یا پھر خود انسان کی ذہنی سجاوٹوں اور خیالی پلاؤ پکانے کے ساتھ ساتھ ''سبز باغوں'' کی سیر کے ذریعہ، یا کسی اور عامل کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ (جیسا کہ پہلی آیت میں بصورت سربستہ اور فعل مجہول کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہے)۔ ارشاد ہوتا

ہے: ''آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے' اس شخص کی مانند ہے جو اس طرح نہیں ہے؟ یقینی بات ہے کہ پہلا شخص حتمی تباہی اور بربادی کی طرف جارہا ہے جبکہ دوسرا شخص خدا کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہے اور اگر اس سے کوئی برائی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو فوراً اس کی توبہ، بازگشت اور تلافی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری آیت میں اضافہ ہوتا ہے کہ پہلے تو انسان کا دل سخت اور مڑنے کی قابلیت سے نکل جاتا ہے۔ پھر وہ شیطانی وسوسوں اور اچھائیوں کے لباس میں ظاہر ہونے والی برائیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کچھ لوگ نہ صرف اپنے ناز یبا اعمال سے متنفر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ان پر نازاں بھی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان اعمال کے مفید اور منطقی ہونے پر مصر ہوتے ہیں۔

یہی چیز حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوئی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنویں میں ڈال کر ان کا خون آلود کرتا اپنے باپ (حضرت یعقوبؑ) کے پاس لے آئے اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگے کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے اور ہم اس بات میں سچے ہیں، تو ان کے روشن ضمیر بوڑھے باپ نے انہیں کہا:

بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ

''تمہاری نفسانی خواہشوں نے اس کام کو تمہارے لیے مزین کیا ہے۔'' (یوسف ۱۸)

یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر کے تم نے اچھا کام کیا ہے اور یوسف کو ضائع کر دینے سے باپ کے دل میں ان کی خالی جگہ تم لے لو گے اور یوسف ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے؟ حالانکہ تم اس بات سے غافل ہو کہ تم خود ہی تو یوسف کی عزت اور حکومت کے اسباب اپنے ہاتھوں سے فراہم کر رہے ہو اور باپ کے دل میں ان کی جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی کر رہے ہو تا کہ ''بارِ دیگر گمشدہ پیدا شود'' (ایک بار پھر گمشدہ مل جائے گا)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآنی آیات میں ''تزئین کی'' کہیں پر تو ''شیطان'' کی طرف نسبت دی گئی ہے اور کہیں پر ''نفس'' کی طرف اور کہیں پر فعل مجہول کی صورت میں بیان ہوئی ہے اور پھر کہیں پر خدا کی طرف منسوب ہے۔ جیسے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، حساب و کتاب، سزا و جزا اور خدائی انصاف کی عدالت سے بے خبر ہیں، ہم ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں۔'' (سورہ نمل ۴)

درحقیقت یہ سب ایک ہی چیز کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں ایسے کاموں کے مقدمات خود انسان فراہم کرتا ہے پھر شیطان اس میں رنگ بھرتا ہے۔ چونکہ خداوند عالم مسبب الاسباب اور علت ومعلول کا خالق ہے لہٰذا ان کاموں کے نتیجہ کی نسبت اس کی طرف دی جاتی ہے۔ اس کی حکمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے افراد ایسے ہی انجام سے دوچار ہوں۔ کس قدر دردناک ہے اس شخص کا حال جس کی نظر میں برائیاں، اچھائیوں میں تبدیل ہو کر جلوہ افروزی کرتی ہیں۔

تیسری آیت میں انحراف قلب کے سب سے پہلے مرحلہ کا ذکر ہے۔اس کے بعد قرآنی آیات کو ”محکمات“ (یعنی وہ آیات جن کا مفہوم مکمل طور پر واضح اور روشن ہے) اور ”متشابہات“ (جن آیات کے معانی پیچیدہ ہیں) یعنی دو حصوں میں تقسیم کر کے فرماتا ہے۔”علم و دانش میں راسخ لوگ ان سب آیات پر ایمان لے آتے ہیں“ (اور متشابہ آیات کی محکم آیات کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں)۔لیکن جن کے دلوں میں ”زیغ“ یعنی کجی ہے وہ متشابہ آیات کی اپنی مرضی کے مطابق تفسیر کر کے فتنہ انگیزی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔“

وہ ہمیشہ اپنے غلط اور ناجائز مقاصد کی توجیہہ کے لیے آیات متشابہ کا سہارا لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے منافقین، صاحبان بدعت اور گمراہ کن مکتب کے پیروکار جہاں پر دیکھتے ہیں کہ وہاں پر رہنے والے لوگ خلوص قلب کے ساتھ قرآنی آیات پر مکمل طور پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اس پاکیزہ عقیدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے متشابہ آیات کی ”تفسیر بالرائے“ کر کے اپنی بدعتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر چونکہ ان کے اپنے ہی قلب وفکر ہوتے ہیں لہٰذا وہ قرآنی آیات کو بھی منحرف دیکھتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ٹیڑھے اور کج مج آئینے میں صورتیں بھی ٹیڑھی ہی نظر آتی ہیں۔

چوتھی آیت میں دلوں کے زنگ کا مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔گناہ آلودہ اعمال سے جو گرد وغبار دل پر بیٹھ جاتا ہے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تہہ در تہہ جم کر پتھر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور زنگ کی مانند تمام دل کو ڈھانپ لیتا ہے۔اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ”بات وہ نہیں جو یہ لوگ سمجھے ہوئے ہیں بلکہ ان کے برے اعمال زنگ کی مانند ان کے دلوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔اگر وہ حقیقت کے چہرے کو نہ دیکھ کر اس کی تشخیص نہ کریں تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

پانچویں آیت میں اس حالت میں شدت پیدا ہو جانے اور اس کے ایک اندرونی بیماری میں تبدیل ہونے کا تذکرہ اور شیطانی وسوسوں اور وہ بھی انبیاء اور مرسلین کی موجودگی میں ذکر کے بعد فرماتا ہے: ”یہ ماجرا اس لیے ہے تاکہ خداوند عالم شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے فتنہ قرار دے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔“

جی ہاں! یہ بیمار دل ہی تو ہیں، حقیقت کا لذیذ ذائقہ جن کے کام و دہن میں تلخ ہوتا ہے اور تلخی جن کے لیے شیرینی ہوتی ہے اور یہ سب شیطانی وسوسوں کی بدولت ہوتا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں ”فی قلوبھم مرض“ یا ”فی قلبه مرض“ کا جملہ ذکر ہوا ہے۔یہ تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید نے اس چیز کو کس قدر اہمیت دی ہے۔یہ بھی قابل غور بات ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیات غالب طور پر منافقین کے بارے ہی میں ہیں اور بارہ آیات میں سے کئی آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ منافقین کا نام لیا گیا ہے۔[1]

لیکن مذکورہ آیات میں سے بہت کم آیات میں یہ ”مرض“، ”سرکش شہوات اور ہوس آلود رجحانات“ کے معنی میں ہے، جیسا کہ سورہ احزاب کی ۳۲ ویں آیت ازواج پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے ”فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض“ ہوس

[1] انفال ۴۹، احزاب ۱۲، احزاب ۳۲

انگیز طریقے سے باتیں نہ کرو ورنہ جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے وہ طمع کریں گے۔

بہرحال ان آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ جسمانی بیماری کے علاوہ ایک اور بیماری بھی انسان کو عارض ہوتی ہے جو روحانی یا قلبی بیماری کہلاتی ہے اور بیماری کی یہ قسم کبھی تو ''نفاق'' کی وجہ سے اور کبھی ''سرکش نفسانی خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے؟ انسان کے روحانی ذائقہ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے جس طرح اکثر سمانی امراض کے مریضوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لذیذ اور شیریں غذاؤں سے متنفر ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات وہ نفرت انگیز غذاؤں کی خواہش کرتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے لوگ حقائق کے ادراک پر قادر نہیں ہوتے، اور صحیح اور سچے معارف سے اجنبی ہوتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس بات یہ ہے کہ وہ جس قدر بھی اس راہ پر گامزن ہوتے جاتے ہیں یہ مرض اس قدر شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ پہلے وہ شک کے مرحلے میں ہوتے ہیں، تو آہستہ آہستہ نوبت انکار تک پھر انکار سے استہزا اور حق کے ساتھ مخالفت کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ''فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا'' ان کے دلوں میں بیماری ہے اور خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ''ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون'' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (بقرہ ۱۰)

چھٹی آیت میں گوناگوں حجابوں اور پردوں کا ذکر ہے جو دلوں پر پڑتے ہیں، ایک نہیں کئی پردے۔ جیسا کہ فرماتا ہے ''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگینی قرار دی ہے۔''

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ''اکنہ'' کی تعبیر بہت زیادہ تعداد میں پردوں پر دلالت کرتی ہے۔[۱] اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے ظاہر کان بہرے نہیں ہیں بلکہ ان کے دل کے کان سنگین اور بہرے ہوتے ہیں اور حق کی باتیں نہیں سن سکتے۔ اسی طرح اس دل پر پردہ نہیں پڑتا جو بدن میں خون کی گردش کا وسیلہ ہوتا ہے بلکہ ان کی عقل اور روح پر پڑتا ہے۔

لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ممکن ہے کہ خداوند عالم کسی کے دل پر پردے ڈال دے اور کانوں کو بہرا کر دے تاکہ وہ نہ تو حق کو سن سکے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکے؟

بہت سے مفسرین اس سوال کے جواب میں اشکال کا شکار ہو گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعصب دشمنوں کی نگاہوں سے چھپ جایا کرتے تھے اور وہ آپؐ کی باتوں کو نہیں سن پاتے تھے تاکہ وہ اس طرح سے آنجنابؐ کے پروگراموں میں روڑے نہ اٹکائیں اور آپؐ کی اذیت سے باز رہیں۔

کبھی کہا کہ خداوند عالم اس قسم کے لوگوں سے اپنی مہربانیاں سلب کر لیتا تھا اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا تھا اور دلوں پر پردہ ڈالنے اور کانوں کو بہرہ کرنے کے معنی یہی ہیں۔

---

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۵، ص ۸۲

لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ اس آیت کے اور اس جیسی دوسری اور اس سے ملتی جلتی کئی اور آیات کے معنی کچھ اور ہیں۔ درحقیقت یہ ایک سزا ہے جو خداوند عالم نے متعصب، تنگدل، خودخواہ، مغرور اور گناہگار لوگوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ان کا حقیقت کے ادراک سے محروم ہو جانا ان کی منحوس صفات اور قبیح افعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے یہ خاصیت ان کے ان افعال میں ہی خلق فرمادی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے زہر قاتل میں خلق فرمائی ہے کہ جب کوئی انسان اسے جان بوجھ کر کھاتا ہے یا خود کو آگ میں ڈالتا ہے تو آگ اور زہر کے خالق کا قصور نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس شخص کو ہی ملامت کیا جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟

ساتویں آیت میں یہودی کی زبان سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ استہزاء کے طور پر پیغمبر اسلامؐ (یا دوسرے انبیاء) سے کہتے تھے ''تم تو جانتے ہو کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں اور ہم تمہاری کسی بات کو نہیں سمجھ سکتے۔'' قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "بل العنهم الله بكفرهم فقليلا ما يومنون" یعنی جی ہاں یہی بات ہے کہ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی خاطر ہی لعنت کی ہے اور اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس قسم کے لوگ حقیقت کا خوبصورت چہرہ کیونکر دیکھ سکتے ہیں!

ممکن ہے کہ ''غلاف'' کی تعبیر کا مفہوم "اکنه" (کئی پردے) کے مفہوم سے بالاتر ہو کیونکہ ''غلاف'' کسی چیز کو تمام اطراف سے ڈھانپ لیتا ہے، جبکہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ پردہ کسی چیز کی ایک طرف کو چھپائے اور دیکھنے سے مانع ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ معرفت سے روکنے والی چیز صرف ایک طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً صرف فطری مسائل یا عقلی مسائل کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمام جہات سے معرفت اور شناخت کے منابع پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تمام انسانی ادراکات ایک غلاف میں چھپ جاتے ہیں۔

اور بات بھی یہی ہے کہ انسان جس قدر گناہوں سے آلودہ اور فساد میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا قلب اور روح بھی حقائق کے مشاہدہ سے دور سے دور تر اور محروم سے محروم تر ہوتے جائیں گے۔

آٹھویں اور نویں آیت میں دلوں پر مہر لگانے کی بات ہو رہی ہے جو اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان حقائق اور واقعیات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے "فهم لا يسمعون" (وہ نہیں سنتے) اور نویں آیت میں فرماتا ہے: "فهم لا يفقهون" (وہ نہیں سمجھتے) اور چونکہ سننے سے مراد دل کے کانوں سے سننا ہوتا ہے، لہٰذا دونوں کے معنی ایک ہوتے ہیں۔

یہ نہایت ہی سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل پر پردہ پڑتا ہے، پھر دل غلاف میں لپٹ جاتا ہے اور آخر کار ہر قسم کے اثر و رسوخ کو روکنے اور دل میں کسی کے اثر کرنے سے بچاؤ کے لیے اس پر مہر لگا دی جاتی ہے، جیسا کہ قبل ازیں الفاظ کے معانی اور تشریح کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

البتہ وہ اس رسوا کن انجام سے بلاوجہ دوچار نہیں ہوتے بلکہ اس سے پہلے کی آیات کی رو سے یہ صراحت موجود ہے کہ منافقین کے اس گروہ کو جب جہاد کا حکم ملتا ہے تو وہ کہتے ہیں ''آپ ہمیں رہنے دیں تاکہ ہم قاعدین کے ساتھ رہیں۔'' کیونکہ قاعدین (جہاد نہ کرنے والے) جہاد سے ہوتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ ''وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ جہاد نہ کرنے والوں کے ساتھ رہیں'' اور جو شخص جہاد کی قدرت رکھنے کے

باوجود جہاد سے روگردانی کریں، بعید نہیں ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو۔

دوسری آیت میں فرماتا ہے: باوجودیکہ انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کی حالت کو دیکھ لیا ہوا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کیونکر عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے ہیں، پھر بھی وہ بیدار نہیں ہوتے، البتہ ایسے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک مقام پر (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے: ''ہم ان کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں۔'' اور دوسرے مقام پر (نویں آیت میں) فرماتا ہے۔''اس کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔'' جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کی اپنی بداعمالیوں اور برے کاموں کا نتیجہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں ''طبع'' سے مراد وہ نقش ہوتا ہے جو سکے پر بنایا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک بادوام، پائیدار اور باقی رہنے والا نقش ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھ نہیں مٹتا۔[1] ان کے دل کے سکوں نے بھی کفرونفاق اور گناہ کا نقش اپنا یا ہوا ہے جو اتنی جلدی سے تبدیل نہیں ہوگا۔

دسویں اور گیارھویں آیت میں ''ختم'' کی بات ہورہی ہے اور جیسا کہ الفاظ کے معانی کی بحث میں بیان ہو چکا ہے اس کے معنی کسی چیز کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ خطوط کو آخر میں مہر لگا دیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ مہر لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور مہر لگانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اس حد تک بند کر دیا جائے اور لاکھ لگا دی جائے کہ اسے کوئی شخص کھول نہ سکے۔ مندرجہ بالا آیات میں جو فرماتا ہے کہ ''خداوند عالم کچھ متعصب کفار کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دیتا ہے'' ''مہر'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان سے تشخیص کی حس کو مکمل طور پر اس طرح سے سلب کر لیتا ہے کہ وہ حق کو باطل سے اور نیک کو بد سے تشخیص نہیں دیتے۔ اسی لیے اس سے پہلی آیت میں فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ‏ ﴿۶﴾

(بقرہ ۶)

''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے ان کے لیے فرق نہیں ہے کہ ان کو خدائی عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔''

یقیناً یہ حکم تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ ان سے مراد وہ متعصب کفار ہیں جو حق کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے ہیں اور گناہ، ظلم اور فساد میں اس قدر آلودہ ہو چکے ہیں کہ ان کے دل مکمل طور پر تاریک اور ظلمانی ہو چکے ہیں، ورگرنہ پیغمبر کا کام ہی منحرفین اور کفار کو ڈرانا، بشارت دینا اور ہدایت کرنا ہی تو ہوتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں صرف دل پر مہر لگانے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ فرماتا ہے: ''آنکھیں اور کان بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔'' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عقلی ادراکات ہی بے کار نہیں ہو جائیں گے بلکہ جو وہ حس کے ذریعہ دیکھتے یا سنتے

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۹، ص ۳۳

ہیں، اس حد تک بے اثر ہو جائیں گے کہ گویا نہ تو انہوں نے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اکثر و بیشتر علوم انہی دو راستوں سے ہی حاصل ہوتے ہیں، حتی کہ انسانی وحی اور دعوت انبیاء کی حقانیت کو بھی ان دو راستوں سے پیدا کرتا ہے اور ان دونوں عظیم راستوں کے بیکار ہو جانے سے ہدایت اور نجات کے راستے ان کے لیے بالکل بند ہو جاتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جسے وہ خود چاہتے تھے، یعنی ایسی آگ ہے جسے انہوں نے خود ہی بھڑکایا ہے اور یہ ہرگز جبر کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ بعض بے خبر لوگ سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید کی جن بعض آیات میں ''طبع'' کا لفظ آیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ

''یہ وہ لوگ ہیں خدا نے جن کے ''قلب''، ''کان'' اور ''آنکھوں'' پر مہر لگا دی ہے اور وہی لوگ ہی حقیقی غافل ہیں۔'' (نحل ۱۰۸)

اس سے پہلے کی آیات بھی یہ بتاتی ہیں کہ یہ تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنا سینہ کفر کے لیے کھول دیا ہے اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (نحل ۱۰۶)

بارھویں آیت میں ان تالوں کی بات ہو رہی ہے جو دلوں پر ڈالے جاتے ہیں، ایسے تالے کہ بسا اوقات ان کی تاثیر مہروں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔[1] ارشاد فرماتا ہے ''آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟'' یعنی قرآنی آیات اس طرح ہیں کہ اگر انسان کی عقل یا دل کا تھوڑا سا راستہ بھی کھلا ہوا ہو تو اس میں نفوذ کر جاتی ہیں۔ قرآن کی منطق، قرآن کا دلچسپ اور شیریں بیان، قرآن کی عمیق و دقیق تحلیلیں اور قرآن کا وہ مخصوص نور اور روشنائی ہر اس دل پر اثر کرتے ہیں اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں جس میں آمادگی پائی جاتی ہے اور جو لوگ سنتے تو ہیں لیکن ان پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا، ان میں حق کی قبولیت کی قطعاً کوئی آمادگی نہیں ہوتی۔

''اقفال''، ''قفل'' کی جمع ہے۔ جو دراصل ''قفول'' کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ''لوٹ آنا'' اور چونکہ جب دروازے کو بند کرنے کے بعد اسے تالا لگا دیتے ہیں تو جو بھی وہاں آتا ہے وہ واپس پلٹ جاتا ہے، یہ لفظ معمولی تالے پر بولا جاتا ہے۔

''اقفال'' (جمع کے صیغہ کی صورت میں) کا استعمال شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ دل پر صرف ایک تالہ ہی نہیں پڑتا بلکہ بعض اوقات تو کئی تالے پے در پے اس پر ڈالے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کو کھولا جائے تو بقیہ تالوں کا وجود دل کے دروازوں کے کھلنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ چیز درک حقائق سے محرومی کا بالاترین مرحلہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ''قلوب'' کو ان کی طرف اضافت نہیں کی گئی بلکہ اسے ''نکوہ'' کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے دل، جو کسی کام کے نہ ہوں، گویا وہ ان کے دل نہیں ہیں اور پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ ''اقفال'' کو ''قلوب'' کی

---

[1] فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۲۸ ص ۶۶

طرف مضاف کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گویا اس طرح کے دل اسی قسم کے تالوں کے لائق ہوتے ہیں اور یہ تالے انہی کے لیے ہیں اور انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تیرھویں آیت میں ایک اور لرزا دینے والی تعبیر نظر آتی ہے۔آیت کہتی ہے:''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود دل نابینا ہوجاتے ہیں۔''یعنی اگر ظاہری آنکھیں اندھی ہوجائیں تو پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ بیدار عقل اس کے قائم مقام ہوسکتی ہے۔بدبختی اور بے چارگی تو اس دن ہوگی جب چشم دل نابینا ہوجائے اور یہی کوردلی حقیقت کے ادراک سے بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جسے انسان خود ہی اپنے ہاتھوں سے فراہم کرتا ہے، کیونکہ تجربہ گواہ ہے کہ اگر انسان ایک لمبے عرصے تک تاریکی میں رہے، یا آنکھیں کو مضبوطی سے باندھے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی حس بینائی کھودیتا ہے۔اس طرح جو لوگ اپنی چشم دل کو حقائق کے دیکھنے سے بند کردیتے ہیں اور ایک مدت مدید تک جہالت، خودخواہی، غرور اور گناہوں کے گڑھے میں پڑے رہتے ہیں، وہ دل کی بنائی کو کھو دیتے ہیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو دل سینے کے اندر ہے وہ روح اور عقل کے معنی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ تو گوشت کا وہی ٹکڑا ہے جو تمام اعضائے بدن تک خون پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔لیکن ایک نکتے پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ''صدر کا ایک معنی انسان کی ذات اور سرشت ہے۔بنابریں''**القلوب التی فی الصدور**''اس عقل و ادراک کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ''قلب''انسانی جسم کا سب سے پہلا عضو ہے جس میں تمام عاطفے، ادراکات اور جذبات و احساسات منعکس ہوتے ہیں۔ایک اہم فیصلہ، سخت غصے کی ایک حالت، قومی محبت اور دوستی کا ایک حساس فوراً دل کی دھڑکنوں کو دگرگوں کردیتا ہے اور اگر یہی ظاہری دل عقل سے کنایہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا روح اور جان کے ساتھ قریبی رابطہ ہوتا ہے۔[1]

زیر بحث سلسلے کی چودھویں اور آخری آیت میں معرفت سے محرومی کا مرحلہ اپنی انتہا کو جا پہنچتا ہے اور عقل و فطرت اور گوش و چشم مکمل طور پر بے کار ہوجاتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ انسان چوپایوں بلکہ ان سے بھی پست تر حد تک جا گرتا ہے۔

یہ آیت جہنمیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جو گویا جہنم ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:''ان کے لیے دل ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں، وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں'' یقیناً وہ اس کیفیت کے ساتھ اپنا انسانی طرۂ امتیاز کھوکر جانوروں کی صف میں داخل ہوچکے ہوتے ہیں۔لہٰذا آگے فرماتا ہے''وہ چوپایوں جیسے ہیں''اور چونکہ چوپائے انسانی استعداد سے محروم ہوتے ہیں، لیکن یہ گروہ اس چیز کے ہوتے ہوئے بھی اس انجام سے دوچار ہوتا ہے۔اسی لیے خدا فرماتا ہے''بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور حقیقی معنی میں غافل یہی لوگ ہیں۔''

اس طرح سے وہ اپنی''انسانی خاصیت''کو کھو چکے ہوتے ہیں اور واپسی کی راہیں بھی گم کرچکے ہوتے ہیں۔اوج سعادت سے بدبختی

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول، سورہ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر اور جلد ۱۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے گڑھوں اور ذلت ورسوائی کے کھڈوں میں جا گرتے ہیں۔ معارف کے تمام دروازے ان پر بند ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے اپنے اعمال ہی کے ذریعے اور اپنے ہی ہاتھوں سے جس کے اسباب فراہم کیے ہیں۔

آخری نتیجہ

مندرجہ بالا چودہ آیات کہ جن کے نمونے قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں اور ہم نے ان خصوصیات کے تحت ان آیات کو یہاں پر بحث کے لیے درج کیا ہے، جو ان میں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کرتی ہیں کہ انسانی معرفت کے ذرائع اور منابع، خصوصاً عقل وفطرت اور احساس، ممکن ہے کہ ایسی آفتوں کا شکار ہو جائیں جو بعض اوقات خفیف ہوتی ہیں اور بعض اوقات شدید ہوتی ہیں اور کبھی تو اس قدر غالب آ جاتی ہیں کہ انسان کو مکمل ظلمت اور تاریکی میں اس حد تک غرق کر دیتی ہیں کہ وہ واضح ترین حسی حقائق تک کو بھی درک نہیں کر سکتا۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ اس تدریجی انحراف کو اس کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک قرآنی آیات کے ساتھ بیان کریں۔ ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ اس کی طبعی ترتیب بھی وہی ہے جو مندرجہ بالا آیات کی ترتیب میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ آیات مندرجہ بالا آفات کے اثر ورسوخ اور نفوذ کو اس کے تمام مراحل میں بیان کر سکتی ہیں۔

اس بارے میں قرآن مجید کی تعبیریں کس قدر زیبا اور کیسی حساب شدہ ہیں، کبھی تو بیرونی عوامل مثلاً ''شیطانی تزئین'' کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں:

کبھی تو قلب وفکر کے انحراف کی باتیں ہوتی ہیں۔
کبھی زنگ کے مرحلہ تک بات جا پہنچتی ہے۔
کبھی یہ انحراف ایک بیماری اور مرض مزمن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
کبھی دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔
کبھی دل مکمل طور پر پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔
کبھی دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور مستقل نقش اس پر قائم کر دیا جاتا ہے۔
کبھی اسے بند کر کے لاکھ کے ذریعہ اس پر مہر لگا دی جاتی ہے۔
کبھی بات اس سے آگے چلی جاتی ہے اور آنکھ اور کان بھی پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔
کبھی دلوں پر پختہ تالے ڈال دیئے جاتے ہیں۔
کبھی مطلق نابینائی کی نوبت آ جاتی ہے۔

اور آخر کار اس سے انسانی خصوصیات چھین لی جاتی ہیں اور اسے حیوانوں اور چوپایوں کے مرحلہ تک لے جا کر پھر اسے اس سے بھی

پست درجے میں گرادیا جاتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس قسم کی گونا گوں بدبختیوں اور مختلف الانواع مصائب کا سبب کیا چیز ہے اور کیا چیز انہیں فراہم کرتی ہے، تو یہ بات آئندہ کی بحثوں کا موضوع ہے۔ یہاں پر تو صرف واضح طور پر یہ بیان کرنا تھا کہ معرفت کے یہ منابع کیونکر بے کار ہوجاتے ہیں، تاکہ ہم ان کے مختلف علل اور عوامل تک رسائی حاصل کرلیں۔

پھر اس بیماری کے علاج، ان پردوں کے ہٹانے اور اس زنگ کو دور کرنے اور اس مرحلہ تک پہنچنے کے سدباب کہ جس سے واپسی ناممکن ہوتی ہے کے راستے تلاش کیے جائیں۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان مبارک پر ختم کرتے ہیں کہ:

"ان لك قلبا و مسامع وان الله اذا اراد ان يهدى عبد الفتح مسامع قلبه واذا اراده غير ذالك ختم مسامع قلبه فلا يصلح ابدا، وهو قول الله عزوجل ام على قلوب اقفلها"

''تمہارے لیے ایک دل ہے اور کئی کان (تیرے دل تک پہنچانے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندہ کو (اس کے جہاد و تقویٰ کی بدولت) ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے، اس طرح کہ اس کی ہرگز اصلاح نہیں ہوسکتی اور یہ ہیں خداوند عزوجل کے اس قول کے معنی "ام على قلوب اقفلها"۔ [1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۵، ص ۴۱

معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

(تفصیل کے ساتھ)

اشارہ

گزشتہ بحث میں انسان پر شناخت کے دروازے اور معرفت کے راستوں کے بند ہونے کا اجمالی تذکرہ تھا۔لیکن اب اس دردناک چیز کے ''عوامل اور اسباب'' کی بات ہوگی۔ یہ ایسی دردناک چیز ہے جو انسان کو ایک چوپائے یا اس سے بھی کمتر درجے تک پست کر دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے امور ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان کے دل پر زنگ چڑھ جائے، اس کے دل کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، اس کی چشم دل اندھی ہو جاتی ہے۔اس کی عقل کا ترازو اپنا توازن کھو دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کو نہیں دیکھ سکتا یا اگر دیکھتا ہے تو الٹا؟

قرآن مجید میں اس اہم مسئلے کے بارے میں بہت سے مقامات پر گفتگو ہوئی ہے اور اس کے اصل عوامل کو بیان کیا گیا ہے۔ایک سادہ سی گروہ بندی میں اسے تین حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ روحانی اور اخلاقی صفات جو دل کی آنکھوں کا حجاب بن جاتی ہیں۔

۲۔ وہ اعمال اور کردار جو دل کے آئینہ کو تاریک کر دیتے ہیں۔

۳۔ وہ بیرونی عوامل جو انسان کی فکر، عقل، عواطف اور فطرت پر اثر اور ان پر پردے ڈالتے ہیں۔

ان تینوں عنوانات میں سے ہر ایک پر ہم جداگانہ تفصیلی نگاہ ڈالیں گے اور مفصل بحث کریں گے (ایک بار پھر تاکید کی جاتی ہے کہ ایسے امور کو بیان کیا جائے گا جو قرآنی آیات میں منعکس ہیں اور واضح طور پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

الف: وہ صفات جو معرفت سے مانع ہیں:

یہ ایسی صفات ہیں جو کہیں پر تو صریحی طور پر اور کہیں پر اشاروں اشاروں میں قرآنی آیات میں ان پر گفتگو کی گئی ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خواہش پرستی کا حجاب

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ
وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾
(جاثیہ ۲۳)

(۲) كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا
يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ
عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ (سورہ مائدہ ۷۱-۷۰)

(۳) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْۤا
اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ (سورہ محمد ۱۶)

ترجمہ

(۱) آیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنا معبود اپنی نفسانی خواہشات کو قرار دیا ہے اور خداوند عالم نے (یہ) جانتے ہوئے (کہ وہ شائستہ ہدایت نہیں) اسے گمراہ کیا ہے اور اس کے کان اور آنکھ پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر کون ہے کہ خدا کے علاوہ اسے ہدایت کرے؟ کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟

(۲) جب کوئی بھی پیغمبر ان کی خواہشات کے خلاف ان کے پاس آیا تو کچھ انبیاء کو تو وہ جھٹلاتے تھے اور کچھ کو وہ قتل کر دیتے تھے، اور گمان کرتے تھے کہ کوئی سزا نہیں ہوگی، لہٰذا وہ (حق کی بات سننے اور حقائق کو دیکھنے سے) اندھے اور بہرے ہو گئے۔ پھر (وہ بیدار ہو گئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ پھر وہ (خوابِ غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ) اندھے اور بہرے ہو گئے اور خداوند عالم ان کاموں سے آگاہ ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

(۳) ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو تمہاری باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں، لیکن جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو (ازروئے تمسخر) ان لوگوں سے کہتے ہیں جنہیں خداوند عالم نے علم و دانش عطا کی ہے کہ اس

شخص (پیغمبر) نے ابھی کیا کہا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی ہے۔ (لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے)۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

"ھوی" کے معنی ہیں نفس کا خواہشات کی طرف میلان اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل "ھوی" (بروزن نہی) بمعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ انسان پستی میں جا گرے اور دنیا میں کئی قسم کی مصیبتوں میں گرفتار ہو اور آخرت میں آتش جہنم میں جلتا رہے۔ جہنم کو "ہاویہ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی گہرائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد و حساب نہیں ہے۔

بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں "اوپر لے جانا" اور "اوپر سے نیچے کی طرف گرانا"۔ اور بعض نے ان دونوں معانی کو ملا کر بھی اس کے معنی کیے ہیں۔ یعنی پہلے اوپر لے جا کر نیچے گرانا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ھوی" (بروزن تہی) کے معنی سقوط (گرنا) اور ھوی (بروزن قوی) کے معنی اوپر جانا ہے۔[1]

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

۱۔ ھوی پرستی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے

سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی معبود کے بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ چونکہ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے اہل نہیں ہیں، لہٰذا انہیں گمراہ کر دیا ہے، ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شائستہ ہدایت نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے انبیاء اور مرسلین ان کی خواہشات نفسانی کے خلاف خدا کا کوئی حکم ان کے پاس لے جاتے تو وہ کچھ انبیاء کی تکذیب کرتے اور کچھ کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ حق کے مقابلہ میں یہ تعصب اور ڈھٹائی پھر طرہ یہ کہ خود کو عذاب الٰہی سے محفوظ بھی سمجھتے تھے۔ انجام کار یہ بات سبب ہوگئی کہ وہ حقائق کے سامنے اندھے اور گونگے بن جائیں۔ سب سے پہلے تو خدا نے انہیں اپنی رحمت میں شامل کر لیا اور ان کی توبہ قبول فرمالی لیکن پھر ان میں سے کچھ لوگوں نے خدا کے ساتھ کیا ہوا عہد و پیمان توڑ ڈالا، سرکشی کی راہیں اختیار کر لیں اور ایک بار پھر ان کے دل کے کان اور آنکھ بیکار

---

[1] ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل کتب: مفردات راغب، مجمع البحرین، کتاب العین، اقرب الموارد اور المنجد

ہو گئے۔

خواہشات نفسانی کی اتباع منحوس آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا خون تک بہا دیتے ہیں لیکن انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

"یقتلون" کو فعل "مضارع" کی صورت میں لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہودیوں کے اس ٹولے کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر اس نبی کو قتل کر دیتے تھے جو ان کی خواہشات نفسانی کی مخالفت کرتا تھا۔

تیسری آیت کچھ دل کے اندھے منافقین کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو سرکار رسالت آب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے، آپؐ کی باتیں بھی سنتے، لیکن جونہی آپؐ کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے تو سمجھدار مومنین کے سامنے حضورِ اکرمؐ کا مذاق اڑاتے اور استہزاء کرتے۔ قرآن کہتا ہے: "خداوند عالم نے اس گروہ کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کیونکہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں۔"

یہ اور اوپر کی دو آیتیں بخوبی واضح کر رہی ہیں کہ جب انسان خواہشات نفسانی کی پیروی کر لیتا ہے تو وہ قدرت کی تشخیص کھو دیتا ہے۔

خواہش پرستی، حقیقت کے ادراک سے کیوں مانع نہ ہو، جبکہ انسان کا کسی چیز سے حد سے زیادہ تعلق اس کے تمام وجود کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ صرف اس ہی چیز کو دیکھتا اور اس ہی کے بارے میں سوچتا ہے۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو کئی بار سنا ہے کہ "حبك الشيىء يعمى ويصيم"، یعنی تیرا کسی چیز کو محبوب رکھنا تجھے اندھا اور بہر کر دیتا ہے۔[1]

یہ نورانی فرمان پیغمبر اسلامؐ سے بھی اور امیر المومنینؑ سے بھی منقول ہے اور غالباً ہم میں سے اکثر لوگوں نے سنا ہے کہ "اما اتباع الهوىٰ فيصد عن الحق"، یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کو حق سے روک دیتی ہے۔[2]

یہ بات اس قدر واضح ہے کہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں "صاحب الحاجة اعمىٰ لا يرى الاحاجته" (ضرورت مند اندھا ہوتا ہے اور اپنی ضرورت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں دیکھتا)۔[3]

جو انسان اپنے دل و جان کو عہدے، منصب، جاہ و مال اور شہوت میں کھو چکا ہو بلکہ ہار چکا ہو اور اپنے تمام وجودی سرمائے کو ان کے حصول کے لیے وقف کر چکا ہو، وہ اس کے علاوہ کچھ اور دیکھ بھی نہیں سکتا اور یہ ہوس آلود عشق اس کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتا ہے۔

کیا خوبصورت فرمان ہے امیر المومنین علیہ السلام کا جو آپ نے اپنے ایک نورانی خطبے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "من عشق شيئا اعشى بصره"، یعنی جو شخص کسی چیز سے عشق کرتا ہے وہ اس کی آنکھوں کو کم نور بنا دیتی ہے۔"[4]

---

[1] روضۃ المتقین، جلد ۱۳، ص ۲۱

[2] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵ و نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۹

[4] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

سورہ جاثیہ کی ۲۳ویں آیت جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، کی شانِ نزول میں یوں منقول ہے:

''ایک رات کا قصہ ہے کہ ''ابوجہل''، ''ولید بن مغیرہ'' کے ساتھ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ (زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ خانہ کعبہ کا احترام کیا کرتے تھے اور طواف بجالایا کرتے تھے) اور طواف کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں چل نکلیں۔ ''ابوجہل'' نے ''ولید'' کی طرف منہ کرکے کہا "واللہ انی اعلم انہ لصادق" (خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ (محمدؐ) سچ کہتے ہیں)۔

ولید نے چیخ کر کہا: ''خاموش رہو! یہ باتیں کہاں سے کہہ رہے ہو؟''

ابوجہل نے کہا: ''ولید! ہم انہیں بچپن اور جوانی سے ہی صادق اور امین کہتے آرہے ہیں۔ اب جبکہ ان کی عقل کامل اور پختہ ہوچکی ہے انہیں جھوٹا اور خائن سمجھیں؟ میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میں انہیں سچا سمجھتا ہوں۔''

ولید نے (غصے میں آکر) کہا: ''تو پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟''

ابوجہل نے کہا: ''تم چاہتے ہو کہ قریش کی لڑکیاں بیٹھ کر یہ کہیں کہ میں ابوطالبؑ کے بھتیجے کے خوف سے ان کے سامنے جھک گیا ہوں؟ ''لات'' اور ''عزیٰ'' بتوں کی قسم! میں ان کی پیروی نہیں کروں گا۔''

اسی موقع پر "وختم علی سمعه و قلبه" (خدا نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی) کی آیت نازل ہوئی۔ [۱]

کیا پیارا فرمان ہے امیر المومنین علی علیہ السلام کا اس بارے میں کہ "آفة العقل الهوی" (انسانی عقل کی آفت ہوا پرستی اور خواہشات نفسانی کی اتباع ہے) اور دوسرے الفاظ میں آنجنابؑ نے یہ بھی فرمایا ہے "الهوی آفة الالباب" (خواہش پرستی عقلوں کی آفت ہے)۔ [۲]

۲۔ حب دنیا کا پردہ

اس بارے میں خدا فرماتا ہے:

آیات

(۱) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ۝ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَسَمۡعِهِمۡ

---

[۱] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

[۲] غرر الحکم

وَاَبۡصَارِهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ﴿۱۰۸﴾ (سورہ نحل ۱۰۷-۱۰۸)

ترجمہ

(۱) یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور خداوند عالم بے ایمان (اور متعصب) لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ وہ وہی لوگ ہیں، خدا نے (گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے) جن کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے۔ (اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے) اور صحیح معنوں میں وہ غافل لوگ ہیں۔

آیات کی تفسیر اوران کی جمع بندی

یہ آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کررہی ہے جنہوں نے پہلے تو دل وجان سے اسلام کو قبول کیا لیکن بعد میں مرتد ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے، ان کا یہ ارتداد اس لیے نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام میں حق کے خلاف کچھ دیکھا ہے۔ نہیں، بلکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسلام کو الوداع کہہ کر کفر کی وادی میں قدم رکھ لیا ہے اور چونکہ وہ ہدایت کے لائق نہیں ہیں لہٰذا خدا بھی انہیں ہدایت نہیں کرتا، بلکہ دنیا پرستی کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے اور معرفت کے دروازے ان پر بند کردیئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ غفلت کا شکار ہو گئے ہیں۔

دنیا کی محبت، خواہ مال وثروت کے ساتھ عشق کے سلسلے میں ہو، یا جاہ ومقام اور منزلت کے ساتھ عشق کے بارے میں، کئی دوسری شہوات کے ساتھ عشق کے متعلق ایسے طوفان کی مانند ہوتی ہے جو انسان کی جان کے اندر چلتا ہے اور ترازوئے عقل کے توازن کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرڈالتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دقیق ترین ترازوؤں کو ایسی پناہ گاہ میں محفوظ رکھتے ہیں جہاں معمولی سے معمولی ہوا کا گزر تک نہ ہوتا ہو، حتی کہ وزن کرتے وقت انسان کے منہ سے نکلنے والی سانس کو بھی عارضی طور پر سینوں میں بند کردیا جاتا ہے مبادا اس کے منہ سے نکلنے والی ہوا کی کوئی موج اس کے توازن پر اثر انداز ہو۔ تو ایسے ترازو کی اس قدر شدید طوفان کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہے؟

دنیا پرستی خواہ قارونی شکل میں ہو یا فرعونی، سامری یا کسی اور صورت میں، ہر حالت میں انسان کو صحیح وسالم فکر اور صحیح فیصلے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر مندرجہ بالا آیت میں فرماتا ہے کہ خدا نے ان کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے تو درحقیقت یہ وہی تاثیر ہے جو دنیا پرستی میں اس نے رکھی ہے، اور چونکہ وہ لوگ سبب کے پیچھے جاکر مسبب کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اسلامی روایات میں اس بارے میں بہت سی دلکش تعبیریں دیکھنے میں آتی ہیں، منجملہ ان کے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے۔ امام فرماتے ہیں:

"مثل الحريص على الدنيا كمثل دوره القز كلما ازدادت من القز على نفسها لفا كان ابعد لها من الخروج حتى تموت غما"

''دنیا کے حریص کی مثال ایسی ہے جیسے ریشم کے کیڑے کی ہوتی ہے۔ وہ یقینا جتنا ریشم اپنے اوپر لپیٹتا جاتا ہے اتنا ہی اس میں پھنستا چلا جاتا ہے اور وہاں سے اس کے نکلنے کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور آخرکار ایک دن اس رنج و غم میں مرجاتا ہے۔'' [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الدنيا تغر تضر تمر"

''دنیا فریب دیتی ہے، نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔'' [2]

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امیرؑ نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں آپؑ نے اسے نصیحت فرمائی۔ اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

"فارفض الدنيا فان حب الدنيا يعمى ويصم ويبكم ويذل الرقاب فتدارك ما بقي من عمرك ولا تقل غدا اوبعد غدفانما هلك من كان قبلك باقامتهم على الامانى والتسويف"

''دنیا کو چھوڑ دو کیونکہ دنیا کی محبت آنکھوں کو اندھا، کانوں کو بہرا اور زبان کو گونگا اور گردنوں کو جھکا دیتی ہے۔ اپنی باقی ماندہ عمر کے ذریعہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کرو اور یہ کہو کہ کل کروں گا یا پرسوں! کیونکہ تم سے پہلے کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی آرزوؤں پر بھروسہ کیے رکھا اور لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔'' [3]

---

[1] بحارالانوار، جلد ۷۰، ص ۲۳، حدیث ۱۳

[2] نہج البلاغہ

[3] بحارالانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵، اصول کافی جلد ۲ باب "دم الدنيا و الزهد فيها"، حدیث ۲۳

۳۔ تکبر، غرور اور قدرت کے نشے کا پردہ

ارشاد قدرت ہوتا ہے:

آیات

(۱) الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵

(سورہ غافر ۳۵)

(۲) وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۭ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝۴۴ (سورہ فصلت ۴۴)

ترجمہ

(۱) جولوگ آیات خداوندی میں مجادلہ کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آچکی ہو، یہ بے بنیاد جدال خدا اور ان لوگوں کے نزدیک جو ایمان لا چکے ہیں بہت بڑی ناراضگی کا موجب بن جاتا ہے۔ اس طرح خداوند عالم متکبر اور جبار دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

(۲) اگر ہم اسے عجمی قرآن بنا دیتے تو یقیناوہ کہتے کہ کیوں اس کی آیات واضح طور پر بیان نہیں ہوئیں؟ آیا عجمی قرآن اور عربی پیغمبر؟ (یہ کہاں تک درست ہے؟) آپ کہہ دیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے، گویا وہ اندھے ہیں اور اسے نہیں دیکھتے گویا وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں دور سے بلایا جاتا ہے۔‘‘

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

مغرور اور متکبر حق کو نہیں سمجھتے

بیدار دل مومن جو فرعون جیسے طاغوت کے دربار میں تھا اور ''مومن آل فرعون'' کے نام سے مشہور تھا اور مخفی طور پر حضرت موسیٰ بن عمران کی حمایت کرتا تھا، پہلی آیت اس کی گفتگو کے بعد مذکور ہوئی ہے، اور بڑی صراحت سے کہہ رہی ہے کہ ''جو لوگ خدائی آیات کے مقابلے میں غرور، تکبر، خودخواہی اور خود پسندی کی وجہ سے مجادلہ اور مقابلہ پر اتر آتے ہیں، ان کے دل تاریک ہیں اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، انہیں تکبر اور غرور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حق کو سمجھ سکیں، لہٰذا وہ واقعیات کے سمجھنے سے محروم ہیں۔

بارے حق کے مقابلے میں تکبر اور تعصب وعناد انسانی افکار پر ظلمانی پردے ڈال دیتے ہیں اور اس سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔ نوبت می رسد کہ اس کا دل ایک بند برتن کی مانند ہو جاتا ہے جس سے فاسد اور غلیظ مواد باہر نکل سکتا ہے اور نہ ہی صحیح وسالم اور جان پرور مواد اس کے اندر جا سکتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''متکبر'' اور ''جبار'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''تکبر'' ''حق کے سامنے خضوع'' کے مقابلے میں ہے اور ''جباریت'' ''مخلوق کے بارے میں محبت اور شفقت'' کے مقابلے میں ہے۔ یعنی مغرور ظالموں کی یہ کیفیت ہے کہ نہ تو وہ اپنے سے بالا دست ہستی کے سامنے خضوع وخشوع کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے زیردستوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں۔

دوسری آیت متعصب اور ہٹ دھرم متکبرین کے ایک گروہ کی گفتگو کو نقل کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: ''قرآن عجمی زبان میں کیوں نازل نہیں ہوا؟ تاکہ ہم اس کی مزید اہمیت کے قائل ہوتے اور غیر عرب قومیں بھی اس سے استفادہ کرتیں!'' (شاید انکا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مختلف گروہ اسے نہ سمجھیں اور بے خبر ہی رہیں)۔

قرآن نے ان کے اس اعتراض کا ان لفظوں میں جواب دیا ہے کہ ''اگر قرآن غیر عربی زبان میں نازل ہوتا تو وہ دوسرا اعتراض کرتے اور کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں؟ اس کے مضامین کیوں پیچیدہ ہیں؟ ہمیں اس کی سمجھ نہیں آتی اور یہ بھی کہتے کہ واقعاً عجیب ہے کہ قرآن عجمی ہے اور پیغمبر عربی ہیں۔''

پھر قرآن مجید پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ آپ ان حیلہ ساز اور بہانہ گیر مغروروں سے کہہ دیجیے: ''یہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے، اور جو لوگ حق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے ان کے کان اس کے سننے سے عاجز ہیں اور ان کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے محروم ہیں، بالکل ان لوگوں کی طرح جنہیں دور سے بلایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ لوگ نہ سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں۔

آفتاب قرآن بالکل واضح اور روشن ہے۔ اس کے سامنے کوئی پردہ نہیں ہے۔ یہ لوگ خود آپ نابینا اور اندھے ہیں۔ یہ کائنات زمزمہ حق سے معمور ہے لیکن یہ لوگ بہرے ہیں۔

۴۔احادیث کی رو سے غرور کے پردے

۱۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ما دخل قلب امری شیء من الکبر والا نقص من عقله مثل ما دخله من ذالك قل ذالك او کثر"

''کسی شخص کے دل میں جتنا تکبر داخل ہوگا اتنی مقدار اس کی عقل میں کمی واقع ہو جائے گی، خواہ کم ہو یا زیادہ۔'' [۱]

۲۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کلمات قصار میں سے ایک مختصر کلمہ میں ارشاد ہوتا ہے:
(اس میں آنجنابؑ نے گناہ گاروں اور منحرفین کے ایک گروہ سے مخاطب ہو کر فرمایا)

"بینکم و بین الموعظة حجاب من العزة"

''تمہارے اور وعظ و نصیحت کے درمیان غرور کا حجاب حائل ہے۔'' [۲]

جب انسان کے اندر حب ذات، ''خود محوری'' کی صورت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کو اپنے اندر ہی خلاصہ کی صورت میں موجود پائے۔

اور جب حب ذات ''خود برتری'' کی صورت میں داخل ہوتی ہے تو وہ خود کو سب سے ''برتر'' اور بڑھ کر'' سمجھتا ہے اور جس دن ''خود پسندی'' کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو خوبصورتی اور اعلیٰ اقدار کا معیار صرف اپنی ہی ذات کو سمجھتا ہے اور بس!!

ایسے حالات میں انسان کی عقل پر عجیب پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے اور حقیقت کے درمیان حجاب حائل ہو جاتا ہے اور وہ تمام اقدار کا اپنے اندر خلاصہ سمجھتا ہے اور اپنے سوا باقی تمام دنیا کو بھلا دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب نفس اور حقائق عالم کے ادراک کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ''کبر و غرور کی سواری'' سے نیچے اترے۔ اس کے بغیر محال ہے کہ انسان کو خدا کا قرب حاصل ہو اور اس کی مقدس ذات کا جلوہ اس کے دل پر پڑے۔

۳۔ اسی وجہ سے ہم حضرت امیرؑ کے کلام میں پڑھتے ہیں کہ:

"شوافات العقل الکبر"

---

[۱] بحار الانوار جلد ۷۵، ص ۱۸۶، باب وصایای امام باقرؑ، حدیث ۲۶
[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۲۸۲

”انسانی عقل کی بدترین آفت تکبر ہے۔“[1] اور

"العجب آفة"

”خود پسندی عقل کی آفت ہے۔“[2]

۵۔ جہالت اور غفلت کے پردے

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (سورہ روم ۵۹)

(۲) لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

(سورہ یس ۶، ۹، ۱۰)

ترجمہ

(۱) اسی طرح خداوند عالم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۲) تا کہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباء و اجداد کو نہیں ڈرایا گیا اسی لیے وہ غافل ہیں۔ ہم نے ان کے سامنے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے۔ لہٰذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور ان کے لیے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

---

[1] غرر الحکم

[2] غرر الحکم

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زیر بحث آیات کے سلسلہ کی پہلی آیت میں اس بات کی تاکید کے بعد کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں اور حقائق کو مختلف لباسوں میں لوگوں کے لیے بیان کیا ہے، کبھی تو آفاق وانفس کے حوالے سے، کبھی وعدہ وعید کی صورت میں، کہیں پر امر ونہی کے انداز میں، کسی مقام پر بشارت اور انذار کے ذریعہ، کبھی فطری اور عاطفی ہونے کے ناطے سے اور کسی جگہ پر استدلالی انداز میں۔

لیکن کچھ لوگ اس قدر جاہل اور غافل ہیں کہ ان کے سامنے جس قدر بھی آیات اور نشانیاں لے آؤ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ تم اہل باطل ہو۔

ارشاد ہوتا ہے" یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خداوند تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ادراک وتشخیص ان سے سلب کر لیتا ہے، جو علم نہیں رکھتے اور اپنی جہالت پر مصر ہیں اور اس بات کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ غیر جانبدار ہو کر حق کو تلاش کریں۔"

درحقیقت یہ آیت جہالت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کر رہی ہے جسے اصطلاح میں "جہل مرکب" کہتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے جاہل ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھتا ہے اور اگر کوئی شخص اسے اس کی جہالت سے بیدار کرنا بھی چاہے تو اس کے کان اس بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی لیے اس قسم کا شخص اپنے جہل مرکب میں ابدالدہر تک باقی رہتا ہے۔

اگر مخالف "جاہل بسیط" ہو، یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ جاہل ہے اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہوتا ہے تو ایسے شخص کی ہدایت بہت آسان ہوتی ہے۔

جب دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور مہریں لگ جاتی ہیں تو جہالت مرکب صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عدم تسلیم کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر کسی عرب کا ایک شعر بعض تفسیروں میں نقل کیا گیا ہے:

قال　حمار　الحکیم　یوما
لوالصفونی　لکنت　ارکب
لاننی　جاهل　بسیط
وصاحبی　جاهل　مرکب

"ایک دن اس (مغرور ومتکبر) دانشور کے گدھے نے کہا: اگر میرے حق میں انصاف کریں تو مجھے ہی سوار ہونا چاہیے، کیونکہ میں جاہل بسیط ہوں اور میرا مالک جاہل مرکب ہے۔"[1]

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۱، ص ۵۵، اسی آیت کے ذیل میں

ان آیات کی دوسری قسم غافلوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جن کی جہالت، غفلت اور ہٹ دھرمی کی بدولت ان کے بارے میں عذاب الٰہی کا فرمان صادر ہو چکا ہے اور وہ قابل ہدایت نہیں ہیں۔

پھر قرآن مجید نے ان حجابوں کا عجیب نقشہ کھینچا ہے جو ان کی عقول کا احاطہ کر چکے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق وزنجیر ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے سامنے بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، لہٰذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔''

ان کے آگے اور پیچھے بند باندھنے سے ان حجابوں کی طرف اشارہ ہے جو انہیں ''آفاقی آیات'' اور کائنات عالم میں خدائی آثار کو دیکھنے سے روکتے ہیں۔

اور گردنوں میں طوق اور زنجیر ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ''انفسی آیات'' اور اپنے وجود میں خدائی نشانیوں کے دیکھنے سے محروم ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑ چکے ہیں، جہل و غرور اور غفلت کے پردے۔

ظاہری بات ہے کہ ان پردوں کے ہوتے ہوئے، خواہ انہی کوئی ڈرائے یا نہ ڈرائے، چاہے وہ قرآنی آیات کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک لبوں سے سنیں یا نہ سنیں، وہ کبھی ہدایت حاصل نہیں کر پائیں گے۔ وہ ایک زنجیر میں نہیں بلکہ کئی زنجیروں اور کئی زندانوں میں مقید ہیں۔ (یاد رہے کہ ''اغلال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''غل'' کی جمع ہے)۔

بعض مفسرین ''سامنے کے بند'' سے ان موانع اور رکاوٹوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ''نظری یا استدلالی ہدایت'' سے محروم کر دیتی ہیں، اور ''پیچھے کے بند'' سے ان رکاوٹوں اور موانع کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ''فطری ہدایت'' کی طرف لوٹ آنے سے روکتے ہیں۔[1]

احادیث اور جہالت کے پردے

۱۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں، جو آپ نے جاہل کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے:

''الجاهل ميت بين الاحياء''

''جاہل، زندہ لوگوں کے درمیان ایک مردہ ہے۔''[2]

۲۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶، ص ۴۵

[2] غرر الحکم، ص ۹۹

"الحمق من ثمار الجهل"

''حماقت، جہالت کا ثمرہ ہے۔''[1]

ظاہر ہے جس طرح مردہ کسی چیز کا ادراک اور احساس نہیں رکھتا، ہٹ دھرم، بے خبر اور متعصب جاہل سے بھی حقیقی فہم کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ جاہل مرکب اور ہٹ دھرم و متعصب افراد کی حالت تو یہ ہے کہ وہ حقیقی علماء تک کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ خود کو ہی گمراہ نہیں سمجھتے، انہیں بھی گمراہ جانتے ہیں۔ لہٰذا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"تعجب الجاهل من العاقل اكثر من تعجب العاقل من الجاهل"

''اتنا عقلمند شخص کو جاہل سے تعجب نہیں ہوتا جتنا جاہل کو عاقل سے ہوتا ہے۔''[2]

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امیر المومنینؑ کے اس فرمانِ ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"ان قلوب الجهال تستفزها الاطماع و ترتهنها المنى وتستعلقها الخدائع"

''جاہل افراد کے دلوں کو لالچ ہی حرکت میں لاتی ہے، آرزوئیں انہیں اپنا مرہون بنا لیتی ہیں اور دھوکہ بازی اور فریب کاری انہیں اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔''[3]

اور تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر اس قسم کا دل درک حقیقی سے خالی ہو۔

۶۔ نفاق کے پردے

ارشاد رب العزت ہے:

آیات

(۱) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

---

[1] غرر الحکم، ص ۹۹

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۹۹

[3] کافی جلد ۱، ص ۲۳ (کتاب العقل والجہل، حدیث ۱۸)

يَشۡعُرُوۡنَ ؕ﴿۹﴾ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ
اَلِيۡمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾ (سورہ بقرہ ۱۰-۹)

(۲) مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ
بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا
يَرۡجِعُوۡنَ ۙ﴿۱۸﴾ (سورہ بقرہ ۱۸-۱۷)

(۳) اِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيۡنُهُمۡ ؕ وَمَنۡ
يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۴۹﴾ (سورہ انفال ۴۹)

(۴) وَاِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ
اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲﴾ (سورہ احزاب ۱۲)

ترجمہ

(۱) وہ خدا اور مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، (لیکن اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے، (البتہ) وہ سمجھتے نہیں۔ ان کے دل میں ایک طرح کی بیماری ہے، خدا ان کی بیماری کو اور بڑھاتا ہے اور یہ جو جھوٹ بولتے ہیں اس کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

(۲) وہ (منافقین) ایسے شخص کی مانند ہیں جس نے آگ جلائی (تاکہ تاریک بیابان میں اپنی راہ تلاش کرے) لیکن جب آگ نے اپنے چاروں اطراف کو روشن کیا تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج دیا جس نے اسے بجھا دیا اور) ایسی وحشت ناک تاریکی میں اسے چھوڑ دیا جہاں آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں اور غلط رستوں سے لوٹ کر واپس نہیں آتے۔

(۳) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے کہتے تھے: ان (مسلمانوں) کو اپنے دین نے مغرور بنا دیا ہے اور جو شخص خدا پر توکل کرے (وہ کامیاب ہو جاتا ہے کیونکہ) خدا عزیز اور حکیم ہے۔

(۴) (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے، کہتے تھے: خدا اور اس کے

رسول نے ہمارے ساتھ سوائے جھوٹے وعدے کے اور کچھ نہیں دیا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

دل کے اندھے منافقین

سورۂ بقرہ کے اوائل میں تیرہ آیات ایسی ہیں جو منافقین کے بارے میں بحث کرتی ہیں اور نہایت ہی گویا حالت میں نفاق اور منافقین کی صحیح صحیح تصویر کشی کرتی ہیں۔ زیر بحث موضوع کی پہلی آیت میں بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ خدا اور اسی طرح مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، جبکہ وہ صرف اور صرف خود کو ہی فریب دیتے ہیں، لیکن وہ یہ چیز سمجھتے نہیں، کیونکہ روح نفاق نے ان کے فہم و ادراک پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ پھر فرماتا ہے ''ان کے دل میں ایک قسم کی بیماری ہے'' اور ان کے اس راہ کے طے کرنے کے اصرار کی وجہ سے خدا ان کی بیماری میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

یقیناً اس بیماری سے مراد وہی ''نفاق کی بیماری'' ہے جو ان کے دل پر مسلط کر دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک بیمار شخص کی نہ تو فکر خوب فیصلہ کر سکتی ہے (کیونکہ عقل سالم، بدن سالم ہی میں پیدا ہوتی ہے) اور نہ ہی ان کے ظاہری حواس۔ یہی وجہ ہے اکثر اوقات بیمار لوگوں کے ذائقہ میں تلخی اور بدمزگی ہوتی ہیں اور بسا اوقات بدمزہ غذائیں ان کے لیے لذیذ ہوتی ہیں۔

دوسری آیت منافقین کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے ''جو ایک تاریک اور ظلمانی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھر جاتا ہے اور راہ پیدا کرنے کے لیے آگ جلاتا ہے تاکہ اپنی اطراف کو تھوڑا سا دیکھ لے اور پھر قدم اٹھائے لیکن اچانک طوفان اور آندھی اس کے چاروں اطراف کو گھیر لیتی ہے اور اسی مختصر سی آگ کو بجھا کر رکھ دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اسی طرح ان منافقین کی کیفیت ہے جو نہ تو کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سن پاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کی زبان تک گنگ ہو جاتی ہے اور وہ واپسی کا راستہ تک کھو بیٹھے ہیں۔

اس نور سے مراد شاید وہ ظاہری ایمان ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں اپنے اطراف کو تھوڑا سا روشن کرتے ہیں اور ان کی جان و مال اسلام کی پناہ میں محفوظ رہتے ہیں۔

یا یہ کہ روشنائی سے مراد فطرت کا نور ہے جو آغازِ فطرت میں ہر ایک کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ منافقین بھی آغاز میں اسی نور سے مختصر سی بہرہ اندوزی کرتے ہیں، لیکن زیادہ دیر نہیں گزر پاتی کہ نفاق کے جھکڑ اس کو مٹی کے ڈھیر میں چھپا دیتے ہیں، یا اسے بالکل ہی بجھا دیتے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں پھر بیمار دل منافقین کی بات ہو رہی ہے۔ گزشتہ آیات کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "والذین فی

قلوبھم مرض“ کی تعبیر ”عطف تفسیری“ کے طور پر ہے اور بیمار دل وہی منافق لوگ ہیں اور منافقین وہی بیمار دل ہے۔[۱] البتہ تیسری آیت جنگ بدر میں ان منافقین کی قلبی نوعیت کو اور چوتھی آیت جنگ احزاب (جنگ خندق) میں ان کی دلی کیفیت کو بیان کر رہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جنگ بدر میں منافین شرک کے لشکر میں اسلام کے خلاف صف آراء تھے اور جنگ احزاب (خندق) میں مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے۔

وہ کہتے تھے یہ (مسلمان) اپنے دین پر مغرور ہو گئے ہیں اور اس مختصر سی تعداد اور تھوڑے سے اسلحہ کے ساتھ کامیابی کے گمان سے یا شہادت کے خیال سے، اس خطرناک میدان میں اتر پڑے ہیں جس کا انجام موت ہے۔“

البتہ وہ لوگ قلبی بیماری کی وجہ سے صحیح ادراک سے قاصر تھے اور فتح وکامرانی کے حقیقی عوامل، یعنی ایمان واستقامت اور جوانمردی، جو ایمان کی پیداوار ہیں، کونہیں پہچانتے تھے اور یہ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جو خدا پر توکل کرتا ہے خدا اس کا یار ومددگار ہوتا ہے۔

ہماری اس بات کا گواہ وہ تاریخی واقعہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بعض مسلمان اسلام قبول کرنے کے بعد اسی طرح مکہ ہی میں رہ گئے اور ہجرت نہیں کی اور اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ جب قریش کے لشکر میدانِ بدر کی طرف حرکت کرنے لگے تو وہ ان کی صفوں میں جا پہنچے اور آپس میں کہنے لگے ”ہم میدانِ جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر تعداد میں زیادہ ہوا تو اس سے جا ملیں گے، اگر وہ اقلیت میں ہوا اور لشکر قریش اکثریت میں تو انہی میں رہ جائیں گے۔“[۲]

تو کیا اس سے بڑھ کر منافقت کسی اور چیز کا نام ہے؟ اگر یہ لوگ منافق نہیں تو پھر کون منافق ہے؟

جنگ احزاب (خندق) کے موقعہ پر اسلام کی تقویت حاصل ہو چکی تھی اور یہی منافق ٹولہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس آیا تھا۔ لیکن جب لشکر احزاب نے مدینہ کا سخت محاصرہ کر لیا اور منافقین نے ان کے ٹڈی دل لشکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، تو وہ سخت متزلزل ہو گئے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا ”خدا اور اس کے رسول نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔“ یہ وہی نفاق کا حجاب تھا جو انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دے رہا تھا، حالانکہ وہ بارہا آزما چکے تھے کہ عددی قوت پر کامیابی کا دارومدار نہیں ہے، مگر وہ ایمان اور ایمانی استقامت کے سائے میں ہے۔

---

[۱] تفسیر المیزان جلد ۱۶، ص ۳۰۲۔ اسی طرح تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ میں ہے کہ ”الذین فی قلوبھم مرض“ سے مراد ضعیف الایمان افراد ہیں جو منافقین کے علاوہ ہیں۔ حالانکہ ضعیف الایمان ہونے کا دل کی بیماری سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سورۂ بقرہ کے اوائل کی پہلی تیرہ آیات ہیں جن میں منافقین کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ یہ تعبیر انہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہے اور بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ ”بیماری“ کی تفسیر ”شک اور تردد“ سے کریں۔ یہ بھی کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی کیونکہ بیماری ایک قسم کا انحراف ہے اور شک ایک طرح کی گمشدگی اور ضیاع ہے۔

[۲] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ (سورۂ انفال کی ۴۹ ویں آیت کے ذیل میں)۔

سوال

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت کے ادراک کے لیے نفاق کیونکر حجاب ہوسکتا ہے؟

جواب

ایک نکتے کی طرف توجہ کے ساتھ ہی اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ روح نفاق اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان ہر گروہ اور ٹولے سے ہم صدا ہوجائے، ہر ماحول میں اسی ماحول کے ساتھ رنگ جائے اور ہر رخ کی ہوا کے ساتھ چلنے لگ جائے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور اپنے روحانی اور فکری استقلال سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان حالات میں انسان صحیح فیصلے کی قدرت سے عاری ہوجاتا ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ اس قسم کے مقامات پر ''بیماری قلب'' کی تعبیر اس لیے ہے کہ قلب (عقل) کا مخصوص اثر معرفت خدا اور اس کے عبودیت ہے اور جب انسان کے دل میں ایسی صفات پیدا ہوجائیں جو اس آثار سے مانع ہوجائیں تو اس وقت دل کی بیماری شمار ہونے لگتی ہے۔ (کیونکہ ان صفات نے اسے اپنے مخصوص اثر سے روک لیا ہے اور اس کے آگے حجاب بن گئی ہیں)۔[1]

اسی لیے سورہ میں آیا ہے کہ فرماتا ہے: "ولکن المنافقین لا یفقھون" لیکن منافقین واقعیت کو درک نہیں کرتے۔ (منافقون ۷)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان القلوب اربعہ: "قلب فیہ نفاق و ایمان و قلب منکوس و قلب مطبوع و قلب ازھر اجرد" قلب "ما الازھر" قال فیہ کھیئۃ السراج"

"فاما المطبوع فقلت المنافق، واما الازھر فقلت المومن، ان اعطاہ شکر وان ابتلاہ صبر و اما المنکوس فقلت المشرک"

''یعنی دل چار قسموں پر ہیں: ایک دل وہ ہوتا ہے جس میں نفاق اور ایمان ہوتا ہے، ایک دل الٹا ہوتا ہے، ایک دل پر مہر لگی ہوتی ہے اور ایک دل نورانی اور پاک ہوتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا قلب نورانی کیا ہے؟ تو فرمایا جس میں چراغ کی مانند حقیقت چمکتی ہے۔ رہا وہ دل جس پر مہر لگی ہوتی ہے وہ منافق کا دل ہے۔ نورانی قلب مومن کا ہوتا ہے۔ اگر خدا اسے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ شکر بجالاتا ہے

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۶۴ (سورہ بقرہ کی دسویں آیت کے ذیل میں)۔

اور اگر کوئی مصیبت اس پر آ ٹوٹتی ہے تو وہ صبر کرتا اور شکیبائی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ دل جو الٹا ہوتا ہے وہ مشرک کا دل ہے۔"[1]

ہم اس گفتگو کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فرمان ذیشان پر خاتمہ دیتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"والنفاق علی اربع دعائم: علی الھوی و الھوینا و الحفیظة والطمع"

"نفاق کا سرچشمہ ان چار چیزوں میں سے ایک ہے: خواہشات پرستی، دینی امور میں سستی اور غفلت، غضب اور طمع۔"[2]

اور ہم جانتے ہیں کہ مندرجہ بالا چار امور میں سے ہر ایک بجائے خود عقل انسانی کے سامنے ایک دبیز پردہ ہے۔

۷۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے

آیات

(۱) وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ‌ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا‌ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۲۵ (سورہ انعام ۲۵)

(۲) وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَيۡنَكَ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ۝۴۵ وَّجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا‌ ؕ وَاِذَا ذَكَرۡتَ رَبَّكَ فِى الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا ۝۴۶

(سورہ بنی اسرائیل ۴۵-۴۶)

(۳) فَاِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ۝۵۲ وَمَاۤ

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۴۴۲، "فی ظلمة قلب المنافق"

[2] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۳۹۳، "فی ظلمة قلب المنافق"

اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ (سورہ روم ۵۳-۵۲)

(۴) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (سورہ روم ۶۹-۵۸)

(۵) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾ (سورہ فصلت ۵)

ترجمہ

(۱) ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگا کر بات سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، تاکہ وہ اسے نہ سمجھ پائیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن قرار دے دیا ہے (وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر حق کی تمام نشانیوں کو بھی دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں، حتیٰ کہ جب وہ تیری طرف آتے ہیں تو بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(۲) اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان مخفی حجاب قرار دے دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگینی اور بہرہ پن ہے اور جب تو اپنے رب کی وحدانیت کا قرآن میں ذکر کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور تجھ سے روگردان ہو جاتے ہیں۔

(۳) تو اپنی آواز کو مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی بہرے لوگوں کے کانوں میں جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں اور نابیناؤں کو (بھی) ان کی گمراہی سے ہدایت نہیں کر سکتا۔ تو تو فقط اپنی باتوں کو ان لوگوں تک پہنچاتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

(۴) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں اور مطالب بیان کیے ہیں اور اگر کوئی آیت ان کے لیے آئے تو کافر کہتے ہیں کہ تم تو اہل باطل ہو (اور یہ سب سحر اور جادو ہے) اسی طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۵) انہوں نے کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تمہارے

درمیان حجاب ہے۔ لہٰذا تم اپنا عمل کرو اور ہم اپنا عمل کرتے ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

چلتے پھرتے مردے

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ قریش کے سرداروں میں سے ابوجہل، ولد بن مغیرہ اور ابوسفیان وغیرہ جیسے کچھ لوگ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؑ کی باتیں سننے لگے۔ ان میں نضر بن کنانہ بھی تھا، جو ایک تاجر آدمی تھا اور تجارت کی غرض سے کئی بار ایران جا چکا تھا اور ایرانیوں کی قدیم کہانیوں سے کافی حد تک مطلع تھا۔ ان سب نے اس کی طرف رخ کر کے کہا: ''محمد (ص) کیا کہتے ہیں؟'' اس نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں کہ کیا کہتے ہیں، پس اتنا معلوم ہے کہ اپنے لبوں کو ہلاتے ہیں اور پرانے زمانے کے وہی قصے کہانیاں جو میں تمہیں سناتا ہوں، وہ بھی وہی کچھ سناتے ہیں۔''

پھر ابوسفیان نے کہا: ''میں ان کی بعض باتیں صحیح نہیں سمجھتا۔'' ابوجہل نے کہا ''بالکل ایسا ہی ہے!'' اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی [1] اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ''ان ہٹ دھرم، متعصب اور خودخواہ لوگوں کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے کان بہرے ہیں اور ان کی عقل حقیقت کو درک کرنے کے قابل نہیں ہے۔'' لہٰذا وہ آپؑ کے ساتھ مسلسل لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہیں، ہٹ دھرمی، خود خواہی اور غرور کے بول بوتے پر۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ حق کے بارے میں ان کا کفر وعداوت پر اصرار اور ہٹ دھرمی بذاتِ خود اس پردے کی مانند ہے جو ایمان سے مانع ہوتا ہے۔'' [2]

دوسری آیت میں اس پردے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ کفار کے درمیان پڑا ہوا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد واقعی پردہ ہے جو آنحضرتؑ اور ان لوگوں کے درمیان اس طور سے ایجاد ہو جاتا تھا کہ وہ آپؑ کو نہیں دیکھ پاتے تھے۔ لیکن اگر ان آیات پر توجہ دی جائے جو اسی سورہ میں اور اسی موضوع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حجاب اور پردہ ''ہٹ دھرمی، تعصب، غرور، جہالت اور نادانی'' کے پردوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو قرآنی حقائق کو ان کے فکر و عقل کی نگاہوں سے چھپا دیتے تھے اور انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۶

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۷

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ ہم انہی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ”جب تو اپنے پروردگار کی وحدانیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ اسے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔“ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے تو آنحضرتؐ کی باتوں کو سنتے تھے لیکن جب ہٹ دھرمی ان کے آڑے آجاتی تھی تو وہ پا بہ فرار ہو جاتے تھے۔(ولوا علی ادبارھم نفورا)۔

اسی سورہ میں اور انہی آیات کے تسلسل میں کچھ اور تعبیریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو سب کی سب ان کی لجاجت (ہٹ دھرمی) اور عناد پر دلالت کرتی ہیں، تو کیا ایسی حالت میں ممکن ہے کہ کوئی شخص حقیقت کو درک کر سکے؟

تیسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ”تمہاری باتیں نہ تو مردوں تک پہنچتی ہیں، اسی طرح نہ ان بہروں تک پہنچتی ہیں جب وہ فرار کرتے ہیں، اور اندھوں کو بھی تم گمراہی سے نجات نہیں دلا سکتے۔ تمہاری باتوں کو صرف وہی کان ہی سن سکتے ہیں جو حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں“ (یعنی ان کے دل و جان حق کے پیاسے ہیں۔ یہ دل ایسی زمین کی مانند مستعد اور آمادہ ہیں جو سورج کی دھوپ اور بارش کے قطرات کے سامنے موجود ہوتی ہے اور معرفت کا بیج جس میں بہت جلد نشوونما پاتا ہے۔ لیکن جن دلوں پر تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی کے پردے پڑے ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے محروم ہوتے ہیں۔[1]

ان آیات کے چوتھے حصے میں بھی ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو سختی کے ساتھ پیغمبرؐ کے مقابلہ پر کمر بستہ تھے اور جو کچھ آنحضرتؐ سے سنتے تھے اس کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے: ”تم تو صرف اہل باطل ہو اور یہ سب سحر و جادو اور گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جن میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔“

قرآن کہتا ہے کہ ان جاہلوں کے دل پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی لیے اس آسمانی کتاب، جو حقائق کا منبع ہے، سے انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہ آیت ضمنی طور پر ”جہالت“ اور ”لجاجت“ کے رابطے کو واضح کرتی ہے۔

اس سلسلے کی پانچویں اور آخری آیت میں مخالفین کی لجاجت اور ہٹ دھرمی کا نمونہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب تک جو کچھ بتایا گیا تھا وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ بات چیت تھی۔ لیکن اس آیت میں خود انہی کی طرف سے اعتراف جرم کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”ہمارے دل غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں، ہمارے کان سنگین ہو چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہیں۔ ہم کبھی آپ کی باتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔“

اس قسم کی تعبیروں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے حجابوں، پردوں اور کانوں کی سنگینی کا اصلی عامل کیا تھا؟ یہ ایسی تعبیرات ہیں جن سے ”تعصب“ اور ”لجاجت“ ٹپکتے ہیں اور ان کی بدبختی کے سرچشمے اور منبع کو واضح کرتے ہیں۔

ضمنی طور پر ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ”تعصب“، ”عصب“ کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی وہ چربی ہے جو عضلات کو آپس

---

[1] اس سے ملتی جلتی آیت البتہ قدرے تفاوت کے ساتھ سورہ نمل آیت ۸۱ میں آئی ہے۔

میں یا انہیں ہڈیوں سے متصل کرتی ہے اور ان تک مغز کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی ساخت نہایت محکم اور پختہ ہوتی ہے لہٰذا یہ لفظ شدت اور استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ''یوم عصیب'' کا معنی سخت اور شدید ہے۔ اسی بنا پر کسی چیز کے ساتھ سخت وابستگی کی حالت پر ''تعصب'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ''عصبۃ'' (بروزن اسوہ) (طاقتور) مردوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو دس لوگوں سے کم نہ ہوں اور ''عصبۃ'' (بروزن قصبہ) باپ کی طرف سے رشتہ داری کے معنی میں ہے۔ [۱]

''لجاجت''، ''لج'' کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ''کسی چیز کے بارے میں بے جا اصرار اور اس سے روگردانی نہ کرنا'' اور ''لجہ'' (بروزن حجہ) کا معنی ہے۔ ''سمندر کی لہروں کی حرکت'' یا ''رات کی تاریکی کی لہریں'' اور ''بحر لجی'' عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے سمندر'' کو کہتے ہیں۔ اور ''کلام میں تلجلج'' کا معنی ہے ''زبان میں لکنت'' یا ''کلام کا تکرار'' یا ''آوازوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔'' [۲]

نتیجہ کلام

درحقیقت ''تعصب'' اور ''لجاجت'' ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے وابستگی انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کے بارے میں اصرار کرے، اس پر زور دے اور اس کا غیر مشروط دفاع کرے۔

البتہ کبھی تعصب بمعنی امر حق سے وابستگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ عام طور پر باطل کے ساتھ وابستگی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

لجاجت اور تعصب کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن عام طور پر جہالت اور کوتاہ اندیشی اس کے ساتھ ضرور ہوتی ہے، کیونکہ ان کے حامل کی سوچ ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے اس نظریئے سے دستبردار ہو جائے تو وہ سب کچھ کھو دے گا، یا پھر اس کی شخصیت مجروح ہوگی۔

اور کبھی ان کا سرچشمہ تکبر اور خودخواہی ہوتا ہے یعنی وہ اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوتا کہ حق کے آگے سر تسلیم خم کرے اور کبھی دوسرے عوامل اور اسباب ہوتے ہیں۔

تعصب اور لجاجت، عقل انسانی کے آگے ضخیم پردے ڈال دیتے ہیں اور اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق اور واقعات کو دیکھے۔ یقیناً بہت سے ایسے افراد ہیں جو کسی قیمت پر بھی اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے عقیدے یا اپنی بات سے دستبردار ہو جائیں، خواہ ان کے لیے کتنے ہی وزنی دلائل پیش کیے جائیں یا بقولِ معروف اگر ان کے لیے ایک ہزار ایک دلائل پیش کیے جائیں کہ مرغے کے دو پاؤں ہیں پھر بھی وہ کہیں گے کہ نہیں ایک ہی ہے!! اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سورج کے سامنے لا کھڑا کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ سورج ہے! تو بھی وہ آنکھیں بند کر کے کہیں گے کہ نہیں، رات ہے۔

---

[۱] کتاب ''العین''، ''مفردات''، ''مجمع البحرین'' اور ''لسان العرب''۔

[۲] کتاب ''العین''، ''مفردات''، ''مجمع البحرین'' اور ''لسان العرب''۔

مندرجہ بالا آیات اس حقیقت کو بخوبی منعکس کررہی ہیں اور اس قسم کے افراد کو اندھا، بہرہ بلکہ بعض اوقات مردہ کہہ کر پکار رہی ہیں۔ اور یہ کبھی کہتی ہیں کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور وہ کسی محفوظ برتن میں بند کر دیئے گئے ہیں۔

اور روایات میں بھی اس چیز کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے، حتی کہ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ:

"اللجوج لا رای له"

''ہٹ دھرم افراد صائب الرائے نہیں ہوتے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"اللجاج یفسد الرای"

''ہٹ دھرمی، صحیح رائے کو خراب کردیتی ہے۔''[2]

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"لیس للجوج تدبیر"

''ہٹ دھرم بے تدبیر ہوتا ہے۔''[3]

اور آپؑ ہی نے نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۹۲ میں فرمایا ہے جس کا نام ''خطبہ قاصعہ'' ہے:

"فاللہ فی کبر الحمیة وفخر الجاهلیة، فانه ملاقح الشنان ومنافخ الشیطان، التی خدع بها الامم الماضیة والقرون الخالیة حتی اغلفوا فی حنادس جهالته ومهاوی ضلالته"

''تمہیں خدا کا واسطہ، زمانہ جاہلیت کے تکبر، نخوت، تعصب اور افتخار سے بچتے رہو، کیونکہ یہ بغض و کینہ کی پرورش گاہ اور شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ ہے، جس سے گذشتہ قومیں اور امتیں بہلائی پھسلائی گئیں، حتی کہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوب گئیں اور ہلاکت کے گڑھوں میں جا گریں۔''

اس گفتگو کو ہم امام اول کے اس کلام پاک کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو آپؑ نے مختلف شہروں کے لوگوں کے نام اپنے مبارک خط میں صفین کے ماجرا کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

---

[1] غررالحکم

[2] غررالحکم

[3] غررالحکم

"من لج و تمادی فھو الراکس الذی ران اللہ علی قلبہ و صارت دائرۃ السوء علی راسہ"

''جو شخص باطل کے کاموں میں ہٹ دھرمی کرے اور اپنی بات پر ڈٹا رہے وہ ایسا پیمان شکن ہے جس کے دل کو خدا نے زنگ آلود کر دیا ہے اور خود سر لوگوں کی حکومت اس کے سر پر سایہ فگن ہے۔'' [1]

البتہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حق پر اصرار اور ڈٹ جانا تعصب نہیں ہے اور اگر اسے تعصب کہیں بھی تو ''تعصب ممدوح'' ہوگا، جیسا کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے عصبیت یعنی تعصب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"العصبیۃ التی یأثم علیھا صاحبھا ان یری الرجل شرار قومہ خیرا من خیار قوم آخرین ولیس من العصبیۃ ان یحب الرجل قومہ ولکن من العصبیۃ ان یعین قومہ علی الظلم"

''یعنی وہ عصبیت، یعنی تعصب جس کی وجہ سے انسان گناہگار ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے بدکاروں کو دوسری قوموں کے نیک لوگوں سے بہتر سمجھے، لیکن یہ عصبیت نہیں ہے کہ انسان اپنی قوم کو دوست رکھے۔ عصبیت تو یہ ہے کہ اس کے ظلم میں اس کی اعانت کرے۔'' [2]

۸۔ اندھی تقلید کے پردے

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں سے سنیے۔

آیات

(۱) قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ (سورہ شعراء ۱۳۶ تا ۱۳۸)

(۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۸

[2] بحار الانوار، جلد ۷۳، ص ۲۸۸

وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

(سورہ مائدہ ۱۰۴)

(۳) وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ (سورہ اعراف ۲۸)

(۴) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

(سورہ لقمان ۲۱)

(۵) وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (سورہ زخرف ۲۳)

ترجمہ

(۱) اس (قوم عاد) نے کہا ہمارے لیے کوئی فرق کی بات نہیں ہے خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نہ کرے، یہ تو بالکل پہلے لوگوں کی عادتیں ہیں اور ہم ہرگز سزا نہیں پائیں گے۔

(۲) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اپنے پیغمبر کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے آباء کو جو کرتے ہوئے پایا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے، تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟

(۳) اور جب وہ برے کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبا (واجداد) کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ آپ کہہ دیں کہ خدا کبھی بھی برے کاموں کا حکم نہیں دیتا تو کیا خدا کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جو خدا نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے، آیا حتیٰ کہ اگر انہیں شیطان بھی جلنے والی آگ کے عذاب کی دعوت کرے (پھر بھی وہ اسی کی اتباع کریں گے؟)۔

(۵) اسی طرح آپؐ سے پہلے ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ مست و مغرور

دولت مندوں نے کہا: ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے اور انہی کے آثار کی اقتداء کریں گے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

اگر چہ مندرجہ بالا آیات میں ''تقلید'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کی جگہ گذشتہ لوگوں کے آثار کی ''اقتداء'' یا ''اھتداء'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یا پھر آباء واجداد کی اتباع وغیرہ کا ذکر ہے، لیکن پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ (تقلید) کا مفہوم بھی اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔

یہ لفظ "قلد" (بروزن قند) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی مفردات میں راغب کے بقول ''رسی باٹنا'' ہیں اور ''قلادہ'' کو اس لیے قلادہ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک بٹی ہوئی رسی ہوتی ہے جو کسی کے گلے میں ہوتی ہے۔ اور قرآن آیات میں ''قلائد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''قلادہ'' کی جمع ہے جس کا معنی ایام حج میں وہ جانور ہیں جن کی گردن میں کوئی چیز ڈال دی جاتی ہے تا کہ دوسرے جانوروں سے ان کی پہچان ہو جائے۔ (سورۂ مائدہ ۲)

دوسروں کی پیروی کو اسی لیے تقلید کہتے ہیں کہ کیونکہ ان کی باتوں کو وہ قلادہ کی مانند اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں یا ذمہ داری کو قلادہ کی مانند اس کے گلے میں ڈال دیتے ہیں جو کسی کی پیروی کرتا ہے۔

لیکن ''مقالید'' کا لفظ، بعض اہل لغات کے نزدیک ''مقلید'' یا ''مقلد'' (بروزن محنت) کی جمع ہے۔ (زمحشری کے بقول اس لفظ یعنی مقالید کا مفرد اپنی جنس سے نہیں ہے)۔

''مقلید'' اور ''اقلید'' دونوں ''کلید'' (چابی) کے معنی میں ہیں۔ حتیٰ کہ ''ابن منظور'' نے ''لسان العرب'' میں اور اس قسم کے دوسرے ارباب لغت نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس لفظ کو فارسی کلمہ ''کلید'' سے لیا گیا ہے اور عربی میں بھی اس (چابی کے) معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور ''مقالید'' (خزانوں) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ خزانوں کو تالا لگاتے ہیں اور چابی کے بغیر وہاں تک رسائی قطعاً ناممکن ہوتی ہے۔

اسی لیے ''مقالید'' کا ''تقلید'' اور ''قلادہ'' کے مادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [۱]

ہاں البتہ ایک احتمال ضرور ملتا ہے کہ دونوں ایک ہی مادہ کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ کلید یعنی چابی کو بہت سے لوگ دھاگے میں ڈال کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ [۲]

بہر حال دوسروں سے پیروی جس کا نام ''تقلید'' ہے کبھی تو قابل مذمت و نفرت ہوتی ہے اور کبھی ممدوح اور قابل تعریف۔ اس کی مزید

---

[۱] مفردات راغب، مجمع البحرین، لسان العرب، برہان قاطع اور دیگر کتب

[۲] بعض لوگ ''اقلید'' کو لغت ''یمن'' یا لغت ''روم'' سے جانتے ہیں۔ (مجمع البحرین و لسان العرب، مادہ ''قلد'')

تفصیل انشاءاللہ آگے بیان ہوگی۔ یہاں پر جس چیز کے بارے میں بحث کی جارہی ہے وہ مذموم قسم کی تقلید ہے جسے اندھی تقلید'' کہتے ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

دنیا کو تقلید نے برباد کردیا

مندرجہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں ''قوم عادؑ'' کی کچھ ان باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے سامنے بیان کیں۔ ان کے اس دلسوز اور مہربان نبی کا اسم گرامی حضرت ''ہودؑ'' علیہ السلام تھا۔ حضرت ہودؑ نے انہیں توحید، ظلم وستم اور تعیش کے ترک کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا ''ہمارے لیے یہ بات یکساں ہے خواہ آپ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں۔ ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ کام جو آپ دیکھ رہے ہیں، یعنی بت پرستی وغیرہ، یہ ہمارے بزرگوں کا شیوہ ہے اور ہم آپ کی باتوں کی وجہ سے اس سے دستبردار نہیں ہوں گے اور آپ کے خیال کے برعکس ہمیں خدا کی طرف سے بھی عذاب نہیں ہوگا۔

اس طرح سے انہوں نے پیغمبر خدا کی منطقی گفتگو کو اپنے لیے مکمل طور پر غیر موثر ہونے کا علی الاعلان اظہار کردیا، کیونکہ تقلید کا حجاب انہیں حقائق اور واقعات کے دیکھنے کے لیے مانع ہوا۔

دوسری آیت میں مشرکین عرب کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ جس چیز کو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور بتوں اور اپنے بارے میں بہت سے حلال جانوروں کو حرام قرار دینے کی بدعت سے دستبرداری اختیار کرلو، تو وہ کہتے تھے ''ہمارے بزرگوں کا طریقہ کار ہی ہمارے لیے کافی ہے ہمیں کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں، نہ قرآن کی اور نہ ہی غیر قرآن کی۔

لیکن قرآن نے انہیں اس خواب غفلت سے بیدار کرنے اور تقلید کے حجاب کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کہا ہے'' تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء واجداد کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟'' آیا جاہل اور گمراہ افراد کی غیر مشروط تقلید اور اتباع جائز ہے؟

تیسری آیت میں مشرکین عرب (یا کچھ شیطان صفت انسانوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب وہ کوئی برا عمل انجام دیتے ہیں اور کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، اگر ان سے اس کی دلیل طلب کی جائے، تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں کہ وہ یہ کہیں: ''یہ ہمارے آباؤ اجداد کی عادت اور ان کا طریقہ کار ہے' اور وہ صرف اسی بات پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں'' خدا نے بھی ہمیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔'' (واللہ امرنا بہا)۔

قرآن مجید فوراً اس تہمت کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے: ''خداوند عالم ہرگز برے کاموں کا حکم نہیں دیتا، تو کیوں تم ایسی باتوں کو اس کی طرف منسوب کرتے ہو جو تم خود نہیں جانتے؟''

اس آیت میں ''فحشاء'' (برے کاموں) سے مراد کیا ہے، اس بارے میں بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ کچھ عربوں کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان رائج تھی اور وہ یہ کہ اس دور میں تمام زن ومرد مادرزاد ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا

طواف کرتے تھے۔اس بارے میں ان کا گمان یہ تھا کہ جس لباس میں ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس میں خانہ خدا کا طواف کیا جائے۔

اس طرح سے وہ اس قبیح اور بدترین فعل کا ارتکاب اس اندھی تقلید کی بناء پر کرتے چلے آرہے تھے جو انہیں نسل درنسل ورثے میں ملی تھی اور تقلید کا حجاب انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس عمل کی برائی اور قباحت کا ادراک کر سکیں۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں زمانہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکین کے گروہ یا گزشتہ زمانوں کے بت پرستوں اور گمراہوں کی باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو وہ آنحضرتؐ یا انبیائے ماسلف کو کہا کرتے تھے کہ ''ہم نے اپنے آداب ورسوم اور عقائد کو اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں پایا ہے، لہٰذا ہم ان کی پیروی کریں گے اور انہی کی اقتدا کریں گے۔'' یعنی ان کی انبیاء سے مخالفت کی واحد دلیل اپنے آباو اجداد کی اندھی تقلید ہی ہے اور بس!

اس طرح سے کفر، بت پرستی، انواع واقسام کے گناہ اور عادات قبیحہ انہیں نسل درنسل منتقل ہوتی چلی آئیں اور روح تقلید نے ان کی عقل وفکر پر تقلید کے دبیز پردے اس حد تک ڈال دیئے تھے کہ وہ ہر ایک حقیقت کا انکار کر دیتے تھے۔قرآن پاک ایسے افراد کو ہی کہتا ہے ''تو کیا تمہارے آباء و اجداد جاہل اور گمراہ نہیں تھے؟'' آیا جاہل کی تقلید صحیح ہے؟ (اولو کان اباءھم لا یعلمون شیئا ولا یتھدون) (مائدہ ۱۰۴)

اور کبھی کہتا ''آیا تمہارے آباء واجداد شیطان کے آلہ کار نہیں تھے؟ اور شیطان انہیں جہنم کی آگ کی طرف نہیں بلاتا؟'' تو پھر تم ان کی کیسے پیروی کرتے ہو؟'' (اولو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر) (لقمان ۲۱)

اور کبھی کہتا ہے: ''جو کچھ پیغمبر علیہ السلام تمہارے پاس لایا ہے وہ تمہارے آباء واجداد کی راہ ورسم سے زیادہ ہدایت کرتا ہے'' تو پھر تم اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ (قال اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیه ابائکم)۔ (زخرف ۲۴)

تشریح

ا۔تقلید کی مختلف قسمیں

دوسروں کی پیروی، خواہ زندہ افراد کی پیروی ہو یا مردوں کی، خواہ ایک فرد کی پیروی ہو، یا ایک جماعت کی، چار صورتوں سے خالی نہیں۔

۱۔ جاہل کی تقلید عالم سے۔یعنی جو شخص نہیں جانتا وہ اس کی تقلید کرے جو کسی فن کا ماہر اور عالم ہو، جیسے ناسمجھ مریض کا آگاہ، دلسوز اور باسمجھ طبیب کی طرف رجوع کرنا۔

۲۔ عالم کی تقلید عالم سے۔جیسے اہل فن کا ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنا۔

۳۔ عالم کی تقلید جاہل سے۔ جیسے ایک عالم شخص اپنے علم کو خیر باد کہہ کر جاہلوں کے پیچھے لگ جائے۔

۴۔ جاہل کی تقلید جاہل سے۔ جیسے جہلاء کا ایک گروہ کسی رسم ومنت یا عقیدے کو اپنے لیے انتخاب کرے اور بے سمجھ لوگوں کا دوسرا گروہ آنکھ اور کان بند کرکے ان کی اتباع کرے۔ چنانچہ ایک قوم سے دوسری قوم کی غلط رسوم اور فاسد عقائد کے منتقل ہونے کا سب سے زیادہ سبب یہی قسم ہے اور قرآن پاک میں بھی اسی قسم کی تقلید کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ ان چار قسموں میں سے بہترین، منطقی، مرغوب، ممدوح اور مطلوب پہلی قسم ہی ہے اور اصولی طور پر ماہرانہ امور میں انسانوں کی زندگی کے محور کو بھی اسی قسم کی عاقلانہ اور منطقی پیروی ہی تشکیل دیتی ہے، کیونکہ مسلم ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نابغہ روزگار ہو پھر بھی وہ تمام امور میں مہارت تامہ کا دعویٰ نہیں کرسکتا، خاص کر ایسے دور میں کہ ایک فن میں کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کے کئی سررشتے ہیں۔ مثلاً طب ہی کو لے لیجئے جس کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے کئی سررشتے ہیں اور عام طور پر یہ بات محال ہے کہ ایک فرد اسی فن کے تمام سررشتوں میں مہارت تامہ حاصل کرلے، چہ جائیکہ تمام فنون کا کلی طور پر ماہر ہو۔

اس صورت میں جو شخص جس سررشتے میں ماہر ہوگا اسی کے بارے میں اپنے اجتہاد پر عمل کرے گا اور جو لوگ اس بارے میں صاحب نظر اور مجتہد نہیں ہیں ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اس فن کے صاحبان نظر اور ماہرین کی طرف رجوع کریں۔

اگر کوئی تعمیراتی انجینئر بیمار ہوگا تو وہ یقیناً طبیب کی طرف ہی رجوع کرے گا اور اگر وہی طبیب کوئی عمارت بنانا چاہے گا تو اس انجینئر کی طرف رجوع کرے گا۔ یعنی اگر ہر شخص ایک رشتہ میں ''مجتہد'' ہے تو دوسرے رشتہ میں ''مقلد'' ہوگا اور یہ ایک معقول اصول ہے (جاہل کا عالم کی طرف، غیر مجتہد کا مجتہد کی طرف اور غیر ماہر کا ماہر کی طرف رجوع) جو ازل سے چلا آرہا ہے۔ بلکہ اصولی طور پر انسانی زندگی کا پہیہ اس اصول سے ہٹ کر گھوم ہی نہیں سکتا۔ البتہ صاحبانِ نظر اور اربابِ اجتہاد کی کچھ شرائط جن کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

یہ وہی چیز ہے جسے بعض اوقات ''اسوۂ حسنہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنه'' یعنی تمہارے لیے رسولؐ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ (احزاب ۲۱) اور سورۂ انعام میں ہم پڑھتے ہیں ''اولئك الذین هدی الله فبهوا اهم اقتده'' یعنی (حضرت اسماعیلؑ، یونسؑ، یحییٰ، یوسفؑ اور موسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء) ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے۔ پس تو ان کی ہدایت کی اقتدا کر۔ (انعام ۹۰)

اگرچہ اس آیت میں خطاب پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ اس سے مراد امت ہو۔

رہ گئیں تقلید کی دوسری تین قسمیں تو وہ سب کی سب باطل، بے بنیاد اور غیر منطقی ہیں۔ کیونکہ:

(الف) جاہل سے عالم کی تقلید اور (ب) جاہل اسے جاہل کی تقلید تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسمیں باطل ہیں۔ لیکن عالم سے عالم کی تقلید اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اسے تقلید نہیں کہا جاتا، ہرگاہ عالم کا عالم کی طرف رجوع کسی مسئلے کے بارے میں مشورے اور مزید معلومات کے حصول کے لیے بھی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ یہ صورت حال مذموم اور نامعقول نہیں لیکن یہ ''تقلید'' بھی نہیں ہے، بلکہ اسے ''تحقیق'' کی ایک قسم کہا جائے گا جو اس سررشتہ میں مہارت کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

تقلید یہ ہوتی ہ کہ انسان کسی رشتے میں اپنے علم وعمل کو نظر انداز کرکے اپنے کان اور آنکھیں بند کرتے ہوئے دوسرے شخص کی پیروی کرے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایسا شخص جو خود تحقیق اور اجتہاد پر قادر ہے اگر وہ یہ طریقہ کار اختیار کرے گا تو اس کے لیے قابل مذمت ہوگا۔ اسی لیے تو فقہ اسلامی میں مجتہدین کے لیے کسی کی تقلید حرام ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر تقلید کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ غیر فقہی افراد کو فقہی مسائل میں فقہاء اور مجتہدین کی تقلید کیوں کرنی چاہیے اور یہی فلسفہ تمام علمی رشتوں میں کارفرما ہے۔ چونکہ اسلامی فقہ اس قدر وسیع اور گہری ہے کہ جو شخص اس میں مہارت اور تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اپنی ساری زندگی اس کے حصول اور تحقیق کے لیے وقف کردینا پڑتی ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے مجبوراً اس کے لیے ایک خاص گروہ کو کمر ہمت باندھنا پڑتی ہے اور دوسرے لوگوں کو فقہی مسائل میں ان کی تقلید کرنا پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسلامی اصولوں (اصولِ دین) میں تقلید جائز نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ان کی تحقیق پر قادر ہوتا ہے۔

۲۔ صحیح تقلید کی شرائط

عموماً تقلید کی تعریف میں کہتے ہیں کہ ''کسی دوسرے کی بات کو تفصیل دلیل کے بغیر قبول کرنے کا نام'' تقلید ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے مزید وسعت دی ہے اور قول وگفتار سے ہٹ کر عملی پیروی کو بھی اس کا جزو سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض دوسرے حضرات نے تو تقلید کو اس سے بھی وسیع تر معنی میں بیان کیا ہے اور ''دوسروں کے اعمال، رفتار وگفتار اور صفات جو کسی انسان میں لاشعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں'' کو بھی تقلید کا حصہ سمجھتے ہیں۔

البتہ تعریف کا یہ آخری حصہ یعنی لاشعوری تاثیر ہماری بحث کے موضوع سے خارج ہے، لیکن اس کا پہلا اور دوسرا حصہ بھی اس وقت قابل ستائش تقلید کہلائیں گے جب اس شخص (مرجع تقلید میں) یہ دو شرائط پائی جائیں۔ (الف) علم (ب) صداقت۔ یعنی وہ صاحب علم ونظر ہو اور اپنی تشخیص کو دوسروں تک پوری صداقت کے ساتھ منتقل کرے اور اگر ان دو میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو تقلید نا قابل ستائش قسم میں داخل ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس موضوع میں تقلید کی جارہی ہے وہ ان موضوعات میں سے ہو جن کا تعلق تخصص سے ہوتا ہے، تاکہ اس میں تقلید جائز ہو سکے۔ رہے وہ مسائل جو عمومی ہوتے ہیں، یعنی ہر شخص ان کی تحقیق کرسکتا ہے (جیسے اعتقادی اصول سے متعلق مسائل، یا کچھ وہ اخلاقی اور اجتماعی مسائل جن کا تخصص سے تعلق نہیں ہوتا) ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق ان میں تحقیق کرنی چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مقلد خود بھی استنباط پر قادر نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس پر قادر ہو اور کسی شخصی مسئلے کو پوری تحقیق کے ساتھ زیر بحث لاسکتا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کرسکتا ہے تو اس کے لیے تقلید ممنوع ہے۔

یہیں سے تین جہات کے لحاظ سے (مرجع کی شرائط، مقلد کی شرائط اور موضوع کی شرائط کہ جس میں تقلید کی جاسکتی ہے) قابل ستائش اور نا قابل ستائش تقلید کے درمیان موجود سرحد واضح ہو جاتی ہے۔

اس بحث کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ہی ختم کرتے ہیں:

حضرت امام علیہ السلام کی خدمت میں کسی نے عرض کیا جناب! باوجود یکہ یہودی عوام اپنی آسمانی کتاب کی اطلاع اپنے علماء کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے نہیں رکھتے تھے تو پھر خداوند عالم نے ان کی اس تقلید کی وجہ سے ان کی اس قدر مذمت کیوں فرمائی ہے؟ (اس کا اشارہ سورہ بقرہ کی ۷۸ ویں اور ۷۹ ویں آیات کی طرف تھا یعنی "ومنهم اميون لا يعلمون الكتاب الا امانى" اور "فويل للذين يكتبون الكتاب بايديهم" کی طرف)۔

تو کیا یہودی عوام میں اور ہمارے عوام میں اس بارے میں کوئی فرق ہے؟

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ہمارے عوام اور یہودی عوام کے درمیان ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے برابری ہے۔ جس لحاظ سے برابری ہے وہ یہ کہ خداوند عالم نے ہمارے عوام کی بھی اسی طرح مذمت کی ہے جس طرح یہودی عوام کی مذمت کی ہے۔ لیکن جس لحاظ سے ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ یہودی عوام اپنے علماء کی کیفیت سے آگاہ تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ مطالب کو بیان کرنے میں جھوٹ سے کام لے رہے ہیں، حرام اور رشوت کھا رہے ہیں اور خدائی احکام کو تبدیل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی فطرت کے ذریعہ اس حقیقت کو بخوبی دریافت کر لیا تھا کہ اس قسم کے لوگ فاسق ہیں اور خدا اور احکام خدا کے بارے میں ان کی باتوں کو تسلیم کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خدا کے رسولوں کے بارے میں ان کی کوئی بات قابل قبول ہے۔ اسی لیے خدا نے ان کی مذمت کی ہے۔

اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء سے آشکار افسق، شدید تعصب اور دنیا اور حرام مال کے لیے ان کی حرص کو دیکھیں اور پھر ان کی اتباع کریں تو ان یہودیوں کی مانند ہیں جن کی خدا نے اپنے فاسق علماء کی پیروی کرنے کی وجہ سے مذمت کی ہے۔

پھر آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"فاما من كان من الفقهاء صائنا لنفسه حافظا لدينه مخالفا على هواه مطيعا لامر مولاه فللعوام ان يقلدوه"

''یعنی جو فقہاء اپنی حفاظت کرنے والے، دین خدا کو بچانے والے، اپنی نفسانی خواہشات کے مخالف اور اپنے مولا کے فرمان کے مطیع ہوں، تو عوام کو چاہیے کہ وہ ان کی تقلید کریں۔''[1]

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۸، ص ۹۴، باب ابواب صفات القاضی، حدیث ۲۰۔ البتہ کتاب وسائل الشیعہ میں اس حدیث کا کچھ حصہ بیان ہوا ہے اور مکمل حدیث آپ کو ''احتجاج طبرسی'' اور تفسیر امام حسن عسکری میں ملے گی۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بھی اسے اپنی کتاب بحار الانوار، جلد ۲، ص ۸۶ تا ۸۹ میں اسے نقل کیا ہے۔

۳۔اندھی تقلید کے اسباب

اندھی تقلید یا دوسرے لفظوں میں ”جاہل کی جاہل سے تقلید“ اوراس سے بھی بدتر ”جاہل سے عالم کی تقلید“ فکری وابستگی کی علامت ہے اور یہ امر بہت سے اسباب کا حامل ہے جن میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں:

۱۔فکری نابالغی:

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جوجسمانی طور پر تو بالغ ہو چکے ہوں لیکن آخری عمر تک فکری بلوغ اوراستقلال کو نہ پہنچ سکیں۔ایسے لوگ اسی وجہ سے اپنی ساری زندگی ہرکس وناکس کی پیروی کرنے میں گزار دیتے ہیں اورکسی بھی وقت ذاتی طور پر کسی مسئلے کا تجزیہ وتحلیل نہیں کر سکتے۔

ان کی آنکھیں ہمیشہ دوسروں پر لگی رہتی ہیں۔جو وہ کہہ دیں اسے دہراتے رہتے ہیں اوراس میں ان کا اپنا کوئی ارادہ اوراختیار نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنے ماحول کی تبدیلی سے اپنی راہوں کومکمل طور پر تبدیل کر لیتے ہیں اوراصطلاح کے مطابق ان کے اندر ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آجاتی ہے۔

اس قسم کی اندھی تقلید کا مقابلہ کرنے اوراسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ایک ہی راستہ ہے اوروہ یہ کہ معاشرے کی تعلیمی سطح کو بلند کیا جائے اورمعاشرے میں موجود افراد کے اندر خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے اوران کے افکار کو جلابخشی جائے۔

۲۔شخصیت پرستی:

اس طرح کہ انسان کسی شخص کو بےنظیر اورعدیم المثال ہیرو کے عنوان سے قبول کر لیتا ہے اوراس کے سامنے اسے اپنے نظریہ کو بیان کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اوروہ آنکھ اورکان بند کر کے اس کے پیچھے لگ جاتا ہے،خواہ وہ شخصیت تقلید اوراتباع کی اہل نہ بھی ہو۔

۳۔آباؤاجداد سے شدید تعلق:

اوروہ بھی اس حد تک کہ کبھی کبھی توعظمت اورتقدس کے ہالہ کے اس قدر اندر چلے جاتے ہیں کہ وہ لوگ خواہ کسی قسم کی اہلیت اورلیاقت نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی نسل درنسل ان کے خیالات وافکار ان لوگوں کے لیے قابل عمل ہوتے ہیں اورکانوں اورآنکھوں کو بند کر کے ان کی اتباع کی جاتی ہے اورعام طور پر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد کی نسلیں جوگزشتہ لوگوں کے علوم کی وارث ہوتی ہیں اورجو بھی تازہ اورجدید معلومات کی حامل ہوتی ہیں اورگزشتہ لوگوں سے علم میں بھی زیادہ ہوتی ہیں،لیکن پھر بھی آنکھیں اورکان بند کر کے ان کی تقلید پر اڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

۴۔گروہ بندی یا قبائلی تعصّبات:

اس قسم کے رجحانات اورتعصّبات اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ کچھ لوگ آنکھیں اورکان بند کر کے اپنے گروہ، پارٹی،قبیلہ اور

جماعت کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہیں وہ اس کا تکرار کرتے ہیں اور اپنی طرف سے مسائل کے تجزیہ وتحقیق اور فکری استقلال کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

یہ چار اور دوسرے کئی عوامل ایسے ہیں جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ بہت سی خرافات، موہومات، باطل عقائد، غلط آداب و مراسم، جاہلانہ رسومات اور بدعملی ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بالفاظ دیگر مندرجہ بالا غلط رجحانات، میلانات اور تعصّبات ان کے افکار کے آگے حجاب ہوتے ہیں اور حق کی معرفت سے انہیں باز رکھتے ہیں۔

۹۔عیش پرستی کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو غور سے سنتے ہیں۔

آیات

(۱) وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ۝٨٦ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۝٨٧ (سورہ توبہ ۸۶-۸۷)

(۲) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝٩٣ (سورہ توبہ ۹۳)

ترجمہ

(۱) اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ تم خدا پر ایمان لے آؤ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ مل کر جہاد کرو، تو ان (منافقین) میں سے کچھ لوگ، جو طاقتور ہیں، آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ہمیں قاعدین (جن سے جہاد معاف ہے) کے ساتھ رہنے دیں۔ وہ اسی بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگائی جا چکی ہے۔ اس لیے وہ نہیں سمجھ پاتے۔

(۲) مواخذے کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں جبکہ وہ بے

نیاز ہیں (اور کافی امکانات رکھتے ہیں) وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور خداوند عالم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

بچوں کی طرح ہمیں بھی جہاد سے معاف رکھا جائے

ان آیات کی پہلی قسم ان لوگوں کی حالت بیان کر رہی ہے جو جہاد کے سلسلے میں خدائی احکام پر عملدر آمد کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ حالانکہ وہ جسمانی اور مالی لحاظ سے اس قدر طاقتور تھے کہ وہ میدان جنگ میں حاضر ہو سکتے تھے۔لیکن ان کی ہر ممکن یہی کوشش رہتی کہ وہ خود کو کمزور و ناتواں افراد کی صف میں شامل رکھیں۔یعنی ایسے لوگوں کی صف میں جو جسمانی یا مالی لحاظ سے جہاد کی توانائی نہیں رکھتے تھے۔ان کا اصرار رہتا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اجازت دے دیں کہ وہ ''قاعدین'' اور ''خوالف'' کی صف میں شامل رہیں۔

''قاعدین''، ''قاعد'' (بیٹھا ہوا) کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو جہاد سے معذور ہوتے ہیں اور ''خوالف'' ''خالفہ'' کی جمع ہے جو ''خلف'' (بروزن حرف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں پچھلا حصہ۔اسی لیے ان عورتوں کو ''خالفہ'' کہا جاتا ہے جو مردوں کے گھر سے باہر جانے کے بعد گھر میں رہ جاتی ہیں۔لیکن بعید نہیں ہے کہ یہاں پر اس کا عمومی مفہوم مراد ہو،یعنی جو لوگ بھی کسی نہ کسی قسم کے عذر کی وجہ سے میدانِ جہاد میں حاضر ہونے سے قاصر ہوتے ہیں،خواہ وہ عورتیں ہوں یا بچے،بوڑھے ہوں یا بیمار۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''خالف'' اس شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ خلاف ورزی کرتا ہے۔[1]

یہ لفظ کبھی ''بدبو'' کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ بدبو خوشبو کی قائم مقام ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کے معنی انحطاط اور پستی کی طرف رجحان بھی کئے ہیں کیونکہ یہ خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔لیکن پہلا معنی سب معانی سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

معنی خواہ کچھ بھی ہو اصل مقصد یہ ہے کہ یہ عیش پرست اور رفاہ طلب لوگ جو اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتے کہ طوفانوں اور اجتماعی بحرانوں میں دوسرے لوگوں کی مانند ایثار کا مظاہرہ کریں، بلکہ وہ اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ خواہ انہیں بچوں اور بیماریوں کی صف میں کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے، جہاد سے بچے رہیں۔اسی لیے آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے ''ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔''

جی ہاں! راحت طلبی، تن پروری اور عیش و نوش بھری مرفہ زندگی حجاب بن کر ان کی فکری آنکھوں پر پڑ چکی ہے۔انہیں یہ سمجھ نہیں ہے

---

[1] المنار، جلد ۱۰، ص ۵۷۲

کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی خواب وخوراک میں نہیں بلکہ کبھی تو اس کی سعادت میدانِ جہاد میں قدم رکھنے اور اپنے پیکر کو خاک وخون میں غلطان دیکھنے میں ہے۔اس طرح اس کے لیے لقاء اللہ، قرب حق کے جوار اور ضیافت حق کی راہیں کھلتی ہیں۔لیکن جو شخص ان مسائل کو نہیں سمجھتا ممکن ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑائے اور توہین کرے۔

دوسری آیت میں پہلے تو ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں میدان جہاد میں حاضر ہونے سے معاف قرار دیا گیا ہے، جیسے کمزور، بیمار اور وہ لوگ جو کسی اور وجہ سے میدان جہاد میں شریک ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔لیکن ان کا دل عشق جہاد کے شوق میں دھڑکتا رہتا ہے اور اس راستے میں خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے سیل اشک ان کی آنکھوں سے جاری رہتا ہے۔پھر فرماتا ہے ”ایسے لوگ قابل مواخذہ نہیں ہیں، بلکہ مواخذہ تو ان لوگوں سے کیا جائے گا جو صاحبانِ ثروت اور طاقت ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ پیچھے رہ جانا چاہتے ہیں۔“

اس مقام پر ہی قرآن کہتا ہے ”خداوند عالم نے ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔اسی لیے وہ کچھ نہیں جانتے۔“ کیونکہ عیش و عشرت اور راحت طلبی کا ضخیم حجاب ان کے دل کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔اس طرح سے دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں اور واضح کر رہی ہیں کہ ”راحت طلبی اور عیش وعشرت کی وجہ سے جہاد سے باز رہنے اور حقیقت کے ادراک سے محروم رہ جانے“ کے درمیان ایک خاص تعلق اور ربط موجود ہے۔

۱۰۔آرزوؤں کا حجاب

آیات

(۱) يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ (سورہ حدید ۱۴)

ترجمہ

(۱) وہ (منافقین بروزِ قیامت) مومنین کو آواز دیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ضرور تھے، لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور (پیغمبر کی موت کا) انتظار کرتے رہے اور شک وتردد میں پڑے رہے اور لمبی آرزوؤں نے تمہیں فریب میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ خدا کا حکم (یعنی تمہاری موت کا پیغام) آپہنچا اور شیطان نے خدا کے بارے میں تمہیں فریب دیا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

لمبی آرزوئیں

"امانی"، "امنیه" کی جمع ہے جس کے معنی ایسی حالت ہیں جو انسان کے نفس میں کسی چیز کی تمنا سے پیدا ہوتی ہے۔[1] جسے فارسی میں "آرزو" کہتے ہیں۔ البتہ چونکہ معقول قسم کی آرزو معیوب ہی نہیں بلکہ مستقبل کے بنانے کے لیے تحرک کا ایک عامل بھی ہے۔ جو چیز معیوب اور قابل اعتراض ہے وہ لمبی لمبی اور غیر منطقی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے "امنیه" اور "امانی" کی ایسے مواقع پر ان لمبی چوڑی اور دور دراز کی آرزوؤں سے تفسیر کی جاتی ہے جو انسان کو ہر چیز سے غافل کر دیتی ہیں اور اس کی عقل و فکر پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔

"ابن اثیر" کہتے ہیں "تمنی" کا معنی کسی مطلوب امر کے حصول سے تعلق ہے اور اسی طرح ان حوادث کے بارے میں دل میں پیدا ہونے والی باتیں بھی "تمنی" کہلاتی ہیں جو حوادث مستقبل میں رونما ہوتے ہیں یا رونما نہیں ہوتے اور "منیه" (بروزن کنیه) اور "امنیه" کا ایک معنی ہے[2] اور بعض لوگوں نے "امنیه" کو جھوٹ کے معنی میں ذکر کیا ہے، کیونکہ دروغ گو انسان کسی بات کو اپنے دل میں پروان چڑھا رہا ہوتا ہے۔[3]

راغب کہتے ہیں کہ چونکہ جھوٹ ایسی چیز کا تصور ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، آرزوئیں بھی جھوٹ اور دروغ گوئی کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر جھوٹ کو "امنیه" کہا جاتا ہے تو اسی وجہ سے ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کلمہ کی اصل کسی چیز کا تصور میں لانا، فرض کرنا اور اندازہ لگانا، بتایا ہے[4] اور آرزوؤں کو اس لیے "امانی" کہتے ہیں کیونکہ انسان اپنے دل میں انہیں فرض کرتا، تصور میں لاتا اور ان کا اندازہ لگاتا ہے۔

بہر حال جب مومنین قیامت کے دن نورِ ایمان کی روشنی میں عرصہ محشر کو جلدی جلدی طے کر کے بہشت کی طرف جا رہے ہوں گے تو منافقین پکار کر کہیں گے "ایک نظر ہم پر بھی ڈالتے جایئے تاکہ ہم آپ کے نور سے کچھ روشنی حاصل کر سکیں۔ تو وہ جواب میں کہیں گے تم (دنیا میں) واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے جا کر نور حاصل کرو۔ اس موقع پر ایک دیوار انکے درمیان حائل ہو جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔"

---

[1] مفردات راغب۔ توجہ رہے کہ "امانی"، "امنیه" کی جمع ہے اور "منی" (بروزن شا) "منیه" (بروزن کنیه) کی جمع ہے۔

[2] لسان العرب

[3] المنجد، مادہ "منی"

[4] مجمع البحرین طریحی

یہی موقعہ ہوگا کہ منافقین کی آواز بلند ہوگی اور وہ کہیں گے کہ کیا ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے؟ کیا ہم دنیا میں ایک معاشرے میں نہیں رہ رہے تھے اور یہاں پر بھی کچھ دیر کے لیے ہم آپ کے ہمسفر رہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آپ ہم سے اچانک جدا ہو گئے، آپ تو رحمت الٰہی کی طرف چلے گئے اور ہمیں عذاب کے چنگل میں ڈال گئے؟

اس مقام پر وہ انہیں جواب دیں گے ”ٹھیک ہے کہ ہم اکٹھے رہے ہیں، کوچہ و بازار میں، حتیٰ کہ بعض اوقات سفر وحضر میں بھی ساتھ رہے ہیں، ایک دوسرے کے ہمسائے بھی رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو ایک گھر میں بھی رہے ہیں، لیکن تم نے پانچ عظیم غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ پہلی تو یہ کہ تم نے کفر ونفاق کی راہوں پر چل کر خود کو ہلاکت میں ڈال دیا اور فتنہ پردازی کی۔ (ولکنکم فتنتم انفسکم)

دوسری یہ کہ تم ہمیشہ مسلمانوں کی شکست، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کے منتظر رہے اور ہر کام میں لیت ولعل سے کام لیتے رہے۔ (وتربصتم)

تیسری یہ کہ تم ہر چیز میں شک اور تردد کا اظہار کرتے تھے، خصوصاً معاد اور اسلام کی حقانیت کے معاملے میں۔ (وارتبتم)

چوتھی یہ کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا اور تمہاری عقل وفکر پر پردہ ڈال دیا، حتیٰ کہ تمہاری موت کا وقت آن پہنچا۔ (وغرتکم الا مانی حتیٰ جاء امر اللہ)۔

پانچویں ان سب کے علاوہ فریب کار شیطان نے بھی تمہیں خدا کے بارے میں فریب دیا اور تمہیں کہا خدا کی عفو وبخشش کے ساتھ دل لگائے رکھو، وہ تمہیں ہرگز سزا نہیں دے گا۔ (وغرکم باللہ الغرور)۔

جی ہاں! یہی عوامل تھے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے اور وہ منظر تشکیل دیا جو تم دیکھ رہے ہو اور یہ دیوار جو تمہیں نظر آ رہی ہے انہی عوامل نے ایجاد کی ہے۔

ہماری بات کا شاہد چوتھا جملہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا۔ جی ہاں! بسا اوقات انسانی آرزوؤں کا سلسلہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اسے ہر چیز سے غافل اور بے خبر کر دیتا ہے اور خیالوں اور سوچوں کی ایک دنیا میں لے جاتا ہے، آنکھوں اور کانوں کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور دانا اور ہوشیار لوگوں کو ہر طرف سے بے خبر کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنی زندگی کے لیے ایسے ایسے منصوبے تیار کرتے ہیں جو عمر نوح میں بھی قابل عمل نہیں ہوتے اور بعض اوقات اپنے مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسی مقدمہ سازی کرتے ہیں کہ ہر شخص ایک سادہ سے اندازے سے ہی بتا دیتا ہے کہ اس تک صدیوں میں بھی رسائی ناممکن ہے اور اسی کا نام حجاب معرفت ہے۔

کچھ اور مفسرین نے ”امانی“ کی تفسیر میں مذکورہ پانچ چیزوں کے علاوہ پانچ اور چیزیں بھی بتائی ہیں اور وہ یہ ہیں: ”مومنین کی شکست وکمزوری کی آرزو، شیطانی فریب کاری، دنیا، اپنے لیے پیغمبر کے استغفار کی انتظار اور نیکیوں کو یاد رکھنا اور برائیوں کو فراموش کر دینا،[1] جبکہ بعض

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹ ص ۶۴۱۷ ۵

دوسرے مفسرین نے انہیں ''اباطیل'' سے تفسیر کیا ہے۔
لیکن بغیر بتائے یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ لمبی چوڑی آرزوؤں کے جامع مفہوم میں آ جاتا ہے۔

مزید تشریح

آرزوؤں کا حجاب روایات کی رو سے

یہ ایک حقیقت ہے کہ خیال باقی پر مبنی اور واقعیت سے دور آرزوئیں انسانی عقل و شعور پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس واقعیت کا تذکرہ صرف قرآن مجید ہی میں نہیں بلکہ روایات اور تاریخ میں بھی اس کے کافی حد تک شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی ایک معروف حدیث میں ہے:

"ان اخوف ما اف علیکم اثنان، اتباع الهوی و طول الامل، فاما اتباع الهوی فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الاخرة"

''سب سے زیادہ خطرناک چیزیں جن سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے، دو ہیں۔ ایک تو خواہشات نفسانی کی پیروی اور دوسرے لمبی آرزوئیں۔ کیونکہ خواہشات نفسانی کی پیروی حق سے مانع ہو جاتی ہے اور لمبی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔'' [۱]

حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث کلمات قصار میں موجود ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"الامانی تعمی اعین البصائر"

''لمبی آرزوئیں بصیرت کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہیں۔'' [۲]

ایک اور حدیث میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"جماع الشر فی الاغترار بالمهل و الاتکال علی الامل"

''شر اور فساد جمع کر دیئے گئے ہیں، خدا کی طرف سے دی گئی مہلتوں اور لمبی آرزوؤں پر بھروسہ کرنے میں۔'' [۳]

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۲۷۵

[۳] غرر الحکم (حرف ج نمبر ۵۵)

اسی طرح اسی سلسلے میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"غرور الامل یفسد العمل"

''آرزوؤں کا دھوکا اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔'' [۱]

قصہ مختصر وہی شخص حقیقت کے زیبا چہرے کو جیسا کہ وہ ہے دیکھ سکتا ہے اور معرفت کے چشمۂ زلال تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جو اپنی عقل کی آنکھوں پر آرزوؤں کا پردہ نہ ڈالے اور اس تیز و تاریک بادل کے درمیان نہ پھنس جائے۔

اس بحث کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہی کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں،

''واعلموا ان الامل یسھی العقل وینسی الذکر فاکذبوا الامل فانہ غرور وصاحبہ مغرور'' ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے لمبی آرزوئیں عقل کو گمراہ اور یادِ خدا کو فراموشی کے سپرد کر دیتی ہیں۔ اسی لیے تم آرزوؤں کی پروانہ کرو کیونکہ یہ دھوکہ باز ہیں اور اپنے صاحب کو فریب میں ڈال دیتی ہے۔'' [۲]

---

[۱] غرر الحکم

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۸۶

دوسرا حصہ

وہ اعمال جو معرفت کے لیے حجاب بن جاتے ہیں

۱۱۔ گناہوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

آیات

(۱) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲
اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴ (سورہ مطففین ۱۱ تا ۱۴)
(۲) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا
اَرْحَامَكُمْ ۝۲۲ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝۲۳
(سورہ محمد ۲۳-۲۲)
(۳) اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَاۗءُ اَصَبْنٰهُمْ
بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۱۰۰ (سورہ اعراف ۱۰۰)
(۴) ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗاٰۗى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ (سورہ روم ۱۰)

ترجمہ

(۱) جو لوگ کہ قیامت کا انتظار کرتے ہیں اور اس کا صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ وہی لوگ کہ جب ان پر ہماری آیات کو تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو

گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال اس زنگ کی مانند ہیں جو ان کے دل پر چڑھ چکا ہے۔

(۲) اگر تم روگردانی کرو تو کیا اس کے علاوہ کسی اور بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور قطع رحمی کرو؟ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر رکھا ہے۔ ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

(۳) کیا وہ لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے جو گزشتہ لوگوں کے وارث ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں تاکہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

(۴) جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں ان کا انجام کار یہ ہوا کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا (اور راہِ ہدایت کو گم کر دیا)۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

گناہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتے ہیں

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مکمل طور پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے کہ قیامت کے دلائل واضح ہیں۔ صرف وہ لوگ ہی اس کے انکار پر اصرار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے۔ وہ کسی بھی صورت میں خدائی آیات کے سامنے سر تسلیم ختم نہیں کرتے۔ اسی لیے جب ان کے سامنے خدائی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اس کا انکار کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں ''یہ سب کچھ گذشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔''

قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس قسم کی باتیں اس لیے ہیں کہ ان کے برے اعمال اور گناہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چڑھ چکے ہیں۔

یہاں پر قرآن پاک نے لفظ ''رین'' کو استعمال کیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ ارباب لغت کی طرف سے اس لفظ کی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) وہ زنگ جو قیمتی اشیاء پر چڑھ جاتا ہے۔ (۲) وہ زنگ جو دھاتوں پر چڑھ جاتا ہے اور ان کے گل سڑ جانے کی علامت ہوتا ہے۔ (۳) ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ لہٰذا عقل پر شراب کے غلبے، زندہ انسانوں پر موت کے غلبے اور آنکھوں پر نیند کے غلبے پر اسی لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۹۴ و روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۲

البتہ یہ سب معانی ایک جامع مفہوم میں جمع ہیں اور وہ ''زنگ'' ہے جو چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق عمومی طور پر ایک چیز کے دوسری چیز پر غلبہ پانے پر ہونے لگا۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ گناہ دل کی شفافیت کو اس طرح ختم کر دیتا ہے کہ اس آئینہ الٰہی میں حقائق منعکس نہیں ہو پاتے، جبکہ مبداء و معاد کے سلسلے میں حق کی آیات بے حد و حساب اور واضح و آشکار ہیں۔

لہٰذا بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مرحلے میں برے اعمال انسان کے نفس میں نقش اور صورتیں ایجاد کرتے ہیں، دوسرے مرحلے پر یہ نقش اور صورتیں حق کے ادراک سے مانع ہو جاتے ہیں، تیسرے مرحلے پر انسانی روح اپنی اصل طبیعت کے پیش نظر، جو کہ صفا اور جلا کی حامل ہوتی ہے، حقیقت کو جیسا کہ ہے، اسی طرح درک کرتی ہے اور حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالتی ہے اور تقویٰ کو فجور اور بے تقوائی سے جدا کرتی ہے۔ جیسا کہ سورہ شمس کی ساتویں اور آٹھویں آیت میں مذکور ہے کہ "**ونفس و ما سواها فالهمها فجورها و تقواها**"۔ یعنی قسم ہے انسانی روح کی اور اس کی جس نے اسے پیدا کیا ہے اور پھر اسے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا ہے۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے اس بارے میں ایک اور تحلیل پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

''جب انسان کچھ اعمال کا تکرار کرتا ہے تو بالتدریج اس کے اندر ملکہ نفسانی پیدا ہو جاتا ہے جیسے لکھنا، پڑھنا وغیرہ کیونکہ ابتداء میں تو انسان بڑی مشکل سے اسے انجام دیتا ہے لیکن تکرار اور مشق کرنے سے اس پر یوں مسلط ہو جاتا ہے جیسے کسی قسم کے مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت محسوس کیے بغیر اسے انجام دیتا ہے۔''

''گناہوں کی بھی یہی صورت حال ہے۔ جب پے در پے انسان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل میں گناہ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ گناہ کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ اسے غیر اللہ کے ساتھ مشغول کر دیتا ہے جبکہ غیر اللہ کی طرف توجہ ظلمت اور تاریکی ہے اور جب اس قسم کی ظلمتیں یکے بعد از دیگرے دل پر غالب آ جاتی ہیں تو اس سے پہلی شفافیت کو سلب کر لیتی ہیں۔ ان ظلمتوں کے کئی مراتب و مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں ''رین'' یا زنگ ہے، دوسرے میں ''طبع'' (مہر لگانا) ہے اور ان سے بالاتر مرحلہ ''اقفال'' (تالوں) کا ہے۔''

آیات کی دوسری قسم ان منافقین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو ایمان کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور جب جہاد کی آیات نازل ہوتی تھیں تو وہ بیمار دل لوگ ایسی حالت اختیار کر لیتے جیسے انہیں ابھی موت آیا ہی چاہتی ہے اور ان کی روح ابھی قبض ہوا ہی چاہتی ہے۔ قرآن مجید انہیں کہتا ہے ''اگر تم نے اپنی مخالفت جاری رکھی، خدا کے فرمان اور اس کی کتاب پر عملدرآمد سے روگردانی کرتے رہے، تو تم سے اس کے سوا اور کوئی توقع نہیں کی جائے گی کہ تم زمین میں فساد برپا کرو، حتی کہ تم قریب ترین رشتہ داروں پر رحم نہ کرو۔ پھر فرماتا ہے: ''خدا نے ایسے لوگوں پر (ان کے اپنے گناہوں کے جرم میں) لعنت کی ہے اور ان کی دیکھنے اور سننے کی طاقت سلب کر لی ہے، ان کی آنکھیں اندھی اور کان بہرے ہیں،

---

[1] المیزان، جلد ۲۰، ص ۳۴۹

وہ حق کے چہرے کو دیکھ نہیں سکتے اورحق کی آواز کو سن نہیں سکتے۔‘‘

یہ آیات بھی جہاں ایک طرف یہ بتا رہی ہیں کہ نفاق دل وجان پر ایک حجاب ہے تو وہاں دوسری طرف پر بھی بتا رہی ہیں کہ گناہ، خاص کر ’’فساد فی الارض‘‘، ’’قطع رحمی‘‘ اور ’’ظلم وستم‘‘ بھی انسان کے ادراک اور تشخیص پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

’’ان تولیتم‘‘ کے جملہ کی بعض مفسرین نے ’’روگردانی‘‘ کے معنی میں تفسیر کی ہے اور بعض دوسرے حضرات نے ولایت اور حکومت حاصل کرنے کے معنی میں۔ یعنی اگر کسی دن حکومت تمہارے ہاتھ آ جائے تو تم زمین میں فساد بر پا کر دو، لوگوں کا خون بہا دو اور قطع رحمی سے کام لینے لگو۔[1] اسی لیے حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں آیا ہے کہ ’’یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے‘‘[2] جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی، نہ تو چھوٹوں پر رحم کیا اور نہ ہی بڑوں پر۔ حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی خاک وخون میں غلطاں کر دیا۔

لیکن ’’تولی‘‘، خواہ جہاد سے روگردانی کے معنی میں ہو خواہ منصب حکومت کو پانے اور ظلم وفساد کے ارتکاب کے معنی میں، ہماری بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں حالتوں میں ثابت ہوتا ہے کہ ’’گناہ، دلوں کے پردے ہیں۔‘‘

تیسری آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ لوگوں کے وارث ٹھہرے ہیں لیکن ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے ’’اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کے گناہوں کی بدولت سزا دیں اور عذاب میں مبتلا کر دیں، ان کے دلوں پر مہر لگا دیں اور انکے سننے والے کان ان سے لے لیں۔‘‘

گناہوں کی سزا کے ساتھ دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان گہرا رابطہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں ان دو عذابوں میں سے کسی ایک میں مبتلا کر دیں گے۔ گناہوں کی وجہ سے ہم یا تو انہیں تباہ وبرباد کر دیں گے یا پھر انہیں زندہ رکھ کر ان کے حق وباطل کی تشخیص کی حس سلب کر لیں گے اور یہ ایسی سزا ہے جو تباہی وبربادی اور خدا کے دوسرے عذابوں سے زیادہ دردناک ہے۔

لیکن اگر ’’اصبناھم‘‘ جو کہ فعل ماضی کی صورت میں ہے اور ’’نطبع علی قلوبھم‘‘ جو فعل مضارع کی صورت میں ہے، پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرا جملہ ایک مستقبل حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پہلے جملے پر عطف نہیں ہے۔ تو پھر ایسی صورت آیت کا معنی یہ ہوگا ’’ہم

---

[1] تفسیر روح المعانی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیزان، انہی آیات کی بحث میں دونوں تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۴۰ حدیث ۵۹

ہر حالت میں ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے اور ان پر حجاب ڈال دیں گے“ (خواہ ان کو عذاب دینے میں جلدی کریں یا نہ کریں)۔[1]

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت میں ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے ”آخر کار انہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا“ جو کہ کفر کا بالاترین مرحلہ ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ گناہ کوڑھ کی بیماری کی طرح انسان کی جان لے لیتا ہے اور اس کے ایمان کو بالتدریج برباد کر دیتا ہے، اس کے دل و جان پر پردے ڈال دیتا ہے اور اسے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے، وہ صرف ایمان ہی نہیں لاتا بلکہ اپنے کفر پر فخر بھی کرتا ہے۔ تاریخ اس قسم کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ قرآن مجید کی مختلف آیات گناہوں اور معاصی کو معرفت کا ایک بڑا مانع بتلاتی ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو درک کی جا سکتی ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے قابل لمس ہے اور وہ اس کا تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی گناہ ان سے سرزد ہوتا ہے تو ان کے دل میں ایک خاص قسم کی تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس نیکی اور تقویٰ کی طرف رجحان کے وقت وہ ایک قسم کی روشنی اور معرفت کے لیے بہتر آمادگی محسوس کرتے ہیں۔

تشریح

روایات کی رو سے گناہ کا حجاب ہونا

یہ حقیقت وسیع طور پر اسلامی روایات میں توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جن میں سے چند ایک روایات کو بطور نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں:

۱۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے:

”ان العبد اذا اخطاء خطیئة نکتت فی قلبه نکتة سودآء فاذاهو نزع و استغفر الله و تاب صقل قلبه فان اعاد زید فیها حتی تعلو علی قلبه، و هو الران (الرین) الذی ذکر الله فی کتابه، کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون“

”جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ ظاہر ہو جاتا ہے، اگر تو اس نے اس گناہ سے

---

[1] یہ تفسیر ایک احتمال کی صورت میں انہی آیات کی تفسیر کے ضمن میں فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر میں بیان ہوئی ہے، جبکہ تفسیر المیزان میں اس جملہ کو ”اصبنا“ پر عطف کیا گیا ہے جس کا مستقبل کا معنی کیا گیا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

رکنے کا قصد کرلیا اورتوبہ کرلی تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور نقطہ مٹ جاتا ہے۔لیکن اگر اس نے پھر اس کا ارتکاب کیا تو وہ سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور بار بار کے گناہوں سے اس کا تمام دل سیاہ ہوجاتا ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کے متعلق خداوند عالم نے اپنی کتاب میں یہ فرمایا ہے: "کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔" [1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"کان ابی یقول ما من شیء افسد للقلب من خطیئة ان القلب لیواقع الخطیئة فما تزال به حتی تغلب علیه فیصیر اعلاہ اسفله"

''میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ گناہوں سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں جو دل کو فاسد کر دیتی ہو۔دل گناہوں کا اثر قبول کرتا ہے اور گناہ اس میں تدریجی طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ایک نہ ایک دن اس پر غالب آجاتے ہیں۔اس وقت دل الٹا ہوجاتا ہے اور اس کے اوپر کا حصہ نیچے آجاتا ہے۔'' [2]

ظاہری بات ہے کہ قلب کے الٹا ہونے سے مراد انسان کی حس تشخیص کی دگرگونی ہے،یعنی انسان گناہوں سے اس قدر مانوس ہوجاتا ہے کہ اس کے نزدیک اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں اور برائیاں اچھائیوں میں تبدیل ہوجاتی ہے اور یہ انسانی زندگی کا زبردست خطرناک مرحلہ ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ہی سے روایت ہے:

"اذا اذنب الرجل خرج فی قلبه نکتة سودآء فان تاب انمحت، وان زاد زادت حتی تغلب علی قلبه فلا یفلح بعدھا ابدا"

''جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔اگر تو وہ توبہ کرلے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر گناہ میں اضافہ کرتا ہے تو اس کے تمام دل کو گھیر لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ہرگز نجات نہیں پاسکتا۔'' [3]

واضح ہے کہ نجات اور فلاح کی سب سے پہلی شرط حقائق کا ادراک ہے۔جس شخص کا قلب یعنی اس کی عقل بیکار ہوجائے تو وہ کیونکر

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۷۰۵۰۔روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۳۔تفسیر فخر رازی جلد ۳۱ ص ۹۴

[2] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱

[3] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱۳

سعادت منداور کامیاب ہوسکتا ہے؟

یہی مفہوم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوا ہے جو آنجنابؑ سے "کلا بل ران علی قلوبھم..." کی تفسیر کے سلسلے میں منقول ہے۔ اس میں دونقطوں کا ذکر ایک سفید نقطہ اور ایک سیاہ نقطہ، یعنی گناہ کی وجہ سے سیاہ نقطہ، سفید نقطہ پر غالب آ جاتا ہے اور اسے ڈھانپ دیتا ہے۔[۱]

۴۔ ایک اور حدیث میں سرکاری رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"کثیرۃ الذنوب مفسدۃ للقلب"

''گناہوں کی کثرت انسان کے قلب (عقل) کو تباہ وبرباد کردیتی ہے۔''[۲]

۵۔ کتاب الخصال میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"اربع خصال یمتن اقلب، الذنب علی الذنب......"

''چار ایسی خصلتیں ہیں جو دل کو مردہ کردیتی ہیں: ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ............''[۳]

اسی لیے دل پر چھا جانیوالے گناہوں کے آثار کو دور کرنے کے لیے توبہ کے علاوہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ دینی راہنماؤں کے فرامین کا مطالعہ کیا جائے جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تذاکروا وتلاقوا وتحدثوا فان الحدیث جلاء للقلوب، ان القلوب لترین کما یرین السیف، وجلائه الحدیث"

''ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کیا کرو، اپنے دینی بھائیوں سے ملاقات کیا کرو اور (دینی رہنماؤں کی) حدیثوں کو بیان کیا کرو، کیونکہ حدیث دلوں کو جلا عطا کرتی ہے، اس لیے کہ جس طرح تلوار پر زنگ چڑھ جاتا ہے اسی طرح دلوں پر زنگ بیٹھ جاتا ہے، جس کو حدیث ہی صیقل کرتی ہے۔''[۴]

۶۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک خطبے کے ضمن میں ان لوگوں کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو دل کے مریض ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:

---

[۱] ایضاً۔ حدیث ۲۰۔ مجمع البحرین میں ''رین'' کا مادہ بھی اسی چیز کو بیان کررہا ہے

[۲] تفسیر درمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶

[۳] الخصال جلد ۱ ص ۲۵۲ حدیث ۱۲۵ اسی سے ملتی جلتی روایت درمنثور جلد ۶ ص ۳۲۶ میں بھی ہے۔

[۴] نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۳۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۳

"قد خرقت الشهوات عقله و اماتت الدنيا قلبه وولهت عليها نفسه فهو عبدلها"

"خواہشات نفسانی نے اس کی عقل کو پھاڑ دیا ہے، دنیا نے اس کے دل کو مردہ کردہ کر دیا ہے اور اس کا نفس والہانہ طور پر دنیا کا دلدادہ ہو گیا ہے اور وہ اس (دنیا) کا غلام بن چکا ہے۔"[1]

۷ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"اذا اظهر العلم و احترز العمل وائتلفت الالسن واختلف القلوب و تقاطعت الاحرام هنالك لعنهم الله فاصمهم و اعمى ابصارهم"

"جب علم واضح طور پر آشکار ہو جائے گا اور عمل سے کنارہ کشی کی جائے گی، زبانیں متحد لیکن دلوں میں اختلاف ہوگا، رشتہ داروں سے قطع رحمی کی جائے گی، تو اس وقت خداوند عالم انہیں لعنت کرے گا اور اندھا اور بہرا بنا دے گا۔"[2]

۸ اس چیز کی بعض گناہوں کے بارے میں مزید وضاحت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں جو جہاد کو ترک کرتے ہیں:

"البسه الله ثوب الذل... وضرب على قلبه بالاسهاب واديل الحق منه تبضيع الجهاد"

"خداوند عالم ان کے بدن پر ذلت کا لباس پہنائے گا اور ان کی عقل وفہم تباہ ہو جائے گی اور جہاد کو ضائع کر دینے کے سبب ان کا حق پامال کر دیا جائے گا۔"[3]

---

[1] نہج البلاغۃ، خطبہ ۱۰۳

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۱ حدیث ۶۳

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

۱۲۔ کفر اور روگردانی کا حجاب

سب سے پہلے ان آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ (سورہ اعراف ۱۰۱)

(۲) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ (سورہ نساء ۱۵۵)

(۳) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ (سورہ کہف ۵۷)

(۴) ...... وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ (سورہ فصلت ۴۴)

ترجمہ

(۱) یہ ایسی آبادیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں وہ (اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ) ان کے پاس خدا کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن جن چیزوں کی وہ پہلے سے تکذیب کر چکے تھے وہ ان پر ایمان نہیں لائے، خداوند عالم اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے (اور ہٹ دھرمی اور گناہ سے اصراران سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔

(۲) چونکہ انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور خدائی آیات کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور مذاق کے طور پر کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں (اور ہم انبیاء کی بات کو درک نہیں کر سکتے، اسی لیے درگاہ الٰہی سے دھتکارے گئے ہیں)۔ جی ہاں! خدا نے ان کے کفر ہی کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اسی لیے چند ایک لوگوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہیں لاتے۔

(۳) اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوسکتا ہے جو پروردگار کی آیات کی یاددہانی کے وقت ان سے روگردانی کرتا ہے اور جو گناہ انجام دے چکا ہے، انہیں فراموش کر چکا ہے۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں سنگینی ڈال دی ہے (تا کہ حق کی آواز کو نہ سن سکیں) لہٰذا اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تب بھی وہ ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۴) ....لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے اور وہ اس حد تک غلطی پر ہیں گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں، (حق کی بات کو نہیں سنتے) ان لوگوں کی مانند ہیں جنہیں دور سے بلایا جائے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

گناہ کیونکر حجاب بن جاتا ہے؟

سب سے پہلی آیت میں پہلے تو گذشتہ اقوام کے پانچ گروہوں (قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط اور قوم شعیب) کی سرگزشت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ قومیں آیات الٰہی کی تکذیب کی وجہ سے خدائی عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ''یہ وہ قومیں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ یہ ایسی قومیں نہیں تھیں کہ جن پر اتمام حجت نہ ہوچکی ہو، بلکہ انبیاء الٰہی روشن دلائل لے کر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر اپنے کفر اور تکذیب پر اصرار جاری رکھا اور کفر پر ان کا یہ اصرار اس بات کا سبب بن گیا کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور تشخیص کی حس ان سے سلب کر لے۔''

''و کذالك يطبع الله علی قلوب الکافرين'' (اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے) کا جملہ ہر کافر کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے حق طلب افراد ایسے ہیں جو انبیاء کرام کی دعوت کو سننے سے پہلے کافر تھے، بعد میں مومنین کی صفوں سے آ ملے۔ لہٰذا اس سے مراد ایسے کافر ہیں جو اپنے کفر پر اصرار کرتے ہیں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں اور یہی کفر ان کے درک و دید سے مانع ہوتا ہے۔ اس بات کی دلیل یہ جملہ ہے ''فما کانوا ليؤمنوا بما کذبوا به من قبل''، کیونکہ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ''جن چیزوں کی یہ پہلے تکذیب کر چکے ہیں اس پر ایمان نہیں لائیں گے'' یعنی وہ اس قدر متعصب ہیں کہ قطعاً اپنی روش کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ ہی باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف

پلٹنے کے لیے تیار ہیں۔تفسیر المیز ان میں اورفخر رازی کی تفسیر میں ہر ایک نے اس کے پانچ پانچ معانی ذکر کیے ہیں۔[۱] لیکن بظاہر اس کا مفہوم وہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی خلاف ورزیوں اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ ان کی دشمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے

''ہم نے بوجہ ان کی پیمان شکنی، خدائی آیات سے انکار اور انبیاء کے قتل کے ان پر لعنت کی ہے اور ان سے اپنی رحمت کو دور رکھا ہے۔اسی طرح ان کے آیات الٰہی کے مذاق اڑانے کی وجہ سے بھی جب وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اور (اے موسیٰ) ہم تمہاری کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔''

قرآن کہتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے اور یہ اس لیے ہے کہ خدا نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں پر کفر سے مراد وہ کفر ہے جس کے ساتھ ہٹ دھرمی ملی ہوتی ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ انبیاء کے بارے میں دشمنی اور عناد ملا ہوتا ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ مسلسل عہد شکنی اور آیات الٰہی کا مذاق ملا ہوتا ہے۔مسلم بات ہے کہ ایسا کفر ہی حجاب ہوتا ہے اور حجاب بھی ایسا سخت جو انسان کو حقائق کے درک کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ وہ چیز ہے جسے خود ان لوگوں نے اپنے لیے پسند کیا ہے اور جس کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ ''قلوبنا غلف'' (ہمارے دل غلاف میں ہیں) کے جملہ سے ان کی مراد آیات الٰہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استہزاء اور مذاق اڑانا ہے، نہ یہ کہ وہ اپنے لیے واقعی اسی طرح کا عقیدہ رکھتے تھے، نہ ہی اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ہم اس طرح پیدا کیے گئے ہیں کہ کسی حقیقت کو درک نہ کریں۔(جیسا کہ بعض مفسروں نے یہی کچھ لکھا ہے)۔[۲] لیکن خدا نے ان کی ان باتوں کو حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے اور انہیں کہا ہے: ''جی ہاں! خدا نے تمہارے دلوں پر تمہارے کفر و ہٹ دھرمی کی وجہ سے مہر لگا دی ہے اور تم کچھ نہیں سمجھتے۔''

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہمارے دل ایسے ظروف ہیں جو علم و دانش سے لبریز ہیں۔جس طرح تلوار نیام میں ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی علم و دانش سے سیر ہو چکے ہیں۔اب ہمیں کسی اور علم و دانش کی ضرورت نہیں ہے۔[۳] لیکن یہ احتمال بھی بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح سے آیت کی تفسیر میں تین احتمال مذکور ہیں جن میں سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔بعض تفاسیر میں اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے جو نہایت ہی بامقصد اور پرمعنی ہے۔فرماتے ہیں:

---

[۱] تفسیر المیز ان، جلد ۸ ص ۲۱۵ و تفسیر فخر رازی، جلد ۱۴ ص ۱۸۶

[۲] تفسیر المیز ان، جلد ۵، ص ۱۳۸ اور تفسیر قرطبی، جلد ۳، ص ۲۰۰۴

[۳] یہ احتمال تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۱، ص ۸۷، تفسیر قرطبی، جلد ۳، ص ۲۰۰۴ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۶ ص ۸ میں ذکر ہوا ہے۔

"الطباع معلق بقائمة العرش فاذا انتهکت الحرمة و عمل بالمعاصی و اجتری علی الله تعالی بعث الله تعالیٰ الطابع فطبع علی قلبه فلا یعقل بعد ذالك شیاء"

''خداوند عالم کی مہر ستون عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ جب کسی قسم کی ہتک حرمت ہوتی ہے، یا گناہوں پر عمل ہوتا ہے، یا خدا کے مقابلے میں جرأت اور دیدہ دلیری سے کام لیا جاتا ہے تو خداوند عالم مہر لگانے والے کو بھیج دیتے ہیں کہ وہ اس مہر کے ساتھ اس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور وہ اس کے بعد کسی چیز کا ادراک نہیں کر پاتا۔''[1]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''طابع'' (بروزن قابل) کے معنی ہیں مہر لگانے والا اور ''طابَع'' (بروزن آمد) کے معنی ہیں خود مہر اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں پہلا لفظ ''باء کی زبر'' اور دوسرا لفظ ''باء کی زیر'' کے ساتھ ہے۔

یہ حدیث ایک بار پھر اس حقیقت کو واضح طور پر ثابت کر رہی ہے کہ اس موضوع میں ''جبر'' کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے بلکہ دل کے حجاب، خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اسی سلسلے کی تیسری آیت میں تقریری استفہام کی صورت میں فرماتا ہے ''آیا اس شخص سے بڑھ کر کوئی اور بھی ظالم ہوسکتا ہے جو خدا کی آیات کو سن کر روگردانی کرتا ہے اور اپنے گناہوں کو فراموش کر دیتا ہے؟ ایسے فراموش کرنے والے ہٹ دھرم قسم کے لوگ جو اپنے کفر، انکار اور تکذیب پر اصرار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ایمان کے فیض وسعادت سے محروم ہو جائیں۔ ہم ان کے کانوں کو حق کی آواز سننے سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس طرف کو بھی بلائے جائیں ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔''

اور یہ کہ قرآن نے ایسے لوگوں کو ظالم ترین لوگ کہا ہے، جس کی دلیل واضح ہے، کیونکہ ایسے لوگ خود پر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسرے افراد پر بھی اور ساتھ ہی وہ خداوند متعال اور اس کے دین کے معاملے میں بھی ظالم ہیں۔ بنابریں مذکورہ آیت نہ صرف جبر پر ہی دلالت نہیں کرتی بلکہ اختیار پر بھی دلالت کر رہی ہے۔

ایک اور دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ فخر رازی جو خود بھی مسلک جبر کے حامی ہیں، جب اس آیت پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ''اس آیت کی انتہا ''جبر'' کے حامیوں کے لیے دلیل ہے جبکہ اس کی ابتداء اختیار کے حامیوں کے لیے'' پھر کہتے ہیں ''ہمیں قرآن میں بہت کم ہی کوئی ایسی آیت ملے گی جو ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے حق میں ہو مگر یہ کہ اس کے ساتھ ہی ایک اور آیت ہے جو دوسرے گروہ کے حق میں ہے اور تجربہ ہماری گفتار کی صداقت کا گواہ ہے اور خدا کی طرف سے یہ بندوں کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے تاکہ خداوند عالم اس طرح سے علمائے

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۶ ص ۸

راسخون فی العلم کو مقلدین سے ممتاز کرے۔"[1] کیسا عجیب اعتراف ہے۔

ہمیں فخر رازی صاحب کی گفتگو پر جس چیز کا اضافہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو ایک دوسری سے جدا کر کے قطعاً زیر توجہ نہیں لانا چاہئے، چہ جائیکہ ایک آیت کے ابتدائی حصے کو اس کے انتہائی حصے سے جدا کر کے!! اور اگر ہم اس آیت کی ابتداء اور انتہا کو باہم ملا کر توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعی طور پر تاکید ہے "اختیار" کے مسئلہ کی۔ کیونکہ آیت کا آغاز کہتا ہے کہ آیات الٰہی سے روگردانی اور گناہوں کی بجا آوری خود انسان کا فعل ہے اور انسان ہی اپنے افعال کا باختیار فاعل ہے، جبکہ آیت کی انتہا کہتی ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کو سزا دیتا ہے جو اسی موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں اور خدا کی سزا ان کے دلوں پر پردہ ڈالنا ہے۔

بالفاظ دیگر خداوند عالم نے ان گناہوں میں ایسا اثر پیدا کر دیا ہے کہ وہ دل کی شفافیت اور تصفیہ کو ختم کر دیتے ہیں اور انسان سے تشخیص کی قدرت سلب کر لیتے ہیں۔ تو یہ چیز جبر کی دلیل کہاں سے بن گئی؟ یعنی اگر زہر ایک قاتل چیز ہے اور انسان جان بوجھ کر اسے استعمال کرتا ہے تو وہ جو اثر دکھائے گی کیا اس کے اثر کو جبر سے موسوم کریں گے؟

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں بہانہ جو اور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کبھی کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ قرآن عجمی زبان میں نازل کیوں نہیں ہوا تا کہ ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ کا قائل ہونا پڑے اور اس کا فائدہ صرف عربوں ہی کے لیے نہ ہو۔ (شاید ان کی غرض یہ ہو کہ عوام الناس اس سے کچھ نہ سمجھ سکیں اور اس کی طرف رغبت نہ کر سکیں)۔

قرآن مجید آیت کے آغاز میں ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے "**ولو جعلناہ قرانا اعجمیا لقالوا لولا فصلت آیات**" یعنی اگر ہم قرآن کو عجمی بناتے تو یقیناوہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں ہیں؟ اور پھر کہتے "**اعجمی و عربی**" یعنی آیا عجمی قرآن عربی پیغمبر (سے ٹھیک بات ہے)؟!

پھر خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے" کہہ دیجئے کہ یہ ان لوگوں کے لیے شفا اور ہدایت کا موجب ہے جو ایمان لاتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم افراد جو ایمان نہ لانے پر اصرار کرتے ہیں ان کے کانوں میں سنگینی ہے اور وہ حق کو نہیں سنتے، گویا انہی دور دراز سے پکارا جاتا ہے لیکن وہ صرف آواز کے زمرے کو ہی سنتے ہیں اور کوئی مطلب انہیں حاصل نہیں ہوتا۔"

یہ آیت بھی بخوبی واضح کر رہی ہے کہ بہانہ تراشی، ہٹ دھرمی اور کفر پر اصرار انسان کے دل کے کانوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اس

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۱، ص ۱۴۲۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب "آلوسی" نے اپنی تفسیر "روح المعانی" میں اس جملے کو نقل کیا ہے تو لکھا ہے کہ فخر رازی کہتے ہیں یہ آیت عقیدہ جبر کے قائل لوگوں کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے اور اس سے پہلی آیت عقیدہ اختیار کے قائل حضرات کے لیے دلیل ہے۔ تفسیر المیزان میں بھی یہی چیز تفسیر روح المعانی سے نقل کی گئی ہے جبکہ خود فخر رازی کہتے ہیں کہ ایک آیت کی ابتداء اور انتہا۔ (خوب غور کیجیے گا)۔

سے دل کی بینائی کو سلب کر لیتے ہیں۔[1]

۱۳۔ تجاوز اور سرکشی کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ۝۷۴

(یونس ۷۴)

ترجمہ

(۱) پھر ہم نے اس کے (نوحؑ کے) بعد کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ واضح دلائل لے کر ان کے پاس آ گئے، لیکن وہ جس چیز کی اس سے پہلے تکذیب کر چکے تھے اس پر ایمان نہ لائے، ہم اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

آیت کی تفسیر اور اس کا نتیجہ

سورہ یونس میں اس آیت سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں تبلیغ و ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے، لیکن اس قوم نے ان کو جھٹلایا اور خداوند قدیر نے اس سرکش قوم کو طوفان کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور جو مومنین جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے، انہیں کشتی کے ذریعہ نجات دی اور زمین کا وارث ٹھہرایا۔

اس کے بعد فرماتا ہے ''نوحؑ کے بعد ہم نے کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، ہر رسول اپنی قوم کی طرف آیا اور معجزات،

---

[1] ''وھو علیھم عمی'' کے بعض مفسرین نے یہ معنی کیے ہیں کہ ''قرآن اس گروہ کی نابینائی کا سبب بن جاتا ہے'' جبکہ ''لسان العرب'' میں ''ابن منظور'' نے اور ''مفردات'' میں ''راغب'' نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ ''عمی علیہ'' کا معنی ''اشتبه علیه حتی صاء کالا عمی'' ہے یعنی مطلب ان پر اس طرح مشتبہ ہو چکا ہے گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

روشن اور منطقی دلائل اور وہ دین جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے، اس کے پاس لایا۔لیکن قوم نے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ تکذیب پر بھی ڈٹے رہے۔“

آیت کے آخر میں جو ہماری بات کا شاہد ہے فرماتا ہے ”اسی طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں“ (كذالك نطبع على قلوب المعتدين)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حد سے تجاوز اور سرکشی دل پر پردے ڈال دیتی ہے اور ساتھ ہی مہر بھی لگا دیتی ہے۔یعنی انسان جس قدر بھی آیات الٰہی کو دیکھتا ہے حق کو باطل سے جدا نہیں کرسکتا۔

خدا کی یہ مہر جو اس سرکش قوم کے دلوں پر لگتی ہے ممکن ہے خدائی سزا کی حامل بھی ہو اور تجاوز کے آثار میں سے کسی ایک اثر کی حامل بھی اور یہاں پر تجاوز سے مراد حق سے سرکشی اور عصیان و گناہ اور رسولوں سے دشمنی کا تسلسل ہے۔

”فما كانوا ليومنوا بما كذبوا“ (وہ لوگ اس سے پہلے جس چیز کو جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان نہیں لائیں گے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے پہلے کچھ انبیاء ان لوگوں کے پاس آئے، لیکن ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا۔ پھر کچھ اور انبیاء ان کے پاس آئے اور واضح دلائل بھی اپنے ساتھ لائے، پھر بھی ان پر ایمان نہ لائے اور یہ اس لیے ہے کیونکہ عناد اور ہٹ دھرمی نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جھٹلانے والوں سے مراد وہی قوم نوح ہی ہے جو طوفان میں ہلاک ہوگئی تھی اور ان لوگوں سے مراد جو ایمان نہیں لائے وہ لوگ ہیں جو اس ہلاک شدہ قوم کے بعد پیدا ہوئے لیکن نوح علیہ السلام کی سرکش قوم کے نقش قدم پر چلے۔[1]

(لیکن اس تفسیر سے یہ لازم آتا ہے کہ ”كذبوا“ اور ”ليومنوا“ میں ضمیر کے مرجع مختلف ہوں اور یہ بعید معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں بہتر تفسیر وہی پہلی تفسیر ہی ہے)۔

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو نوح علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئیں اور ان کے سامنے گزشتہ انبیاء کی دعوت کے حقائق بیان کیے گئے لیکن انہوں نے ان حقائق کو جھٹلا دیا، پھر انبیاء کرام علیہم السلام واضح معجزے اور دلائل لے کر آئے۔ پھر بھی انہوں نے انہیں جھٹلایا تو گویا پہلی تکذیب کا تعلق ان چیزوں کے ساتھ ہے جو بیان کی صورت میں ان تک پہنچیں اور دوسری تکذیب کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے بذات خود انبیاء علیہم السلام سے دیکھیں۔[2]

یہ تفسیر بھی مناسب معلوم ہوتی ہے اور دونوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی بعید نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵ ص ۱۲۵

[2] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۱ ص ۱۴۳

۱۴۔ سطحی نگاہ اور تدبر سے کام نہ لینے کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَيَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَيۡرِ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ⑪ (سورہ بنی اسرائیل ۱۱)

(۲) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰى قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا ㉔ (سورہ محمد ۲۴)

ترجمہ

(۱) اور انسان (اپنی جلد بازی کی وجہ سے) برائیوں کی طرف جاتا ہے جبکہ وہ نیکیوں کو طلب کر رہا ہوتا ہے۔

(۲) آیا وہ لوگ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں کافروں کی بے ایمانی کی اہم علتوں میں سے ایک علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو امور میں اچھی طرح مطالعہ نہ کرنے اور پوری طرح غور وفکر اور سوچ بچار سے کام نہ لینے کی وجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''وہ لوگ جلد بازی اور عجلت کے ساتھ سوچے سمجھے اور معاملات میں غور وفکر کیے بغیر برائیوں کے پیچھے ایسے دوڑتے رہتے جیسے اچھائیوں اور سعادتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ ہلاکتوں اور تباہیوں کی جانب ایسے لپکتے ہیں جیسے کسی امن وامان کی جگہ جار ہے ہوں، ننگ اور ذلت کے مقامات کی جانب یوں پیشقدمی کرتے ہیں جیسے قابل فخر جگہ کی طرف جارہے ہوں۔''

یعنی جلد بازی، سطحی مطالعہ اور غور وفکر سے کام نہ لینے نے ان کے دلوں اور ادراک وبصیرت پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ بدی کو نیکی اور شقاوت کو سعادت اور گمراہی کو صراط مستقیم سمجھنے لگے ہیں۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ انسان کے جلد باز ہونے سے یہ مراد ہے کہ جب بھی وہ کسی چیز کو طلب کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے آرام اور سکون کے ساتھ نہیں جاتا اور اس کے نفع ونقصان کے پہلوؤں پر اچھی طرح غور وفکر نہیں کرتا تا کہ خیر کے تمام پہلو اس کے سامنے آجائیں اور وہ اسے حاصل کرے۔ بلکہ جونہی کسی چیز نے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا، بغیر سوچے سمجھے، اس کے پیچھے لگ گیا اور اکثر اوقات ایسا ہوتا

ہے کہ وہ چیز اس کے لیے شر ہی شر ہوتی ہے اور اس سے اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ جلد باز انسان خیر اور شر کے درمیان فرق پیدا نہیں کر سکتا اور باطل کے پیچھے ایسے دوڑتا جیسے وہ حق کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔[1]

یہاں پر "یدع" (پکارتا ہے) سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر قسم کی طلب ہے، خواہ دعا کے لفظ کے ساتھ ہو یعنی خدا سے طلب کرے یا عملی طور پر اس کے پیچھے جائے کیونکہ ان سب کو دعا کہا جاتا ہے۔[2]

لیکن بعض تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی مشہور معنی دعا کرنا اور خدا سے درخواست کرنا ہے۔ اسی لیے تو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ آیت عرب کے مشہور مشرکین میں سے ایک مشرک "نضر بن حارث" کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اس نے یہ کہا تھا "اللھم ان کان ھذا ھو الحق فامطر علینا حجارۃ من السماء" (بار الہا! محمدؐ جو کچھ کہتا ہے اگر ہو حق ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو آسمان سے ہمارے سروں پر پتھر برسا) (انفال ۳۲)۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔[3]

مرحوم طبرسی نے بھی مجمع البیان میں دونوں تفسیروں کو ذکر کیا ہے اور ظاہری طور پر آیت کا مفہوم وسیع ہے اور دونوں تفسیروں کو شامل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"واعرف طریق نجاتك و هلاكك، کیلا تدعوا الله بشی فیه هلاكك وان تظن ان فیه نجاتك، قال الله تعالی و یدع الانسان بالشر دعائه بالخیر و كان الانسان عجولا"

"تو اپنی نجات اور ہلاکت کو (اچھی طرح اور مکمل طور پر) جان لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا سے ایسی چیز طلب کرے جس میں تیری ہلاکت ہو، جبکہ تو یہ سمجھتا ہوگا کہ وہ تیری نجات کا ذریعہ ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے: انسان شر کو بھی اسی طرح مانگتا ہے جس طرح خیر کو طلب کرتا ہے اور انسان جلد باز ہی ہے۔"[4]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس طرح نصیحت کی:

---

[1] المیزان جلد ۱۳، ص ۵۱ (اختصار کے ساتھ)

[2] المیزان، جلد ۱۳ ص ۵۰ (چونکہ "بالشر" اور "بالخیر" میں "باء" صلہ کی ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا "یدع الشر کہ عائہ الخیر" یعنی وہ شر بھی خیر کی طرح طلب کرتا ہے)۔

[3] تفسیر قرطبی، جلد ۶ ص ۳۸۴۱ اور تفسیر رازی، جلد ۲۰، ص ۱۶۲

[4] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۱۴۱

"کل عمل تریدن ان تعملوا فقفوا له ساعة فانی لو قفت ساعة لم یکن اصابنی ما اصابنی"

''جس کام کو تم انجام دینا چاہو تو ایک ساعت اس کے بارے میں سوچ بچار سے کام لے لیا کرو، کیونکہ اگر میں ایک ساعت غور و تامل سے کام لیتا تو جس مصیبت میں گرفتار ہوا، گرفتار نہ ہوتا۔''[1]

اسی لیے عربوں میں مشہور ہے "العجلة ام الندامات" (جلد بازی تمام پشیمانیوں کی ماں (جڑ) ہے)۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے:

''جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے مگر چھ امور میں ۱۔نماز کی ادائیگی میں جب اس کا وقت داخل ہو جائے۔ ۲۔میت کی تدفین میں جب سب لوگ پہنچ جائیں۔ ۳۔دوشیزہ کی تزویج میں جب وہ بالغ ہو جائے۔ ۴۔قرض کی ادائیگی جب اس کا وقت آن پہنچے۔ ۵۔مہمان کو کھانا کھلانا جب وہ گھر آجائے اور ۶۔توبہ میں جلدی جب گناہ سرزد ہو جائے۔''[2]

اس آیت کا ایک جملہ ہے "وکان الانسان عجولا" اور اسی طرح قرآن پاک کی دوسری آیات میں جن سے انسان کے نہایت ہی کمزور نقاط کی نشاندہی کی گئی ہے، سے کیا مراد ہے اور کون لوگ؟ ہم تفسیر نمونہ میں بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد ایسے انسان ہیں جو خدائی تربیت کرنے والوں کی تربیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور خود رو صورت میں سر نکالے ہوتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو مہذب اور تربیت یافتہ ہیں۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں ہٹ دھرم منافقین کے اس گروہ کا تذکرہ ہے جنہیں اس سے پہلی آیات میں دل کے اندھے اور نابینا افراد کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ حکومت تک رسائی حاصل کرلیں تو کسی رحم نہ کریں اور یہی لوگ راندہ درگاہ الٰہی ہیں۔

پھر اس آیت میں فرماتا ہے ''آیا ایسے لوگ قرآنی آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے تاکہ حقیقت کو دریافت کرلیں؟ یا ان کے دلوں پر قفل لگائے جا چکے ہیں؟ ایک نہیں کئی تالے! اور ایسے تالوں کے ہوتے ہوئے وہ حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں؟''

اس مقام پر "ام" متصلہ ہے یا منقطعہ، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔[3] اگر متصلہ ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ''آیا وہ قرآنی آیات میں غور و فکر نہیں کر پاتے یا ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں' اور اگر منقطعہ ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ''آیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، نہ بلکہ ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں۔''

اور ہر صورت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ''تدبر'' (غور و فکر کرنے) اور ''دلوں پر حجاب'' کے درمیان ایک تضاد موجود ہے اور اسے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۴۱

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۵ ص ۱۳۷

[3] آلوسی روح المعانی میں سیبویہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''ام'' متصلہ ہے اور ''ابو حیان'' اور دوسرے اہل علم سے منقول ہے کہ منقطعہ ہے۔ جلد ۲۶ ص ۶۷

’’غور وفکر کے ترک کرنے کے حجاب‘‘ کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر ’’فی ظلال القرآن‘‘ میں مذکور ہے کہ اس آیت کے مطابق قرآن مجید میں غور وفکر سے کام لینے سے دلوں پر سے پردے اٹھ جاتے ہیں، دل کے دریچے باز ہوتے ہیں، نورِ معرفت دل پر جاری ہوتا ہے، افکار حرکت میں آجاتے ہیں، عقول میں جوش وخروش پیدا ہوتا ہے، باطن میں خلوص آجاتا ہے اور روح زندہ، روشن اور منور ہوجاتی ہے۔[1]

اس آیت میں ’’قلوب‘‘ کو نکرہ کی صورت میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس کی دو دلیلیں ہوسکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ ان کے دلوں کی وحشتناک کیفیت کو واضح طور پر بیان کرے کہ وہ غیر معروف، ان جانے، شقاوت بھرے اور تاریک و ظلمانی ہیں۔

دوسری یہ کہ اس سے ان میں سے کچھ لوگ کے دل مراد ہیں نہ کہ سب لوگوں کے، کیونکہ ان سب کے قلوب ابھی تک ایسے مرحلے تک نہیں پہنچے کہ ان کا ادراک اور بصارت مکمل طور پر ختم ہوچکے ہوں اور ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہوں۔

’’اقفال‘‘ کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گونا گوں حجاب ہیں جو ان کے دلوں پر پڑ چکے ہیں، مثلاً نفاق، عناد، ہٹ دھرمی، خودخواہی اور غرور وغیرہ۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ’’غور وفکر کا ترک کرنا‘‘ اور ’’دلوں کا حجاب‘‘ ایک دوسرے پر تقابلی اثر ڈالتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نسبت ایک مرحلہ پر علت اور دوسرے مرحلہ پر معلول واقع ہوسکتے ہیں۔ کبھی ترک تدبر دلوں کی تاریکی کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی دلوں کی تاریکی ترک تدبر کا سبب بن جاتی ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

’’قرآن کے قاری تین طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو اسے پڑھتے ہیں اور اپنا سرمایہ قرار دے کر اس کے ذریعہ سے بادشاہوں کو دوہتے (یعنی ان سے دولت اینٹھنے کی تگ ودو میں لگے رہتے) ہیں، اور اسے لوگوں پر اپنی برتری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہیں اور صرف اس کے الفاظ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی حدود کو ضائع کردیتے ہیں اور اس طرح سے وہ کبھی بھی اپنے مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ خداوند عالم حاملین قرآن میں ایسے لوگوں کو کبھی زیادہ نہ کرے۔

تیسرے وہ ہیں جو قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور اس کی دوا کو اپنے دلوں کے درد پر رکھتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ شب بیداری کرتے ہیں (عبادت میں مصروف رہتے ہیں)، دن کو پیاسے رہتے ہیں (روزہ رکھتے ہیں)، اسی کے ذریعہ اپنی مسجدوں میں قیام کرتے ہیں اور اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خداوند عزیز وجبار ایسے لوگوں کے ذریعہ بلاؤں کو دور کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر حملے کرتا

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۷، ص ۴۶۲

ہے، انہی کی وجہ سے آسمان سے بارش نازل کرتا ہے۔ لیکن "فو اللہ لھولاء فی قراء القرآن اعزمن الکبریت الاحم"، خدا کی قسم! اس قسم کے قاری قرآن کبریت امر (سرخ گندھک) سے بھی زیادہ کمیاب ہیں۔"[1]

۱۵۔ ارتداد کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل وجان سے سماعت فرمائیں۔

آیات

(۱) اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲﴾ (سورہ منافقون ۲)

(۲) ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۳﴾ (سورہ منافقون ۳)

ترجمہ

(۱) ان (منافق) لوگوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکے رکھیں۔ یہ بہت ہی برا کام کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس لیے ہے کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ اسی لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آیات کی تفسیر اور تشریح

یہ آیات منافقین کے حالات کو بیان کر رہی ہیں۔ اگرچہ نفاق بذات خود معرفت کے پردوں میں سے ایک حجاب ہے لیکن اس مقام پر قرآن مجید نے ایک اور چیز پر زور دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "وہ پہلے ایمان لے آئے، پھر کفر کی راہ کو اختیار کیا۔ اسی لیے ان کے دلوں پر اس طرح مہر لگادی گئی ہے کہ وہ کسی حقیقت کے ادراک پر نہیں ہیں۔"

---

[1] اصول کافی، جلد ۲ ص ۶۲۷۔ کتاب فضل القرآن باب النوادر، حدیث نمبر ۱

وہ لوگ کون تھے؟ اس بارے میں مفسرین کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جو بظاہر تو ایمان لا چکے تھے لیکن باطن میں کفر پر قائم تھے۔

حالانکہ آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ وہ آغاز میں حقیقی طور پر مومن تھے، بعد میں کفر کے رستے کو اختیار کیا اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق بھی تھا۔ کیونکہ ''ثم'' کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کفران کے ایمان کے بعد رونما ہوا نہ کہ ایمان کے ساتھ، کہ ایک ظاہری ہوا اور ایک باطنی تو اس طرح سے آیت ہذا میں ارتداد کے حجاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور تعجب بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب انسان ایمان کے ذائقے کو چکھ لیتا ہے اور دین خدا کی حقانیت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے، پھر کفر کا راستہ اختیار کر لے اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق ہوتا ہے اور خداوند عالم اس کی عقل وفکر پر پردہ ڈال دے اور اس کے دل پر مہر لگا دے، تو باعث تعجب نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص پہلے ہی سے حق کو نہ پہچان سکے تو ممکن ہے اس کا عذر قابل قبول ہو۔ لیکن جب حق کو پہچان لیا جائے اور معرفت کے بعد ایمان لایا جائے، پھر اسے ٹھوکر ماردی جائے، تو غالباً یہی سمجھا جائے گا کہ یہ اس کے بغض وعناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے اور خداوند عالم ایسے شخص سے معرفت کی نعمت سلب کر کے اس کے دل پر حجاب ڈال دیتا ہے۔

البتہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ تمام منافقین آغاز کار ہی سے بے ایمان ہوں۔ بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آغاز کار میں واقعاً ایمان لے آتے ہیں، جیسا کہ سورہ توبہ کی ۷۴ ویں آیت میں بھی مذکور ہے کہ ''و کفروا بعد اسلامھم'' (وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے) اور ہٹ دھرمی پر مبنی یہ ارتداددلوں پر حجاب ہے۔

ایک بار اور بتاتے چلیں کہ یہ چیز ''جبر'' پر ہرگز دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ مشاہدہ حق کی اس محرومیت کے مقدمات انہوں نے خود ہی فراہم کیے ہیں۔

۱۶۔ جھوٹ اور افترا پردازی کا پردہ

پہلے تو اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ
لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ
قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمۡ فِىۡ دِيۡنِهِمۡ مَّا كَانُوۡا

يَفۡتَرُوۡنَ﴿۲۴﴾ (سورہ آل عمران ۲۴-۲۳)

(۲) وَلَقَدۡ مَكَّنّٰهُمۡ فِيۡمَاۤ اِنۡ مَّكَّنّٰكُمۡ فِيۡهِ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا
وَّاَفۡـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِذۡ
كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ﴿۲۶﴾

(سورہ احقاف ۲۶)

ترجمہ

(۱) آیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب سے حصہ عطا کیا گیا ہے اور انہیں کتاب الٰہی کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ (لیکن انہوں نے جان بوجھ کر) اس کی طرف پشت کر لی جبکہ انہوں نے (حق کو قبول کرنے سے) روگردانی کر لی۔ یہ عمل اس لیے ہے کہ وہ کہتے تھے چند دنوں کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی (اور ہماری سزا دوسری اقوام پر امتیاز رکھنے کی وجہ سے نہایت محدود ہے) اور اس افتراء (اور دروغ نے جو خدا پر باندھتے ہیں) انہیں دین میں مغرور کر دیا تھا۔

(۲) ہم نے ان (قوم عاد کے لوگوں) کو وہ قدرت عطا فرمائی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے۔ لیکن (عذاب نازل ہونے کے وقت) نہ تو ان کے کانوں اور آنکھوں نے اور نہ ہی ان کے دلوں نے انہیں کوئی فائدہ پہنچایا، کیونکہ وہ مسلسل خدائی آیات کا انکار کرتے تھے اور آخر کار وہ جس چیز کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان پر آٹوٹا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

جھوٹ کی فریب کاری

بعض مفسرین پہلی آیت کے شان نزول کے بارے میں کہتے ہیں:

یہودیوں میں سے ایک مرد و زن نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا۔ اگرچہ تورات میں اس قسم کے لوگوں کی سزا ''رجم'' کی صورت میں مقرر تھی لیکن انہوں نے اس حکم کے اجراء کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ وہ معاشرے کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس بارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کر لیں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں ان کی سزا میں تخفیف ہو جائے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی وہی حکم دیا۔لیکن جب انہوں نے اس پر اعتراض کیا تو آپؐ نے فرمایا ''میں تمہاری موجودہ تورات سے ہی فیصلہ لوں گا'' انہوں نے اس بات کو قبول کرلیا اور ''ابن صوریا'' جو ایک یہودی دانشمند تھا، کو اس مقصد کے لیے بلایا گیا۔ لیکن تورات کی تلاوت کے وقت اس نے اس حصے کو نہ پڑھا اور وہاں پر موجود عبداللہ بن سلام نے جو پہلے یہودی تھے، پھر مسلمان ہو گئے تھے، اس راز سے پردہ اٹھایا۔

اسی سلسلے میں قرآن کہتا ہے ''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا حصہ عطا کیا گیا ہے۔ جب انہیں اس کتاب کے ذریعہ فیصلہ کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ سرتابی اور سرپیچی کرتے ہیں۔''

بعد میں فرماتا ہے ''یہ اس لیے ہے کہ وہ خود کو عذاب الٰہی سے امان میں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ چند گنتی کے دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی۔ آخرکار جھوٹ، دروغ گوئی اور افتراءپردازی نے انہیں فریب میں مبتلا کر دیا اور انہیں معرفت سے روک دیا۔''

''**یفترون**''، ''**افترأ**'' کے مادہ سے ہے جس کی اصل ''فری'' (بروزن نہی) ہے جس کے معنی ''اصلاح کی غرض سے چمڑے کو کاٹنا'' ہے۔لیکن جب ''افرا'' (باب افعال کا مصدر) ہو کر آئے تو اس وقت اس کے معنی ''چمڑے کو بگاڑ کی غرض سے کاٹنا'' ہو جائیں گے اور ''**افتراء**'' کا معنی چمڑے کو کاٹنا ہے خواہ اصلاح کی غرض سے ہو خواہ بگاڑ کے مقصد کے لیے ہر چند کہ ''بگاڑ'' اور تخریب کاری'' کے معنی میں ہے، زیادہ استعمال ہوتا ہے اور یہ مادہ جھوٹ، شرک اور ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ [۱]

''**غرھم**'' ''غرور'' کے مادہ سے ہے جو اصل میں ''**غر**'' (بروزن حر) ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کا واضح اور آشکار نشان واثر۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر جو نشان ہوتا ہے اسے ''**غرۃ**'' کہتے ہیں اور جب کسی کپڑے کو لپیٹتے ہیں تو اس میں لپٹنے کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وہاں پر بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ فریب دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، گویا فریب دینے والا فریق ثانی کو کپڑے کی مانند لپیٹ رہا ہوتا ہے۔ [۲]

اور ''غرور'' بروزن ''شرور'' ہر اس شخص یا چیز کے معنی میں ہوتا ہے جو انسان کو فریب دے اور فریب کار شیطان کو بھی ''غرور'' کہتے ہیں۔ [۳]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جھوٹ اور افتراء انسان کو کس طرح فریب دیتے ہیں اور معرفت کے حقائق سے کیونکر باز رکھتے ہیں؟ بعض مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے:

''انسان اپنے افعال واعمال میں نفسانی حالات اور ملکات اور ان ذہنی صورتوں کی بنیاد پر کہ اس کے نفس نے جنہیں مزین کیا ہوا

---

[۱] مفردات راغب، مادہ ''فری''

[۲] مفردات راغب، مادہ ''غرور''

[۳] مفردات راغب، مادہ ''غرور''

ہے، قدم اٹھاتا ہے، نہ کہ اپنے علم اورادراک کی بنیاد پر، جیسا کہ بہت سے ایسے لوگ جونشے کے رسیا ہوتے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ منشیات ضرررساں ہیں اور ایسے مواد کا استعمال انسان کے شایان شان نہیں۔ پھر بھی وہ اس کا استعمال جاری رکھتے ہیں، کیونکہ نفسانی ملکہ اور حالت نے ایسے مواد کو لذت بخش بنا کر ان کے پیش کیا ہے اوران کے لیے جاذبیت پیدا کردی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان کی سوچ و بچار اوراس سے اجتناب کی کوئی مجال باقی نہیں چھوڑی۔''

بالفاظ دیگر اس قسم کے لوگ کبھی تو اس قدر جھوٹ کا تکرار کرتے ہیں اور خود کو تلقین کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں، پھر بالتدریج اس کا باور کرلیتے ہیں اوراس پر مطمئن ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلقین اور سمجھانا بھی علم اور یقین کا اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا دینی امور میں بار بار دروغ گوئی کی تلقین نے انہیں فریفتہ کرلیا ہے اور خداوند عالم کے سامنے سرتسلیم خم کرنے اور حق کے آگے سر جھکانے سے باز رکھا ہے۔[1]

یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ کوئی جھوٹ بولتے ہیں اور پہلے پہل وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ یا افترا ہے، لیکن اس عمل کو باربار دہرانے سے وہ آہستہ آہستہ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سچ ہو اور پھر اس کے تکرار سے وہ تدریجی طور پر اس بات کو باور کرنا شروع کردیتے ہیں کہ یہ ایک خبر ہے۔ پس اس طرح سے جھوٹ کا تکرار اور تسلسل غیر واقعی امور پر عقیدہ رکھنے، انسان کو فریب دینے اور اس کی آنکھوں کے سامنے پردہ ڈالنے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی لیے نوبت اس حد تک نہیں پہنچتی جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جھوٹ بولنے والے یہودی تھے اور دھوکہ کھانے والے دوسرے لوگ۔

دوسری آیت ''قوم عاد'' کی طرف اشارہ ہے، ایسی قوم جو سرزمین ''احقاف'' میں رہتی تھی۔ (احقاف جزیرۃ العرب کے جنوب کی طرف ہے اور بعض کہتے ہیں جزیرۃ العرب کے شمال کا علاقہ ہے)۔ انہوں نے اپنے پیغمبر جناب ''ہود'' علیہ السلام کی تکذیب کی اور حد سے بڑھ کر ظلم اور فساد کا ارتکاب کیا جس کے نتیجہ میں وہ مہلک آندھیوں کے ذریعے تباہ و برباد ہوگئے۔

یہ آیت بتارہی ہے کہ ''ہم نے انہیں تم سے زیادہ طاقت عطا کی تھی، ان کی آنکھیں، کان اور عقلیں بھی تھیں لیکن آیات الٰہی کے انکار اور انبیاء کرام کی تکذیب نے ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں پر پردے ڈال دیئے اور معرفت کے یہ ذرائع ان کے لیے مفید واقع نہ ہوسکے۔ آخرکار اسی عذاب میں مبتلا ہوگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہ آیت بھی اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آیات الٰہی کی تکذیب اور ان کا مسلسل انکار اس بات کا سبب بن گیا کہ یہ قوم ادراک اور معرفت کھو بیٹھی۔ ظاہری طور پر ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں، کان سنتے تھے اور فکری طور پر بظاہر وہ عقلمند بھی تھے لیکن حقیقت میں ان پر پردے پڑے ہوئے تھے اور معرفت کے یہ وسائل اور ہتھیار انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اور عذاب الٰہی نے ان کی خوب سرکوبی کی اور ہمیشہ کے لیے

---

[1] المیزان، جلد ۳، ص ۱۳۲

انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

"یجحدون"، "جحود" کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی کسی ایسی چیز کی نفی کرنا ہوتے ہیں جس پر انسان کو یقین ہوتا ہے۔ یا کسی ایسی چیز کا اثبات ہوتا ہے جس کی نفی پر انسان کا ایمان ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جان بوجھ کر پوری معرفت کے ساتھ حقائق کا انکار، جحد کہلاتا ہے۔[1]

تجربہ شاہد ہے کہ اگر انسان اس طرح کے کام کو جاری رکھے تو آہستہ آہستہ ان مسائل کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے اور اگر یہی سلسلہ مزید آگے بڑھے تو اس کی تشخیص بالکل الٹ ہو جاتی ہے اور باطل کو حقیقت سمجھنے لگ جاتا ہے۔

اس کام، یعنی حقائق کے انکار کے ممکن ہے کہ کئی اور مختلف سرچشمے بھی ہوں، یعنی کبھی تو وہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی تعصب، تکبر، غرور اور کبھی کوئی مادی منفعت ہوتی ہے کہ حقیقت کے آشکار ہو جانے سے اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور کبھی دوسری نفسانی خواہشات کی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن ہر حالت میں اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی وجہ سے انسان کی عقل وفطرت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تشخیص کے سلسلے میں الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۷۔ گمان کا ضخیم پردہ

بے بنیاد گمانوں، باطل اوہام اور تخیلات کی پیروی بھی تدریجی طور پر انسانی عقل کو دگرگون کر دیتی ہے۔ اسے خالص، صاف ستھرے معارف سے منحرف کر دیتی ہے اور اس کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔

اس بارے میں مندرجہ ذیل آیت مجیدہ پر غور کی دعوت دی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَحَسِبُوٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ (سورہ مائدہ۷۱)

ترجمہ

(۱) اور انہوں نے گمان کر لیا کہ سزا وغیرہ نہیں ہوگی، لہٰذا وہ (حقائق کے دیکھنے اور حق بات سننے سے) اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔ پھر (وہ بیدار ہوئے، خدا سے توبہ کی اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی، لیکن پھر (دوسری مرتبہ خواب غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ

---

[1] مفردات راغب مادہ "جحد" جوہری بھی کہتے ہیں "الجحود" الانکار مع العلم۔ مجمع البحرین نے بھی جحد کے یہی معنی کیے ہیں۔

انجام دیتے ہیں خداوند عالم اس سے باخبر ہے۔

آیت کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیت یہودیوں کے اس گروہ کی کیفیت بیان کر رہی ہے جس نے خدا سے یہ پختہ عہد کیا تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کی دعوت کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے اور خدا کے فرمان کی بجا آوری کریں گے۔ لیکن جب بھی کسی زمانے میں کوئی پیغمبران کی نفسانی خواہشات کے خلاف کوئی بات کرتے تو ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، حتیٰ کہ انہوں نے انبیاء کی ایک بہت بڑی تعداد کو تہ تیغ کر دیا۔

اس بحث کے سلسلے میں آیت کہتی ہے "انہوں نے گمان کیا کہ سزا وغیرہ کچھ نہیں ہے ان کا یہ گمان باطل جو حب ذات، تکبر اور غرور کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوا، ایسا باطل گمان جسے شیطان اور خواہشات نفسانی نے پروان چڑھایا اور اس باطل گمان اور خیال خام نے ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے، لہٰذا انہوں نے نہ تو دوسری اقوام کے دردناک انجام کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ ہی اس چیز کو کانوں سے سنا جو ان کے بارے میں تاریخ میں نقل ہوا۔ اس طرح معرفت کے ان دو اہم ذرائع یعنی آنکھ اور کان کو انہوں نے عملاً ضائع کر دیا اور خود کو عذاب الٰہی سے امان میں سمجھنے لگے۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد اپنی غلطیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کا راستہ اختیار کیا۔ چونکہ خدا کی رحمت بے حد و حساب ہے لہٰذا ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

ایک بار پھر انہی غلط سوچوں، باطل گمانوں، خام خیالوں اور بے دلیل امتیازات نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے (اور نوبت بایں جا رسید کہ وہ خود کو خدا کی اولاد سمجھنے لگ گئے) اور ان کے کانوں کو ایسا بند کر دیا کہ وہ اندھے اور بہرے ہو کر راندہ درگاہ الٰہی ہوئے۔

یہ آیت صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ باطل گمان، خاص طور پر عذاب الٰہی سے محفوظ ہوجانے کا گمان، انسان کی آنکھ اور کان پر ایک ضخیم پردہ ہے۔ بنا بریں "**فعموا وصموا**" (پس وہ اندھے اور بہرے ہوگئے) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں نے آیات الٰہی اور گذشتہ اقوام کے باقی رہ جانے والے آثار کو نہیں دیکھا اور ان کے کانوں نے اس بارے میں کسی قسم کے وعظ و نصیحت کو قبول نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک یا چند مرتبہ کی باطل اور بے بنیاد گمانوں اور خیالات کی اطاعت و پیروی سے اس قسم کی حالت پیدا نہیں ہوتی بلکہ تکرار اور تسلسل کی وجہ سے ہی یہ دردناک انجام دیکھنا پڑتا ہے۔

اس جملے کے تکرار اور وہ بھی "**ثم**" (پھر) کے لفظ کے ساتھ، جو عام طور پر زمانی فاصلے پر دلالت کرتا ہے، سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو درپیش آنے والی دو مختلف سرگزشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس کی طرف جب اہل باطل نے ان پر حملہ کر دیا تھا اور دوسری اس طرف جب ایرانیوں اور رومیوں نے ان پر حملہ کیا تھا اور ان کی حکومت کو تہس نہس کر دیا تھا۔[1] اس کی

---

[1] تفسیر "المنار"، جلد ۶، ص ۴۸۱

تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ میں سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں بیان کردی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ جناب زکریا، جناب یحییٰ اور جناب عیسیٰ علیہم السلام کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔ جب بنی اسرائیل ان انبیاء کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے اور دوسرا جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور ان کی نبوت و رسالت کے انکار کی طرف اشارہ ہے۔ [1]

جبکہ بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ خداوند متعال نے انہیں اس گمان کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کردیا اور انہیں اندھا اور بہرا کردیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی برگزیدہ ملت ہیں اور جو کام بھی وہ انجام دیں انہیں سزا نہیں ہوگی۔ لیکن ایک بار پھر خداوند عالم نے اپنا لطف اور اپنی رحمت ان کے شامل حال فرمائی، باطل گمان ان کے دل سے نکال دیا اور ان کے آنکھ اور کان کو دیکھنے اور سننے والا بنا دیا، لہٰذا انہوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ کی کہ وہ بھی خدا کے دوسرے بندوں کی طرح کے بندے ہیں اور تقویٰ کے سوا کسی کو کسی پر کوئی امتیاز اور فضیلت حاصل نہیں۔

لیکن بیداری کی یہ حالت اور کیفیت مستقل نہ تھی۔ پھر ان کا ایک گروہ اسی غلط گمان کا شکار ہو گیا اور نسلی امتیاز ان کے خیالات اور اوہام پر چھا گیا اور خدا نے ایک بار پھر ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے۔ [2]

ان تمام تفاسیر کو آپس میں جمع کرنا بعید نہیں ہے اور ان سب کا نتیجہ ایک ہے اور وہ یہ کہ باطل گمان اور فاسد خیالات (جیسا کہ یہودی لوگ اپنے لیے جھوٹے امتیازات کے قائل تھے) تدریجی طور پر انسان کے عقل و شعور اور ادراک و انظار پر اثر ڈالتے رہتے ہیں اور منحرف کرتے رہتے ہیں، اگرچہ آغاز میں وہ زیادہ پروان نہیں چڑھے ہوتے۔ اگر انسان بیدار ہو جائے تو ممکن ہے کہ راہ راست پر آ جائے، لیکن جب وہ انسانی روح میں اچھی طرح رچ بس جاتے ہیں اور پھل پھول جاتے ہیں تو پھر انسان کے لیے بازگشت کی راہ ناممکن ہو جاتی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۲ ص ۵۷ تفسیر روح المعانی جلد ۶ ص ۱۸۴ یہ تفسیر ایک احتمال کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۶ ص ۷۱

بیرونی حجاب

۱۸۔ فاسد اور گمراہ رہنماؤں کا پردہ

اشارہ

بیرونی حجابوں سے مراد ایسے حجاب ہیں جو انسان کے اپنے صفات و اعمال کے علاوہ ہیں جو کہ اس کے عقل و ادراک اور حس تشخیص پر اثر ڈالتے ہیں اور حقیقتوں کی شناخت اور معرفت سے مانع ہوتے ہیں اور وہ بھی کافی تعداد میں ہیں اور ایک وسیع حلقہ کے حامل ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف آیات میں نہایت ہی دلکش طریقہ سے ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ
اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (سورہ احزاب ۶۸-۶۷)

(۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ
تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝
قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى
بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ (سورہ سبا ۳۲-۳۱)

(۳) قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ
كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ
اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ
قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ اعراف ۳۸)

ترجمہ

(۱) اور وہ کہتے ہیں، پروردگار! ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی اطاعت کی ہے اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ پروردگار! تو انہیں دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت فرما۔

(۲) اور اگر کسی وقت ظالم و ستمگر لوگ (حساب و کتاب اور سزا و جزا کے لیے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے گئے تو تو دیکھے گا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن پر ڈالے گا، اور تو تعجب کرے گا تو اس وقت مستضعفین مستکبر ین سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ لیکن مستکبر ین مستضعفین کو جواب دیں گے آیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکے رکھا۔ جبکہ ہدایت تمہارے پاس آ چکی تھی (اور تم نے اسے اچھی طرح پا بھی لیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔

(۳) (خداوند عالم انہیں) فرمائے گا، تم اپنے جیسے جنوں اور انسانوں کی صف میں جہنم میں داخل ہو جاؤ اور جب بھی اس میں کوئی گروہ داخل ہوگا تو وہ دوسرے پر لعنت کرے گا، تا کہ وہ سارے کے سارے ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس میں رہیں۔ (تو اس وقت) پیروکاروں کا ایک گروہ اپنے پیشواؤں کے بارے میں کہے گا: خداوند! یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں تو آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔ خدا فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے، لیکن تم نہیں جانتے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

اہل جہنم کا باہمی جھگڑا

مندرجہ بالا آیات کا پہلا حصہ جہنمی کفار کے ایک گروہ کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ جب وہ اپنے کام کے نتیجے کو دیکھیں گے تو بارگاہِ رب العزت میں عرض کریں گے ''اس برے انجام کا سبب ہم خود نہیں ہیں کیونکہ ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی پیروی کی ہے، وہ ہم پر مسلط تھے اور ہماری فکری قیادت ان کے ہاتھ میں تھی اور ہم ان پر تکیہ کرتے رہے اور گمراہ ہو گئے۔ پروردگارا! ان کے عذاب کو دوگنا کر دے، (ایک تو ان کے اپنے کفر کا عذاب اور دوسرے ان کا ہمیں گمراہ کرنے کا عذاب) اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔''

وہ اس طرح سے اپنی جان چھڑانا چاہیں گے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ گمراہ سرداروں نے بھی ان کے انحراف و کجروی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس طرح سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان فاسد رہنماؤں کے وسوسے اور ضال و مضل (خود گمراہ اور گمراہ کن) رہنماؤں کی قیادت نے ان کے عقل و فکر پر

پردے ڈال دیئے تھے، لیکن اس کام کے مقدمات تو انہوں نے خود فراہم کیے تھے، کیونکہ وہ مکمل طور پر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے تھے اور یہ نہیں دیکھا تھا کہ یہ لوگ قیادت اور رہبری کے اہل ہیں بھی یا نہیں!

لفظ "سادتنا" اور "کبرائنا" آیا دو مختلف مفہوموں کے حامل ہیں یا ان دونوں کا مفہوم ایک ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ "ساوتنا" کا اشارہ ان بادشاہوں اور سلطانوں کے بارے میں ہے جو شہروں اور ملکوں پر مسلط رہ چکے ہوں گے اور "کبرائنا" کا اشارہ مقامی اور علاقائی رئیسوں اور سرداروں کی طرف ہے، کیونکہ وہ پہلے گروہ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کی بجائے بجالاتے تھے اور دوسرے گروہ کی اطاعت کو سول کی اطاعت کی بجائے۔ اسی لیے قدرت اور طاقت کے لحاظ سے پہلا گروہ زیادہ ہوگا اور اسی وجہ سے عبارت میں بھی اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے پہلے کو بادشاہوں اور صاحبانِ اقتدار کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسرے کو ان لوگوں کی طرف جو سن کے لحاظ سے بڑے ہیں اور اسی بزرگی کی وجہ سے ان لوگوں نے ان کی اطاعت کی ہوگی۔

بعض کا احتمال ہے کہ دونوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں اور تاکید ہے۔[1]

اور یہی آخری معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "سادۃ"، "سید" کی جمع اور سید اسے کہتے ہیں کہ جس کے پاس "سواد" کی سرپرستی ہو۔ (سواد یعنی انبوہ کثیر۔ اور انبوہ کثیر کی تعداد کو "سواد" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کثرت کی وجہ سے سیاہ معلوم ہوتی ہے) پھر ہر بزرگ کو "سید" کہا جانے لگا۔

دوسری آیت میں بھی ظالم کفار کا ذکر ہے جو بروز قیامت خدا کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسروں پر ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ اسی اثناء میں مستضعفین یعنی وہ بے خبر افراد جو آنکھ اور کان بند کر کے دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، "مستکبرین"، یعنی ایسے ظالم تسلط گر جو دوسروں کو فکری طور پر گمراہ کرتے رہے، کی طرف منہ کر کے کہیں گے "اگر تمہارے شیطنت آمیز گمراہ کن وسوسے نہ ہوتے یقیناً ہم مومنین کی صفوں میں ہوتے۔ تم ہماری ذہنی صفائی کرتے رہے اور غیر شعوری طور پر تم ہمیں اپنے پیچھے لگائے رہے اور اپنا آلہ کار بنائے رکھا جس سے اپنی شیطانی آرزوؤں کی تکمیل کرتے رہے۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہم کس قدر غلطی پر تھے۔"

البتہ مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے اور وہ جواب میں کہیں گے "ہم نے تمہیں کیسے ہدایت سے روکے رکھا حالانکہ انبیاء نے وہ سب کچھ بتادیا تھا جو بتانا ضروری تھا اور کافی حد تک اتمام حجت کیا تم خود غلط رہے ہو۔ ہم تمہاری گمراہی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ تم خود ہی گناہگار تھے اور اپنے ارادہ اور اختیار کے باوجود انبیاء کے منطقی کلام کو نہیں مانا اور ہماری بے بنیاد باتوں میں آ گئے۔"

تیسری آیت میں بھی جہنم میں گمراہ "پیشواؤں" اور "پیروکاروں" کی چپقلش کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جب کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو دوسرے گروہ پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اسے ہی اپنی شقاوت و بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ گمراہ پیروکار خدا کی بارگاہ میں عرض

---

[1] دیکھیے تفسیر روح المعانی، جلد ۲۲، ص ۸۷۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۶۹ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۲۳۲

کریں گے "یہ گمراہ کن لوگ ہی تھے جنہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا تھا۔تو ان کے عذاب کو دو چند کر دے،ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کی بنا پر۔

لیکن خداوند عالم ارشاد فرمائے گا "تم سب لوگوں کے لیے دوگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔" (قال لكل ضعف ولكن لا تعلمون)۔

باطل کے گمراہ کن سرداروں کو دوہرا عذاب ملنا ہی چاہیے لیکن گمراہ ہونے والے پیروکاروں کو دوگنا عذاب بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اچھی طرح غور وفکر سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انہیں بھی ایسی ہی سزا ملنا چاہیے، کیونکہ ایک تو خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے اور دوسرے کافر سرداروں کی ظلم کی چکی میں دانے ڈالنے اور ان کے تنور ظلم کو گرم رکھنے، یعنی ان کے آلہ کار بننے کی وجہ سے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بنی امیہ کے ایک کارندے سے ارشاد فرمایا جو آپ کے ایک صحابی کے ہمراہ توبہ کی غرض سے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا:

"لولا ان بنی امية وجدوا من يكتب لهم ويجبى لهم ايفى ولقاتل عنهم ويشهد جماعتهم لما سلبرنا حقا"

"اگر بنی امیہ ایسے افراد کو حاصل نہ کرتے جو ان کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے، خراج وصول کرتے تھے، ان کی طرف سے جنگ کرتے تھے، ان کی جماعت میں حاضر ہوتے تھے، تو وہ ہرگز ہمارا حق ہم سے نہ چھین پاتے۔"[1]

تشریح

"مستضعفین" اور "مستکبرین" قرآن کی نگاہ میں

قرآنی آیات میں کئی مرتبہ "مستکبرین" اور "مستضعفین" کا ذکر آیا ہے اور یہ ایک اہم اور قابل غور موضوع ہے جو تفسیر موضوعی کی آئندہ بحثوں میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے جالب توجہ ہوسکتا ہے، لیکن اس مقام پر اس بارے میں آیات بالا کی وضاحت کے لیے ہم اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

"راغب"، "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "کبر، تکبر اور استکبار" ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی تقریباً ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔" پھر کہتے ہیں کہ "استکبار" کے دو معانی ہیں، ایک تو یہ کہ انسان سعی و کوشش کرے کہ وہ بڑا بن جائے، گویا وہ بزرگی کے تمام ضروری شرائط کو ہر لحاظ سے پورا کرنے کی کوشش کرے اور بڑا بن جائے۔ یہ استکبار قابل ستائش ہے۔ دوسرے یہ کہ بزرگی کے شرائط کا حامل نہ ہو

[1] بحار الانوار جلد ۷۲ (وجلد ۷۵) ص ۳۷۵، سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۱۰۷، مادہ ظلم

اور نہ ہی اس کے لائق ہو،لیکن بڑائی کو اپنے ساتھ چسپاں کر دے۔ایسا استکبار قابل نفرت اور باعث مذمت ہے اور قرآن مجید میں اس کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔جیسا کہ ہم شیطان کے بارے میں پڑھتے ہیں: "ابی واستکبر" (اس نے آدمؑ کا سجدہ کرنے سے انکار کیا اور بڑا بنا۔سورہ بقرہ ۳۴)

راغب کہتے ہیں" قرآن مجید نے کہیں پر "مستکبرین" کو "ضعفا" کے مقابلے میں قرار دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی برتری طبی یا جسمانی طاقت کی وجہ سے ہے یا پھر مال ودولت کے بل بوتے پر۔"[1]

"استکبار" کا نقطہ مقابل "استضعاف" ہے جس کے معنی ہیں "کمزوری اور ناتوانی کو طلب کرنا" لیکن چونکہ یہ کلمہ قرآن مجید میں "فعل مجہول" یا "اسم مفعول" کی صورت میں استعمال ہوا ہے، لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے "ایسا ضعف (کمزوری) جو مستکبرین کی طرف سے کسی گروہ پر مسلط کر دیا جائے اور انہیں ناتوان سمجھا جائے"۔البتہ کہیں پر فعل معلوم کی صورت میں بھی استعمال ہوا ہے، اور وہ فرعون کے ماجرے میں ہے جس نے بنی اسرائیل کو کمزور اور ناتوان بنایا ہوا تھا اور انہیں اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ

"فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا اور لوگوں کو گروہوں میں بانٹ دیا اور ان میں سے ایک گروہ کو کمزور و ناتوان بنائے رکھا۔" (القصص ۴)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "مستضعف" کا لفظ قرآن مجید میں دو معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ایک تو وہ مظلوم افراد جو ناحق طور پر کسی کے ظلم تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں اور خداوند عالم کا لطف وکرم انکے شامل حال ہوتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے ستم رسیدہ افراد کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۵

"ہم ارادہ کر چکے ہیں کہ زمین میں موجود مستضعف افراد پر احسان کریں اور انہیں پیشوا بنائیں اور حکومت کے وارث قرار دیں۔" (القصص ۵)

اور دوسرا معنی جو قرآن میں بھی عام طور پر استعمال ہوا ہے اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اپنی جہالت، نادانی، بے سمجھی، کم عقلی، اندھی تقلید اور تعصب کی وجہ سے ذہنی اور فکری کمزوری کا شکار بنا دیئے گئے ہیں اور آنکھیں اور کان بند کر کے ظالم اور گمراہ قائدین کے پیچھے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں مندرجہ بالا آیات گفتگو کر رہی ہیں کہ وہ بروز قیامت مستکبرین کے ساتھ جھگڑا کریں

[1] مفردات راغب، مادہ "کبر"

گے اور ساتھ ہی یہ بھی تصریح کر رہی ہیں کہ انہیں بھی مستکبرین کی مانند دوہرا عذاب ہوگا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ گمراہ ہیں اور دوسرا اس لیے کہ وہ مستکبرین کے تنور کو گرم رکھتے ہیں اور ظالم و جابر مستکبرین کی حکمت کی بنیادوں کو مستحکم بنائے ہوئے ہیں۔

قائدین کا مقام اسلامی روایات میں

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الناس بامرائھم اشبہ منھم بآبائھم"

''لوگ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت اپنے امراء اور حکمرانوں سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔''[1]

ممکن ہے یہ شباہت اس لحاظ سے ہو کہ کچھ لوگ آنکھ اور کان بند کر کے اپنے امراء اور حکمرانوں کے پیچھے حرکت کرنے لگتے ہیں اور اپنا دین اور اپنا دل سب کچھ ان کے فرمان پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ضرب المثل مشہور ہوگئی ہے کہ "الناس علی دین ملو کھم" (لوگ اپنے حکام اور بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔

حکمران اور بادشاہ قسم کے لوگ بعض لوگوں کی نگاہ میں ہیرو، نمونہ اور اسوہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کم عقل لوگ انہیں اس بات سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال و کردار کا محاسبہ کیا جائے، یا ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جائے اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے بعض مطلق العنان حکمران اپنے آپ کو ''تقدس'' کے ہالہ میں قرار دے کر سادہ لوح لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتے ہیں کہ وہ خدا کی مقدس مخلوق ہیں اور ہر قسم کے محاسبہ سے ماوراء۔ اس طرح سے وہ سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے افکار و عقول پر پردے ڈال دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ ''طاقت'' کو ''حق'' سمجھتے ہیں اور ہر کامیاب اور فاتح فرد یا گروہ کو برحق جانتے ہیں اور یہی طرزِ تفکر اس بات کا باعث بن جاتا ہے کہ وہ اجتماعی اور معاشرتی حساب و کتاب میں زبردست غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ظالم اور جابر بادشاہ اور حکمران لوگوں کی اس فکری ناتوانی اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں پر بھی وہ قدم رکھتے ہیں وہاں پر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں، لوگوں کو بے راہروی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہاں کی سرزمین کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ملکہ سبا کی زبانی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ

''جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا کام ہی یہی ہے۔'' (نمل ۳۴)

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۴۶۔ کتاب الروضہ کلمات الروضہ حضرت علیؑ، حدیث ۵۷

اگرچہ یہ گفتگو بھی خود ایک ظالم بادشاہ کی زبانی نقل ہوئی ہے لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر بغیر کسی تنقید اور نکتہ چینی کے اور دوسرے کسی ظالم بادشاہ کی اپنے جیسے لوگوں کی معرفت اور شناخت اس کے حقیقت ہونے کے اعتراف کی دلیل ہے۔

اسی لیے ملکہ سبا نے کہا: ''میں سلیمان کی آزمائش کرنا چاہتی ہوں اور دیکھنا چاہتی ہوں کہ آیا وہ واقعاً پیغمبر ہیں یا عام دنیاوی بادشاہ؟ میں ان کے لیے کچھ تحفے روانہ کرکے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس بارے میں ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے کیونکہ دنیاوی بادشاہوں کے دل و دماغ ہمیشہ مقام و منصب، تحفے تحائف اور زر و زیورات کے گروی ہوتے ہیں، جبکہ انبیاء کو صرف امتوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔''

۱۹۔ گمراہ دوستوں کا حجاب

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا ﴿٢٩﴾ (سورہ فرقان ۲۷ تا ۲۹)

ترجمہ

اس دن کو خاطر میں لاؤ جب ظالم شدید حسرت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول خدا کے ساتھ کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش کہ میں نے فلاں (منحرف شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو مجھے حق کی یاد سے گمراہ کیا ہے جبکہ معرفت و آگاہی میرے پاس آ چکی تھی اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو چھوڑتا چلا آ رہا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیات قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی جھلک کو پیش کر رہی ہیں، ایسا منظر کہ جس میں ظالم لوگ اپنی کارستانیوں کی وجہ سے سخت حسرت اور افسوس کا اظہار کریں گے اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹیں گے۔

''یعض''، ''عض'' (بروزن حظ) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں دانتوں سے کاٹنا اور یہ تعبیر عربی اور فارسی (نیز اردو) میں سخت

افسوس اور پشیمانی سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سخت مشکل میں پھنس جاتا ہے (اور مشکل بھی وہ جو اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے پیش آجاتی ہے) تو وہ یا تو اپنی انگلیوں کو کاٹتا ہے یا پھر ہتھیلی کی پشت کو۔ شاید یہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو تنبیہ کرے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

ہاں البتہ اگر وہ مشکل زیادہ سخت نہ ہو تو ممکن ہے کہ صرف ہاتھ کی انگلیوں کے سرے کو ہی کاٹے جیسا کہ سورہ آل عمران کی ۱۱۹ ویں آیت میں بعض کفار کے بارے میں مذکور ہے کہ:

وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ط

''جب وہ خلوت میں جاتے ہیں تو تمہارے اوپر سخت غصے کی وجہ سے وہ اپنی انگلیوں کے سروں کو دانتوں سے کاٹتے ہیں۔''

یا ایک ہتھیلی کی پشت کو کاٹتے ہیں اور اگر مصیبت بہت ہی زیادہ ہو تو کبھی اس ہتھیلی کو اور کبھی اس ہتھیلی کو کاٹتے ہیں اور زیر بحث آیت میں "یدیه" (دونوں ہاتھ) کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروز قیامت ان کی مصیبت نہایت درجہ شدید ہوگی۔ عام طور پر اس کام کے ساتھ ایسے جملے استعمال ہوتے ہیں جن کا مفہوم اپنی سرزنش ہوتا ہے اور تعصب کے وسائل و ذرائع سے گفتار اور عمل ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔

وہ بھی قیامت میں ایسا ہی کہیں گے ''اے کاش کہ ہم نے پیغمبر کے ساتھ کا راستہ اختیار کیا ہوتا اور اے کاش کہ فلاں شخص کا اپنے دوست کے لیے انتخاب نہ کیا ہوتا، حالانکہ خدا کی آیات بھی ہمارے پاس پہنچ چکی تھیں جو ہماری سعادت اور خوش قسمتی اور خوش بختی کی ضامن تھیں۔ لیکن اس گمراہ دوست نے ہمیں بیداری کی اجازت نہیں دی۔''

اس طرح سے وہ اپنی بدبختی اور شقاوت کا اصل عامل اپنے گمراہ کن دوست کو ہی سمجھیں گے جس نے ان کی آنکھوں کے آگے پردہ ایجاد کر دیا تھا اور وہ جمال حق کے مشاہدہ سے محروم رہے۔

اس آیت میں ''فلاں'' سے کون مراد ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد شیطان ہے جسے انسان نے بطور دوست کے انتخاب کیا ہوا تھا کیونکہ اسی آیت کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں "و کان الشیطان للانسان خذولا"، یعنی شیطان انسان کو مشکلات میں چھوڑ ہی دیتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہی شخص ہے جو آیت کے شان نزول میں بیان ہوا ہے۔ (یعنی ''عقبہ'' جو ایک مشہور کافر تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنے دوست ''ابی'' کی خاطر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامانِ شفقت کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور جنگ بدر میں مارا گیا، جبکہ اس کا دوست ''ابی'' بھی جنگ احد میں قتل کر دیا گیا)۔ [1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان (انہی آیات کے ذیل میں)۔ بعض مورخین کے مطابق ''ابی'' وہ تنہا شخص ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی پوری زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو تفسیر روح البیان، جلد ۶ ص ۲۰۵

لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔آیت کا بظاہر مفہوم کلی ہے اور تمام گمراہ کن اور دل میں وسوسہ پیدا کرنے والے دوستوں کو بھی شامل ہے اور شانِ نزول کسی بھی صورت میں آیت کو خاص نہیں کرتا،خصوصاً جبکہ ''شیطان'' کا معنی وسیع اور عمومی ہے جو تمام انسانی اور جناتی شیطانوں کو شامل ہے اور پھر کلمہ ''فلان'' پرزور دیا گیا ہے جو نکرہ کی صورت میں آیا ہے اور آیت کے مفہوم کے عام ہونے پر ایک واضح قرینہ ہے۔[1]

سورہ انعام کی ۱۳۷ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ط

''اسی طرح مشرکین کے شریک کاروں نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی آنکھوں میں مزین کر دیا ہے تا کہ وہ انہیں ہلاک کر ڈالیں اور ان کا دین ان پر مشتبہ کر دیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کے شریک کار لوگوں سے مراد بت خانوں اور بتکدوں کے متولی ہیں جو انہیں راہ راست سے بھٹکاتے اور گمراہ کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی اولاد کو بتوں کی بھینٹ چڑھائیں اور اس طرح سے وہ ان پر راہ حق کو مشتبہ کر دیں اور ان کی عقل وفکر پر پردے ڈال دیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت مذکورہ بھی ہمارے مدعا کا بہترین شاہد ہے،یعنی گمراہ دوست بھی حجاب بن جاتے ہیں۔

تشریح

ہمارے طرز فکر میں دوستوں کا کردار

اس بارے میں اسلامی روایات میں کئی تعبیرات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ منحرف دوست اور گمراہ مشیر انسان کی فکر پر کیونکر ڈاکے ڈالتے ہیں،اس کی تشخیص کو کیسے دگرگوں کر دیتے ہیں اور انجام کار حق تک پہنچنے کی راہیں اس پر کیسے بند کر دیتے ہیں۔چنانچہ چند ایک روایات کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے فرزند جناب حسن مجتبیٰؑ سے فرماتے ہیں:

''يا بنى اياك ومصادقة الاحمق فانه يريد ان ينفعك فيضرك... و اياك

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن،جلد ٦،ص ١٥٦

ومصادقة الكذاب فانه كالسواب يقرب عليك البعيد ويبعد عليك القريب"

''میرے پیارے فرزند! احمق کی دوستی سے بچے رہو کیونکہ وہ تجھے نفع پہنچانا چاہے گا لیکن نقصان پہنچائے گا...... اور دروغ گو کی دوستی سے بھی بچتے رہو، کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے اور دور کی چیز تمہیں نزدیک اور نزدیک کی چیز دور کرکے دکھائے گا''[1]

۲۔ آپؑ ہی نے مالک اشتر کے نام تاریخی فرمان میں ''مشیروں'' کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، ہمارے مدعا کی بہترین دلیل ہے:

"ولا تدخلن فی مشورتك بخيلا يعدل بك عن الفضل ويعدك الفقر، ولا جبانا يضعفك عن الامور ولا حريصا يزين لك الشرة بالجور"

''بخیل کو اپنے مشوروں میں کبھی داخل نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں احسان اور نیکی سے باز رکھے گا اور فقر و فاقہ سے ڈرائے گا۔ ڈرپوک آدمی سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ اہم کاموں میں تمہارے حوصلے پست کردے گا اور حریص اور لالچی شخص سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ ظلم و ستم سے ملے ہوئے حرص کو تمہاری نگاہوں میں مزین کردے گا''[2]

اس تعبیر سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلط اور منحرف قسم کے مشیر انسانی فکر پر کیونکر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور انسان کی معرفت کے لیے کیسے پردے بن سکتے ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخيار"

''غلط اور شریر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہم نشینی انسان کو شریف اور نیک لوگوں سے بدظن کردیتی ہے۔''[3]

۴۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۳۸

[2] نہج البلاغۃ

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۶۸

"المرء علی دین خلیله وقرینه"

''انسان اپنے دوست اور ساتھی کے دین پر ہے۔''[1]

اس طرح سے کسی صالح یا غیر صالح دوست کی دوستی کے اچھے یا برے اثرات جو انسان کے طرز تفکر اور اس کی شناخت و معرفت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

پروپیگنڈے اور ماحول کا پردہ

پہلے تو مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ ......
فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ
فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ (سورہ طه ۸۵ تا ۸۸)

(۲) فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ
لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ (سورہ قصص ۷۹)

(۳) فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَاۗءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾
(سورہ اعراف ۱۱۶)

(۴) وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ (سورہ آل عمران ۷۲)

(۵) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ
اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاۗءَ مَعَهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ

[1] اصول کافی، جلد ۲، ص ۳۷۵۔ باب مجالسة اہل المعاصی، حدیث ۳

فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۝۵۴ (سورہ زخرف ۵۲ تا ۵۴)

ترجمہ

(۱) فرمایا ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور سامری نے انہیں گمراہ کیا اور ان کے لیے ایک گوسالے کا مجسمہ تیار کیا کہ جس کی آواز گوسالے جیسی آواز تھی۔ اور ان لوگوں سے کہا یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے اور اس نے (جو پیمان خدا سے باندھا ہوا تھا) فراموش کر دیا۔

(۲) (قارون) اپنی تمام زینت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا جو لوگ دنیاوی زندگی کے طالب تھے انہوں نے کہا اے کاش! جس طرح قارون کو عطا ہوئی ہے، ہمیں بھی عطا ہو جاتی، یقیناً اس کا اس دنیا میں بہت بڑا حصہ ہے۔

(۳) (موسیٰ نے) کہا تم ڈالو۔ جب انہوں نے اپنے جادو کے ساز و سامان کو زمین پر ڈالا، لوگوں کی آنکھیں بند کر دیں اور انہیں ڈرایا اور ایک عظیم سحر کو وجود میں لائے۔

(۴) اہل کتاب میں سے (یہودیوں کے) ایک گروہ نے کہا (جاؤ اور بظاہر) دن کے اول حصے میں ایمان لے آؤ اس چیز پر جو مومنین پر نازل ہوئی ہے اور دن کے آخری حصے میں کافر ہو جاؤ شاید کہ وہ (اپنے دین سے) پلٹ جائیں۔

(۵) (فرعون نے) کہا میں اس شخص سے برتر ہوں جو پست خاندان اور طبقہ سے ہے اور فصیح طریقے پر بھی گفتگو نہیں کر سکتا۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اترے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے۔ اس (فرعون) نے اپنی قوم کو احمق بنایا اور قوم نے اس کی اطاعت کی، کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زہریلا پروپیگنڈا

پہلی آیت سامری کی داستان کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہی جاہ طلب اور خودغرض انسان، جس نے موسیٰ علیہ السلام کی چالیس شبانہ روز غیبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جب وہ معیادگاہ الٰہی یعنی کوہِ طور پر اپنے رب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے تمام زر و زیورات کو جمع کر کے گوسالے (بچھڑے) کی شکل کا ایک بت بنایا۔ وہ اسے مخصوص حالت میں ہوا کے رخ پر

کھڑا کر دیتا تھا جس سے بچھڑے سے ملتی جلتی آواز نکلتی تھی۔ قرآن نے اس آواز کو ''خوار'' (بروزن غبار) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا معنی ہے ''گائے کی آہستہ آواز''۔

اس نے اپنے کام کے لیے خاص قسم کی فرصت سے فائدہ اٹھایا۔ جب جناب موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کو پینتیس (۳۵) دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی توحیدی تبلیغات کے اثرات بنی اسرائیل کے دلوں سے کم ہونے لگے تو اس نے یہ اقدام کیا، خصوصاً جبکہ پہلے یہ طے پا چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی کوہ طور پر قیام کی مدت تیس دن سے زائد نہ ہو لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے دس راتوں کا اضافہ کر دیا اور چالیس راتیں مکمل ہوئیں۔

قرآن مجید کہتا ہے: ''خداوند عالم نے موسیٰ سے فرمایا: ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور اسے سامری نے گمراہ کیا۔''

بہر حال ایک عظیم گروہ کو بے راہروی کا شکار کر دینا اور اسے راہ راست سے گمراہ کر دینا کوئی آسان بات نہیں (اور بعض روایات کی رو سے گمراہ ہونے والوں کی تعداد چھ لاکھ تھی) اور انہیں خالص توحید کی راہ سے ہٹا کر خالص شرک کی راہوں پر ڈال دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس ماجرے سے متعلق جو آیات سورہ طہٰ اور دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہیں اور تاریخوں اور تفسیروں میں اس کا ذکر آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لوگوں کے افکار پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کی دماغی صفائی کے لیے ایک خاص قسم کے پروپیگنڈے سے کام لیا جس سے لوگوں کی عقل پر پردے پڑ گئے اور وہ آہستہ آہستہ باور کرنے لگے کہ یہ بچھڑا ہی موسیٰ علیہ السلام کا خدا ہے۔

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہم مندرجہ بالا آیت میں پڑھتے ہیں کہ ایسا صرف سامری ہی نے نہیں کیا، بلکہ بنی اسرائیل بھی اس کے ہم آواز ہو کر کہنے لگے ''یہ بنی اسرائیل اور موسیٰ کا خدا ہے۔'' (''قالوا'' کا لفظ اس بات کا گواہ ہے)۔

یہ تعبیر سامری کے پروپیگنڈے کی تاثیر کی واضح دلیل ہے۔ اس نے مندرجہ ذیل وجوہات سے خوب فائدہ اٹھایا:

۱۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیبت سے استفادہ۔ ۲۔ ان کی مدت قیام کا چالیس راتوں تک طویل ہو جانا۔ ۳۔ زر و زیورات سے استفادہ کرنا جو کہ عوام الناس اور خاص کر بنی اسرائیل کے نزدیک زبردست اہمیت کے حامل تھے اور ان کی آنکھوں اور دلوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ۴۔ گمراہی کے لیے مناسب موقع کی تلاش، چنانچہ جب بنی اسرائیل نے دریائے نیل سے نجات پائی اور ان کا ایک ایسی قوم کے پاس سے گزر ہوا جو بتوں کی پرستش کر رہی تھی تو انہوں نے بھی موسیٰ سے بتوں کے بنانے کا تقاضا کیا۔ سورہ اعراف کی ۱۳۸ ویں آیت میں ہے:

"قالوا یاموسی اجعل لنا الها کما لهم الهة"

''اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا خدا بناؤ جیسے ان کے لیے خدا ہیں۔''

۵۔ سامری کا بنی اسرائیل میں مقام و منزلت اور اس پر ان کا اس قدر اعتماد کہ وہ اس کے لیے کسی حد تک تقدس مآبی کے بھی قائل تھے اور اسے جبرائیل علیہ السلام کا پرورش یافتہ بھی جانتے تھے۔ [۱]

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۷، ص ۴۸۲، تفسیر روح البیان، جلد ۵ ص ۴۱۴۔ دائرۃ المعارف، دہخدا مادہ سامری

۶۔ضعیف العقیدہ لوگوں کا ''محسوس خدا'' سے انس وتعلق اور ایسے خدا سے بے توجہی جو جسمانی صفات سے مکمل طور پر منزہ اور مبرا ہے۔اسی لیے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تقاضا کر ڈالا کہ وہ انہیں خدا کا دیدار کرائیں تا کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔(بقرہ۵۵)

یہ اور اس طرح کی کئی دوسری وجوہات تھیں جن کے ذریعہ سے وہ لوگ کلی طور پر خدائے واحد و یکتا سے منحرف ہو گئے اور سامری کے مسموم پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے اور بت پرستی کو اپنا لیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جناب موسیٰ واپس لوٹے اور ان کی برائیوں اور کجروی کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور انہیں ان کی سخت نازیبا حرکت کی طرف متوجہ کیا تو وہ یوں متنبہ ہوئے گویا نیند سے بیدار ہو گئے اور پکار پکار کر اپنی ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا، بلکہ اس حد تک راضی ہو گئے کہ توبہ کی قبولیت اور گناہوں کے کفارہ کے طور پر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار چلائیں اور مرتدین کے ایک گروہ کا خون زمین پر بہا ڈالیں۔(سورہ بقرہ۵۵)

بہرحال یہ آیت غلط پروپیگنڈہ کے حجاب ہونے پر روشن دلیل ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں بنی اسرائیل کے مشہور دولتمند قارون کی بات ہو رہی ہے جو ایک دن بنی اسرائیل کے سامنے اپنی دولت وثروت کی نمائش کے لیے کمربستہ ہوا۔

تاریخوں میں اس بارے میں کئی داستانیں اور افسانے منقول ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے جسے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ:

''قارون ایک دن اپنے چار ہزار دوستوں اور نوکروں چاکروں سمیت بنی اسرائیل کے درمیان ظاہر ہوا، جبکہ ان میں سے ہر ایک قیمتی گھوڑے پر سوار سرخ لباس پہنے ہوئے تھا۔ان کے ساتھ کنیزوں کا بھی ایک جھرمٹ تھا، جو سفید رنگ کے خچروں پر سوار تھیں، جن کی زینیں سونے کی تھیں اور مختلف قسم کے طلاو جواہرات کے زیوروں سے مزین تھیں۔''[1]

بعض مورخین نے ان افراد کی تعداد ستر ہزار بھی لکھی ہے اور اگر ہم اس تعداد کو صحیح نہ بھی مانیں تب بھی قرآنی تعبیر «**فخرج علی قومه فی زینته**» (وہ اپنی تمام قسم کی زینت کے ساتھ اپنی قوم میں ظاہر ہوا) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظر عام اور معمولی قسم کا نہیں تھا۔اس نے ایسا شاید اس لیے کیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام کی غربت کا مذاق اڑائے، یا بنی اسرائیل میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرے، یا پھر قدرت وطاقت اور ثروت ودولت کی نمائش کا جنون تھا جو عام طور پر صاحبانِ قدرت وثروت میں پایا جاتا ہے۔صورتحال خواہ کچھ بھی ہو اور مقصد خواہ کوئی بھی ہو، مذکورہ منظر اور اس کے ساتھ اس حد تک پروپیگنڈا ہم آہنگ تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں کی عقلوں کو چرا لیا اور ان کی روح وفکر پر اس حد تک پردے ڈال دیئے کہ وہ اسے ''ذوحظ عظیم'' (بڑی قسمت والا) خوش قسمت، خوش بخت اور سعادت مند سمجھنے لگ گئے اور اس آرزو کی خواہش کرنے لگے کہ اے کاش! وہ بھی اس کی جگہ پر ہوتے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، قرطبی اور روح المعانی کا سورہ قصص کی آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اس کے دوسرے دن خداوند عالم نے جرائم کے ارتکاب اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے قارون کو اس کے خزانے سمیت زمین کی گہرائیوں میں بھیج دیا تو سب لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ اس کی جگہ پر نہیں تھے۔

اس طرح کے پروپیگنڈے کی تاثیر کا نہ تو اس زمانے میں انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور دور میں اور ماضی میں بھی اور حال میں بھی بہت کچھ ایسے ظالم و جابر لوگ ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرنے اور انہیں احمق اور بے وقوف بنانے کے لیے اس قسم کی نمائش کے ذریعہ پروپیگنڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ صرف زبردست مفکرین اور دانشور افراد ہی اس قسم کے حجابوں کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے اذہان و افکار پر نہیں پڑنے دیتے اور اس طرح کے مناظر کے پس پردہ اس قسم کے لوگوں کے اصلی چہرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

تیسری آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادوگروں کے ساتھ جنگ کے منظر کو بیان کر رہی ہے، ایسے جادوگر جنہیں موسیٰ کے ساتھ نمٹنے کے لیے فرعون نے کئی قسم کے لالچ دے کر ملک کے دور دراز حصوں سے بلایا تھا۔ بعض روایات کی رو سے ان کی تعداد کئی ہزار تھی، اور ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی اوپر تھی۔ (ممکن ہے کہ یہ تعداد خود جادوگروں، ان کے معاونوں اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی ہو۔ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں جادو اور جادوگری کا رواج عروج پر تھا)۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایک عید کے دن، جبکہ سورج کافی بلند ہو چکا تھا، اس جنگ کو دیکھنے کے لیے میدان میں آ چکی تھی۔ (جیسا کہ سورہ طہٰ کی ۵۹ ویں آیت میں "یوم الزینة" کی اور "ضحیٰ" کی تعبیر میں اس بات کو گواہ ہیں)۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کو اطمینان تھا کہ وہ لڑائی میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس نے لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے پروپیگنڈا کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے ''جب جادوگروں نے اپنے فراہم کردہ جادو کے تمام ساز و سامان کو پھینکا لوگوں کی آنکھوں پر جادو چلایا، انہیں وحشت زدہ کر کے عظیم جادو کا مظاہرہ کیا۔''

آیت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے "سحر" اور "استرهاب" کے لفظوں کی اچھی طرح وضاحت ہونا ضروری ہے۔

لغوی طور پر ''سحر'' دو معنوں کے لیے آتا ہے، ایک تو دھوکا دینا اور دوسرا وہ جس کے وجود کے اسباب و عوامل غیر مرئی (ناقابل دید) اور مرموز و مخفی ہوتے ہیں اور بعض ارباب لغت نے دونوں معانی کو ایک ہی اصل کی طرف لوٹایا ہے اور کہا ہے: ''جادو کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو دگرگوں کر دیا جائے اور اسے دوسری صورت میں پیش کیا جائے۔''[1]

جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورۃ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں بیان کر چکے ہیں کہ جادو عام طور پر اجسام کے ناشناختہ فزیکل اور کیمیکل آثار اور خواص سے مل کر معرض وجود میں آتا ہے اور جادوگر وہ لوگ تھے جو ان خاصیتوں اور اثرات سے بخوبی واقف تھے اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اندر سے خالی لکڑیوں اور چمڑے کی رسیوں کو فراہم کیا اور ان میں پارہ بھر دیا، چنانچہ پارہ نہایت ہی فرار کرنے والا مادہ ہوتا ہے۔ جب ان چیزوں پر دھوپ پڑی، یا شاید میدان مقابلہ میں گرم کرنے والی چیزیں بچھائی گئیں تھیں، اسی لیے وہ چیزیں متحرک

---

[1] قاموس اللغة، مفردات راغب، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور تاج العروس کا مطالعہ فرمائیں۔

ہوکر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ [1]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جادوگر لوگ اپنے ہاتھوں کی صفائی اور پھرتی سے ایسے مناظر دکھاتے ہیں جن میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں ہوتی۔ہم میں سے اکثر لوگوں نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عطریات کے ذریعہ یا مخصوص نباتات کی دھونی کے ذریعہ سے مخصوص کیمیکل مواد پھیلا دیا جاتا ہے جس سے حاضرین کی قوت بینائی،قوت سامعہ، بلکہ ان کے اعصاب پر تصرف کر لیا جاتا ہے اور انہیں غیر واقعی مناظر دکھائے جاتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھ کی مقناطیسیت اور ہپناٹزم کے ذریعہ حاضرین کے دل میں کچھ چیزیں ڈالی جاتی ہیں جو ایسی حالت میں بہت ہی موثر ہوتی ہیں اور انہیں ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

البتہ جادو کی ایک اور قسم بھی ہے جو شاید جنات یا بعض روحوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔(جادوگروں کے جادو کے یہ پانچ عمدہ طریقے ہیں)۔

کبھی ''سحر'' کا لفظ ان تمام معانی سے وسیع تر معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔مثلاً جو شخص بہترین تقریر کرتا ہے اسے ''جادو بیان مقرر'' کہا جاتا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ''چغل خوری'' ''جادو'' کی ایک قسم ہے،کیونکہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتی ہے۔لیکن جو چیز اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ "سحروا اعین الناس" (لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا) وہی قوت باصرہ (حس بینائی) میں تصرف اور لوگوں کی آنکھوں میں حقیقی مناظر کو تبدیل کرنا ہے۔نہ کہ انہوں نے واقعاً کوئی سانپ یا اژدہا پیدا کر لیا تھا۔ہماری اس بات کی شاہد سورہ طٰہ کی ٦٦ ویں آیت ہے،ارشاد ہوتا ہے:

"فاذا حبالھم وعصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی"

''تو اس وقت ان کی رسیاں اور ڈنڈے ان کے جادو کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔(حالانکہ وہ چل نہیں رہے تھے۔اس پارے وغیرہ کے اثر کی وجہ سے حرکت کر رہے تھے)۔''

"استرھبوا" "رھب" (بروزن عہد یا بروزن قبح) کے مادہ سے ہے،جس کے معنی ہیں ایسا خوف جس میں پرہیز اور اضطراب ملا ہوا ہو۔(جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) اور بہت سے مفسروں نے "استرھاب" کو "ارھاب" کے معنی میں لیا ہے،یعنی خوف اور اضطراب پیدا کرنے کے معنی میں۔اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سحر و جادو کے علاوہ جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے،نہایت ہی وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے سے بھی کام لیا ہے (اور اکثر طور پر جادوگر ایسا ہی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کا اکثر و بیشتر دارومدار اسی قسم کے پروپیگنڈے پر ہوتا ہے)۔

---

[1] روح المعانی،جلد ٩،ص ٢٢۔تفسیر فخر رازی جلد ١٤،ص ٢٠٣۔روح البیان جلد ٣،ص ٢١٣ اور تفسیر المنار جلد ٩،ص ٦٦ اور کئی دوسری تفسیریں

بعض کتابوں میں ملتا ہے کہ جس میدان کا انتخاب کیا گیا تھا وہ ایک مربع میل پر مشتمل تھا۔ (ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا)۔[۱] اسی طرح بعض اور کتابوں میں ملتا ہے کہ جادو کے لیے جمع شدہ لکڑیاں اور رسیاں جو سانپ اور اژدھا کی شکل میں تھیں ان کا ایک پہاڑ بن چکا تھا۔[۲]

پھر مندرجہ ذیل قسم کی گفتگو سے لوگوں کو حد سے زیادہ اپنے زیر اثر کرلیا اور ان کی عقول وافکار کو گمراہ کرنے اور ان پر پردہ ڈالنے کی پوری پوری کوشش کی تاکہ واقعیات اور حقائق کی معرفت کی قدرت اور طاقت بھی ان سے سلب کرلی جائے۔

''لوگو! میدان سے دور رہو! کہیں سانپ اور اژدھے تم پر حملہ نہ کردیں کیونکہ وہ نہایت ہی خطرناک اور وحشت ناک ہیں......''

یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جن کی طرف بعض تفسیروں میں مختلف اشارے کیے گئے ہیں۔[۳]

چوتھی آیت اسلام کے مقابلے میں یہودیوں کے اس پروپیگنڈا کی قلعی کھول رہی ہے جس کے لیے انہوں نے لوگوں کو متزلزل کرنے کے لیے ایکا کرلیا تھا۔ انہوں نے یہ سازش کی کہ علی الصبح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاکر ظاہری طور پر اسلام لے آئیں لیکن اسی دن کے آخر میں اسلام سے برگشتہ ہوجائیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا، تو وہ جواب دیں کہ ہم نے محمد (ص) کی صفات کو نزدیک سے دیکھا ہے لیکن وہ ہماری دینی کتابوں اور ہمارے دانشوروں کے اقوال سے مطابقت نہیں کرتی تھیں، لہٰذا ہم واپس آ گئے۔

پروپیگنڈے کا یہ انداز اس بات کا موجب بنے گا کہ لوگ یہ کہیں گے: ''جو لوگ اہل کتاب اور پڑھے لکھے تھے اور ہم سے بہتر سمجھتے تھے انہوں نے اس دین کو باطل پایا، لہٰذا اس کی کوئی محکم بنیاد نہیں ہے۔''

اس طرح سے سادہ لوح افراد کے افکار کو گمراہ کرکے ان کی عقل اور ان کی قوت تشخیص پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

''**وقالت طائفة**'' کے جملے میں لفظ ''طائفه'' ''طواف'' کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں ایسا گروہ جو ایک حلقہ کی صورت میں ہوتا ہے، گویا کسی بات کے گرد طواف کررہا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہاں پر طائفہ سے مراد خیبر کے یہودیوں کا ایک بارہ نفری گروہ تھا، یا مدینہ کے یہودیوں کا گروہ تھا، یا پھر نجران کے یہودیوں کا گروہ تھا جنہیں بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی پر سخت دکھ ہوا اور انہوں نے ایسی سازش تیار کی۔[۴]

''**وجه النهار**'' (دن کا چہرہ) کی تعبیر سے دن کے آغاز کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ چہرہ ہی وہ پہلی چیز ہوتا ہے جس سے انسان روبرو ہوتا ہے اور نہایت ہی باعزت عضو ہے۔ البتہ آیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتی کہ انہوں نے ایک دوسرے سے اس طرح کی پیشکش کی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیش کش پر عملدرآمد کیا گیا، ورنہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس اہمیت سے بیان ہوا اور بعد کی

---

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۹، ص ۲۲

[۲] تفسیر المنار، جلد ۹، ص ۶۶، ان باتوں کو ابن اسحاق نامی ایک مفسر نے نقل کیا ہے۔

[۳] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۴، ص ۲۰۳

[۴] تفسیر فخر رازی جلد ۸، ص ۸۵، روح المعانی، جلد ۳، ص ۱۷۶، تفسیر قرطبی، جلد ۲ ص ۱۳۵۴

آیات اس بات کو بیان کر رہی ہیں۔

لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس قسم کے پروپیگنڈے کا کوئی شایانِ شان اثر نہیں ہوا اور صدرِ اسلام کے پاک دل اور پاکباز مومنین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس سلسلہ کی پانچویں اور آخری آیت ایک بار پھر فرعون کی موسیٰ علیہ السلام سے جنگ کا ایک اور گوشہ بیان کر رہی ہے۔یعنی جب لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کر رہے تھے اور یہ بات فرعون کے لیے ناگوار تھی اور اس نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو منحرف کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے مختلف قسم کے پروپیگنڈوں کو آزمایا، جن میں ایک یہ ہے جسے درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اس نے پہلے تو اپنی نام نہاد خاندانی شرافت کو پیش کیا اور کہا: ”اس میں تو شک ہی نہیں کہ میں اس شخص (موسیٰ) سے کئی درجے زیادہ برتری رکھتا ہوں، کیونکہ اس کا تعلق ایک پست (بنی اسرائیل کے غلام اور چرواہے) خاندان سے ہے۔“

”اور یہ بھی ہے کہ وہ کھل کر اور پوری وضاحت سے بھی نہیں بول سکتا اور میں اس سے زیادہ فصیح ہوں۔“

”اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں جو اس کی شخصیت کی علامت ہوتے؟“

”اور ان سب سے بالاتر یہ کہ اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے تو اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے تا کہ وہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے۔“

گویا وہ اس طرح کے چار نام نہاد دلائل کے ذریعے موسیٰ کے دعوائے نبوت کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔

قرآن مجید انہی آیات میں کہتا ہے کہ ”اس نے اپنی قوم کا استخفاف کیا، لہٰذا قوم نے اس کی اطاعت کی۔“

”استخفاف“، ”خفیف“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں سبک یعنی ہلکا۔اور یہاں پر یہ مراد ہے کہ فرعون کی کوشش یہ تھی کہ وہ قوم کے افراد کو سبک سر (احمق) بنا دے۔اسی لیے تفسیر مجمع البیان میں پڑھتے ہیں کہ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ ”فرعون نے افرادِ قوم کی عقلوں کو سبک (ہلکا) سمجھا، یا ہلکا کر دیا، تاکہ وہ اس کی اطاعت کریں۔“[1]

تفسیر ”فی ظلال القرآن“ میں ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام الناس کو بے قوف بنانے کا شیوہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کو معرفت کے تمام طریقوں سے باز رکھتے ہیں اور حقائق کے درمیان پردے حائل کر دیتے ہیں تا کہ لوگ سب کچھ فراموش کر دیں اور ان کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔پھر وہ اپنی مرضی کے مسائل عوام میں پیش کرتے ہیں اور انہیں لوگوں کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کے افکار اسی کے مطابق ڈھل جائیں۔اس کے بعد لوگوں کو سبک سر اور بیوقوف بنانا آسان ہو

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۵۱

جا تا ہے اوران پر حکومت کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا اور جدھر کو چاہیں ان کا رخ پھیر دیا جا تا ہے۔[1]

لیکن مزے کی بات ہے کہ قرآن آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: ’’اگر قوم فرعون نے اس کے اس قسم کے پروپیگنڈے کو قبول کرلیا تھا اوراس کی اطاعت کرنے لگ گئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گناہ گار اور فاسق قوم تھی۔‘‘

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومن، بامقصد اور بامعرفت افراد اس قسم کے پروپیگنڈے کا ہرگز شکار نہیں ہوتے۔ یہ فسق اور گناہ ہی ہیں جو اس قسم کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

باالفاظ دیگر جب ’’نفس امارہ‘‘ انسان کے اندر سے اور ’’شیطانی وسوسے‘‘ جیسے فرعون وغیرہ ہیں، اس کے باہر سے مل جاتے ہیں، تو حقیقت کے چہرے کو چھپا دیتے ہیں۔

مزید تشریح

حقائق کو چھپانے میں پروپیگنڈے کا اثر

پروپیگنڈے کے اثرات ہمارے زمانے میں اس قدر واضح ہیں کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ماضی میں بھی یہ مخفی نہیں تھے۔

جو ظالم اور جابر حکمران اپنی حکومت کے لوگوں پر مسلط رکھنا چاہتے ہیں وہ کئی طرح کے پروپیگنڈوں سے کام لیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے افکار اور اذہان کو گمراہ کریں؟ قدیمی مکتب خانوں سے لے کر محراب ومنبر تک اور قہوہ خانوں میں قصہ گوؤں کی داستانوں سے لے کر علمی کتابوں تک۔

غرضیکہ تاریخ کی تحریف، ثناءخوان اور مداح، شعراء کے اشعار، لوگوں کے مقدس مقام اور عقیدت کے مراکز، جھوٹے اور خودساختہ قصے کہانیاں، کرامات اور غیر حقیقی اقدار اور ہر طرح کے دوسرے ذریعوں سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تگ ودو کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک دیو کو پروپیگنڈا کی عظیم موجوں سے فرشتہ کی صورت میں پیش کر دیا جاتا اور شیطان کو ایک مقدس انسان کے لبادے میں سجا کر لوگوں کے سامنے لے آتے۔

بعض مشہور اسلامی تاریخوں میں ملتا ہے کہ شام کے لوگ معاویہ کے اس قدر اطاعت گزار ہو چکے تھے کہ جب وہ صفین کی طرف جانے لگا تو ’’وقت کی تنگی‘‘ کے پیش نظر اس نے نمازِ جمعہ بدھ کے دن پڑھا دی (اور لوگوں نے بھی اس ’’نماز جمعہ‘‘ میں شرکت کی)۔ مروج الذہب میں مسعودی کی عبارت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۷، ص ۳۴۰

"ولقد بلغ من امرهم فی اطاعتهم له انه صلی بهم عند میسرهم الی صفین الجمعة فی یوم الاربعاء"

''لوگوں کی بنی امیہ سے اطاعت اس حدتک پہنچ چکی تھی کہ جب معاویہ صفین کی طرف جانے لگا تو اس نے لوگوں کو جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھادی۔''[۱]

اور یہ واقعہ بھی مشہور ہے، (اگر یہ مشہور تاریخی کتابوں میں نہ ہوتا تو اس کا ماننا مشکل تھا)۔

''کوفے کا ایک شخص اونٹ پر سوار ہوکر دمشق پہنچا اور لوگ اس وقت صفین سے واپس آ رہے تھے۔ اچانک ایک شامی نے اس کا دامن پکڑلیا اور کہا کہ ''یہ ناقہ (اونٹنی) میری ہے جو تو نے صفین میں مجھ سے لی تھی۔'' جھگڑا طویل ہوگیا اور معاملہ معاویہ تک جا پہنچا (شاید اس لیے کہ جھگڑے نے سیاسی رخ اختیار کرلیا تھا)۔ شامی شخص نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پچاس گواہ پیش کردیے جنہوں نے کہا کہ یہ اونٹنی اس (شامی) کی ہے اور معاویہ نے ان (پچاس) لوگوں کی شہادت کی بناء پر اس کا فیصلہ شامی کے حق میں دے دیا۔

کوفی نے پکار کر کہا ''معاویہ! یہ اونٹنی نہیں، اونٹ ہے اور تم خود اسے چل کر دیکھ لو۔ معاویہ سمجھ گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ لہٰذا اس نے کہا ''جو فیصلہ میں نے کرنا تھا کردیا اور بات ختم ہوگئی۔''

جب لوگ منتشر ہوگئے تو معاویہ نے کسی کو بھیج کر اسے اپنے پاس بلایا اور اونٹ کی قیمت سے دوگنی رقم اسے دے کر کہا:

"ابلغ علیا انی اقاباه بماة الف ما فیهم من یفرق بین الناقة والنجمل"

''علیؑ کو میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ میرے پاس تمہارے خلاف لڑنے کے لیے ایک لاکھ ایسے افراد موجود ہیں جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کرسکتے۔''[۲]

قصہ مختصر، گزشتہ تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے شواہد اور نمونے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر ایک عظیم ملت کے افکار اور اذہان کو کیونکر گمراہ کرتے رہے اور کس طرح انہیں سالہا سال تک گمراہیوں اور تاریکیوں میں سرگردان رکھے رہے، جس سے افرادِ ملت زبردست مصائب کا شکار رہے لیکن جب سیاسی حالات تبدیل ہوئے اور وہ جابر شخص اقتدار سے جدا ہوا اور پروپیگنڈے کے پردے ہٹے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ افرادِ ملت خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور جب ان کی نگاہ اپنے ماضی پر پڑی تو اس پر زبردست افسوس کا اظہار کیا اور سخت نادام اور پشیمان ہوئے۔

دورِ حاضر میں پروپیگنڈا مشینری اس قدر طاقتور ہے کہ بعض نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ابلاغ عامہ کچھ پڑھے لکھے اور

---

[۱] مروج الذهب مسعودی، جلد ۲، ص ۷۲، مطبوعہ مصر ۱۳۴۶

[۲] مروج الذهب جلد ۲ ص ۷۲۔ الامام علی صوت العدالة الانسانية جلد ۴، ص ۹۵۶

کسی حد تک باخبر افراد کو ایسے افراد کے انتخاب کے لیے، جو ذرائع کے مالک لوگوں کے منظور نظر ہوتے ہیں، ووٹوں کے صندوقوں تک لے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے منظور نظر اور پسند کے افراد کو ووٹ دیں، حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہیں، جبکہ اس بارے میں قطعاً بے اختیار ہوتے ہیں۔

سمعی و بصری وسائل کی وسعت اور پیشرفت، نفسیات کے لیے فنون لطیفہ اور ظریفہ سے استفادہ نے پروپیگنڈے کے اثرات کو اس قدر وسعت دی ہے کہ باہر کے لوگ جو غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنا چاہیں حیران اور پریشان ہو جاتے ہیں۔

یہ بات سیاسی مسائل کی حد تک محدود نہیں ہے، اقتصادی اور معاشی مسائل میں بھی اس نے اس قدر وسعت پیدا کر لی ہے کہ اچانک اور کسی قسم کی سوچ اور غور و فکر کی فرصت دیئے بغیر پروپیگنڈے کی لہر معاشرے کو ایسی غیر پیداواری اشیاء کے مصرف کی ترغیب دلاتی ہیں جو بسا اوقات معاشرے کے لیے بے سود، بلکہ مضر اور نقصان دہ ہوتی ہیں اور اس طرح سے معاشرے پر غیر صحیح اور ناقص اقتصاد مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

''جھوٹی اقدار'' (مثلاً ''فیشن'' وغیرہ) کے عنوانات سے معاشرے کو غلط اور غیر مشروع مقاصد کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

اسی طرح مختلف فکری مذاہب کے بارے میں پروپیگنڈے کا حال ہے کہ ان کو لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ اپنے طور پر اس قدر پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ایک مکمل بے سروپا مکتب کو منطقی، فلسفی اور انسانی مکتب ثابت کر دیتے ہیں۔

لیکن بہرصورت اس بات میں شک نہیں ہے کہ کسی معاشرے کی معرفت کے ستونوں کو مستحکم کرنے اور افراد کی معرفت کے راستوں کو ہر قسم کی کجروی سے محفوظ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے پردے ہٹائے جائیں جو وسیع ذرائع ابلاغ سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں اور اس سوچ کو دوسروں کے افکار پر مسلط کرتے ہیں۔ ان کی بجائے افراد سوچیں اور غور و فکر کریں۔ ذرائع ابلاغ کا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کی معرفت کو زیادہ سے زیادہ کریں اور صحیح فیصلہ کرنے کے لیے انسانی ذہن کو ہر طرح سے آمادہ کریں اور بس!

ذرائع ابلاغ کا کام ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کے افکار پر پردے ڈالیں بلکہ جہالت، تعصب، کوتاہ اندیشی، اندھی تقلید اور اس قسم کے دوسرے حجابوں کی دھجیاں بکھیرنی چاہییں اور کسی باوقار، باشعور اور ترقی یافتہ معاشرے کے ذرائع ابلاغ کے ترقی یافتہ پروگراموں کو ایک نمونہ ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کی دنیا میں اس قسم کا معاشرہ کہیں خال خال ہی ملتا ہے۔

اصل عیب یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ غالباً سیاستدان کے آلہ کار ہیں، بلکہ اس سے بدتر اقتصادی ڈائنوں کے قبضہ میں ہیں اور مختلف معاشروں کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں ایسی ایسی جگہوں میں لیے پھرتے ہیں جہاں ان کا جی چاہتا ہے۔

۲۰۔ شیطانی وسوسوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی سماعت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۴۳ (سورہ انعام ۴۳)

(۲) وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ۝۲۴ (سورہ نمل ۲۴)

(۳) وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۝۳۸

(سورہ عنکبوت ۳۸)

(۴) وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۝۳۶ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۳۷

سورہ زخرف (۳۶۔۳۷)

(۵) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (سورہ انعام ۱۱۲)

(۶) اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ۝۲۵ (سورہ محمد ۲۵)

(۷) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۝۵ (سورہ فاطر ۵)

ترجمہ

(۱) جب ہماری سزا ان کے پاس آ پہنچی تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا اور) کیوں سر تسلیم ختم نہیں کیا؟ لیکن ان کے دل قساوت پیدا کر چکے تھے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان انہیں انکی نظروں میں

مزین کر دیتا تھا۔

(۲) (لیکن) میں نے اس (ملکہ سبا) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ غیر اللہ، سورج کو سجدہ کر رہے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا ہے اور انہیں راستے سے باز رکھا ہوا ہے اور وہ ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۳) ہم نے عاد اور ثمود کو بھی ہلاک کر دیا اور ان کے (ویران شدہ) ٹھکانے تمہارے لیے آشکار ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو زینت دی ہوئی تھی۔ لہٰذا انہیں راہ (راست) سے باز رکھا، حالانکہ وہ دیکھتے تھے (لیکن تشخیص نہیں کرتے تھے)۔

(۴) جو شخص خدا کی یاد سے روگردانی کرتا ہے تو ہم شیطان کو اس کے لیے بھیج دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) اس ٹولے کو یاد خدا سے روکتے ہیں، جبکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔

(۵) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسان اور جن کے شیطانوں سے ایک دشمن بنایا ہے جو فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو خواب غفلت میں ڈالنے کے لیے) راز کے طور پر (اور کانوں میں) ایک دوسرے کو بتاتے ہیں اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (لیکن انہیں آزمائش کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے)۔

(۶) جن لوگوں نے حق کے روشن ہو جانے کے بعد اس کی طرف پشت کی شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا اور انہیں لمبی آرزوؤں کے ذریعہ فریب میں مبتلا کر دیا۔

(۷) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے۔ مبادا دنیاوی زندگی تمہیں فریب میں مبتلا کر دے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں شیطان خداوند کریم سے مغرور کر دے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''شیطان'' ابلیس کا خاص نام نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا مفہوم عام ہے اور نحوی اصطلاح کے لحاظ سے ''اسم جنس'' ہے جو ہر سرکش، متمرد اور تخریب کار کو شامل ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان، یا کوئی اور چیز اور اس لفظ کی بنیاد دو اقوال پر استوار ہے۔

پہلی یہ کہ اس کا مادہ ''شطون'' (بروزن ستون) ہے جس کے معنی بعد اور دوری ہیں۔ لہٰذا وہ گہرا کنواں جس کی تہہ انسانی دسترس سے دور ہو، اسے ''شطون'' (بروزن زکون) کہتے ہیں اور خلیل بن احمد نحوی نے بھی ''شطن'' (بروزن وطن) کو لمبی رسی کے معنی سے تفسیر کیا ہے اور چونکہ شیطان حق اور رحمت سے دور ہوتا ہے لہٰذا یہ کلمہ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کلمہ ''شیط'' (بروزن بیت) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''غیظ و غضب کی وجہ سے آگ جیسی صورت اختیار کر لینا اور برافروختہ ہو جانا۔ چونکہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے کے سلسلے میں آگ جیسے غصے میں مبتلا ہو گیا تھا، اسی لیے اسے شیطان کہا جاتا ہے اور لفظ ''ابلیس'' اور ابلیس جیسی دوسری مخلوقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[1]

''غرور'' (بروزن شہور) یہ کلمہ ''شرور'' (بروزن شعور) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی دھوکا، فریب اور بیداری کی حالت میں غفلت ہیں اور شیطان کو اس لیے ''غرور'' کہتے ہیں کہ وہ انسان کو اپنے دھوکہ اور فریب کے ذریعہ راہ سے باہر نکال لے جاتا ہے اور اس کی نگاہوں میں حق اور باطل کو دگرگوں کر دیتا ہے۔

ویسے اصولی طور پر ''غرور'' ہر فریب دینے والی چیز کو کہتے ہیں خواہ وہ جاہ و مال ہی یا مقام و منصب، خواہش و شہوت ہو یا شیطان وغیرہ اور اگر کہیں پر اس کی شیطان سے تفسیر کی جاتی ہے تو اس لیے کہ وہ تمام فریب دینے والی چیزوں سے زیادہ خبیث ہوتا ہے۔

''تسویل''، ''سول'' (بروزن قرب) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی ایسی حاجت اور آرزو ہیں جو انسان کو اپنی طرف شوق دلاتی ہے اور ''تسویل'' کے معنی ہیں ''کسی چیز کو ایسا مزین کرنا کہ نفس اس کی طرف رغبت کرنے لگ جائے۔'' اور ''خوبصورت چہرے پر موجود برائیوں کے دکھانے'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ وہ تفسیر ہے جسے راغب نے بھی مفردات میں بیان کیا ہے، جبکہ ''صحاح اللغۃ'' اور ''خلیل بن احمد'' کی کتاب ''العین'' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی ''غرور و غفلت سے ملی ہوئی سستی'' ہیں۔ اسی لیے امور کو مزین کرنا، کسی چیز کو برعکس دکھانا، ناپسندیدہ چیز کو ایسی پسندیدہ صورت میں پیش کرنا کہ انسان اس پر فریفتہ ہو کر سست ہو جائے۔ ان سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

بہرحال آیات مذکورہ میں ''شیطانی تسویلیت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ برائیوں کو انسان کی نظر میں اچھائیاں بنا کر پیش کرتا ہے اور فریب دیتا اور منحرف کرتا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

باطل کو کیسے زینت دیتے ہیں؟

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت گزشتہ اقوام کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کے پاس خدا کے نبی آئے لیکن ان لوگوں نے حق کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ خداوند عالم نے ان کو بیداری اور سخت مشکلات و حوادث سے باخبر ہونے کے لیے فقر و فاقہ، بیماری، خشک سالی، قحط سالی، درد و الم اور رنج و غم سے دوچار کر دیا۔ لیکن وہ بیداری، توبہ اور راہِ حق کی طرف پلٹنے کے بجائے اسی طرح اپنی گمراہی

[1] کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الحکیم۔ کتاب مفردات راغب۔ کتاب لسان العرب اور کتاب مجمع البحرین (مادہ شیطان)

اورانحراف پر قائم رہےاوراسی راہ پر چلتے رہے۔

قرآن مجیداسی آیت میں کہتاہے: جب ہماری ''بیدارکرنے والی سزائیں'' ان کے پاس پہنچیں توانہوں نے کیوں نہ ہمارے سامنے خضوع وخشوع کیااور کیوں نہ سرتسلیم خم کیا؟''

پھراس کے اسباب خودہی بتائے اوروہ دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ کہ ان کے دل تیرہ وتاریک، سخت اورنا قابل اطاعت ہو چکے تھے۔'' **(ولکن قست قلوبھم)**۔

دوسری یہ کہ ''شیطان نے ان کے اعمال کوان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا تھا کہ وہ غلط کاموں کو صحیح اور برائیوں کو اچھائیاں سمجھتے تھے اورشیطان کوان میں اپنااثر ورسوخ قائم کرنے کا موقع اس لیے ملا کہ ان پرخواہشات نفسانی کی پرستش حکم فرماتھی'' **(وزین لھم الشیطان کاکانوا یعملون)**

بالفاظ دیگر نہ تو خدا کے رسولوں کی زبانی نصیحتوں نے ان پر کوئی اثر کیااور نہ ہی خداوند عالم کی عملی اور تکوینی نصیحتیں ان کے لیے کارگر ہوئیں اوراس کا عامل دو چیزیں تھیں، ایک تو قساوت اور سنگدلی اور دوسرے شیطانی زینتیں۔ان دونوں نے مل کران سے خضوع وخشوع اور تضرع وزاری کی روح کوسلب کرلیا۔

اس مقام پر''شیطانی زینتوں'' سے کیا مراد ہے،مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مرادشیطانی وسوسے ہیں جو برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کرکے ان کی نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں، یامختلف خارجی برے اعمال کوشیطان مزین کرکے پیش کرتا ہے، جیسا کہ بعض اوقات سم قاتل اورزہر ہلاہل کو میٹھے کیپسول میں رکھ کرکھلا یا جا تا ہے اورعظیم انحراف اور گمراہیوں کومختلف ناموں مثلاً تمدن، روشن فکری، آزادی فکر وغیرہ کے ساتھ پیش کیا جا تا ہے۔

بعد کی آیت''ہدہد'' پرندے کی زبانی ہے جب وہ ملکہ سبا کی سرزمین گیااوران کے عظیم اورروشن تمدن اوران پرایک عورت (بلقیس) کوحکمت کرتے دیکھااورواپس آکرتمام ماجراجناب سلیمانؑ سے بیان کرنے کے بعد کہا: ''میں نے اسے اوراس کی قوم کودیکھا کہ وہ آفتاب کے سامنے سجدہ کررہے ہیں اورشیطان نے ان کے اعمال کومزین کرکے ان کے سامنے پیش کیا ہواہے۔اسی لیے وہ انہیں راہ سے روکے ہوئے ہے اور ہدایت کے دروازوں کوان پرمکمل بندکیا ہواہے۔''

اس تعبیر سے ظاہرہوتا ہے کہ ''ہدہد'' پرندہ بھی جواپنے عالم میں عقل وہوش کا حامل ہے، معرفت اور آشنائی کے حجابوں سے بھی اجمالی طور پرواقف تھااور جانتا تھا کہ شیطانی زینتیں انسانی فکر کی پردہ پوشی کر دیتی ہیں، اسے حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں، ہدایت کے دروازے اس پر بند کر دیتی ہیں اورمنزل مقصود تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہیں۔

آیا جانور بھی صحیح طریقے پران مسائل سے آشنا ہوسکتے ہیں جو عالم انسانی پر گزرتے ہیں اوراگرایسا ہے تو پھران کی معرفت اور آگاہی کس حدتک ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۱۵ سورہ نمل کی ۱۸ ویں آیت اورجلد ۵ سورہ انعام کی ۳۸ ویں آیت میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

نیز یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ ہدہد نے شام اور یمن کے درمیانی راستے کو طے کیا ہو اور ملکہ سبا کی سرزمین میں جا پہنچا ہو؟ اس بارے میں بھی تفسیر نمونہ کی ۱۹ ویں جلد میں اسی آیت کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔

تیسری آیت میں عاد و ثمود اور ان کی سرکشیوں اور بغاوتوں کا ذکر ہے اور پھر ان کی تباہی کا تذکرہ ہے اور ضمنی طور پر ان کے ویران شہروں اور نیست و نابود ہو جانے والے ٹھکانوں کا تذکرہ ہے جہاں سے عموماً حجاز کے باشندے یمن اور شام کی طرف جاتے ہوئے گزرتے تھے۔ (ایک قوم عاد کی سرزمین تھی اور دوسری قوم ثمود کی)۔ ان شہروں اور ٹھکانوں کو آئینۂ عبرت کے طور پر دکھا رہا ہے، پھر ان کی ہلاکت و تباہی کے اصل اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزین کیا ہوا تھا۔ باوجود یکہ ان کی ظاہری آنکھیں اور عقل و خرد بھی تھے، لیکن شیطان نے ان کی آنکھوں اور ادراک پر پردے ڈال دیئے تھے اور راہِ حق سے انہیں گمراہ کر دیا تھا۔''

(وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل و کانوا مستبصرین)۔

''**و کانوا مستبصرین**'' (وہ بینا اور آگاہ تھے) کا جملہ بہت سے مفسرین کے بقول اس معنی میں ہے کہ وہ صاحبانِ عقل و شعور اور حاملانِ قدرتِ استدلال تھے اور حق و باطل کی پہچان بھی اچھی طرح رکھتے تھے۔ لیکن (شیطانی وسوسوں کی وجہ سے) غفلت کا شکار ہو گئے اور حقائق میں غور و فکر سے کام نہ لیا۔[1]

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ وہ لوگ فطرت کے الہام کی وجہ سے حق کے رستوں کو جانتے تھے، لیکن شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کیا اور انہیں راہِ حق سے بھٹکا دیا۔[2]

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیمات کے ذریعہ حق کی معرفت ہے۔[3]

ان تینوں تفسیروں میں سے جو بھی قابلِ قبول ہو (یا وہ ساری کی ساری قابلِ قبول ہوں، کیونکہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) ہمارے مقصود کی گواہ ہے، کیونکہ شیطانی زینتیں انسانی عقل و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہے۔

چوتھی آیت میں ایک کلی حکم کی صورت میں اس شخص کی سرنوشت کو بیان کیا ہے جو خدا کی یاد سے روگردان ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور شیطانوں کا کام ہمیشہ لوگوں کو غفلت میں ڈالنا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے اور انسان اپنے گمراہ ہونے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہوں پر گامزن ہے، تو اس طرح شیطان ہدایت کی راہیں اس پر بند کر دیتا ہے۔''

مفسرین اور اربابِ لغت نے لفظ ''یعش'' کے دو معانی ذکر کیے ہیں:

بعض مفسرین تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''عشی'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایک خاص تاریکی ہیں، جو آنکھ میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۲۸۳۔ تفسیر روح البیان، جلد ۶، ص ۴۶۸ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ معنی بعض مفسرین سے نقل ہوئے ہیں۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۱۳۱

[3] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۶۶

سے آنکھ بینائی سے محروم ہو جاتی ہے، یا شب کور ہو جاتی ہے (انسان رات کو اندھا ہو جاتا ہے)۔ اسی لیے "عشوا" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا اور راہ چلتے ہوئے اکثر بھٹک جاتا ہے۔ (خبط عشوا بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے) اور "اعشی" اس شخص کو کہتے ہیں جو نابینا ہوتا ہے یا رات کو اندھا ہوتا ہے۔

اس تعبیر کی رو سے آیت کے معنی یہ ہوں گے "جو شخص آیات الٰہی کو اس کائنات میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے اور خدا کے انبیاء کی زبان سے نہ سنے، وہ شیطانی پھندوں اور اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔"

بعض دوسرے مفسرین نے اسے "عشو" (بروزن نشو) کے مادہ سے لیا ہے کہ جب وہ لفظ "الی" کے ساتھ ذکر ہو تو اس کا معنی ضعیف اور کمزور آنکھوں سے ہدایت پانا ہوتا ہے اور جب "عن" کے ساتھ ذکر ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور منہ پھیرنا ہوتے ہیں۔ [۱]

اس تفسیر سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "جو لوگ یاد خدا سے روگردان ہوں گے ہم شیطان کو ان پر مسلط کر دیں گے۔" [۲]

باقی رہا جملہ "نقیض" جو "قیض" (بروزن فیض) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی "انڈے کا چھلکا" ہیں، تو یہ مسلط کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ آیت میں اس لفظ کا استعمال نہایت ہی قابل توجہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ان پر اس قدر مسلط ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیتا ہے اور ان کا رابطہ باہر کی دنیا سے مکمل طور پر منقطع کر دیتا ہے اور کسی انسان کی معرفت کے لیے یہ بدترین حجاب ہوتا ہے اور یہ تعبیر کلمات عرب میں بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں "استیلا القیض علی البض" (انڈے پر چھلکے کا تسلط)

اس سے بدتر یہ کہ شیطان کا یہ تسلط اور گھیرا برابر جاری رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس کی نوبت اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی پر ناز کرنے لگتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ راہِ ہدایت پر ہے۔ (ویحسبون انھم مھتدون)۔

پانچویں آیت میں ان جنوں اور انسانوں کے شیاطین کا ذکر ہے جنہوں نے انبیاء کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور ان کی تعلیمات اور تبلیغات کو بے اثر کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ وہ فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تاکہ اس طرح سے لوگوں کو خواب غفلت میں پڑا رہنے دیں اور حقائق کو ان سے چھپائے رکھیں اور شیاطین ایک دوسرے کو فریب اور نیرنگ کے طریقے سکھاتے ہیں تاکہ حقیقتوں کے چہرہ پر پردہ ڈالے رکھیں اور لوگوں کو انبیاء کی تعلیمات سے دور رکھیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں "شیاطین" جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے جبکہ "عدو" مفرد کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ

---

[۱] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر یہ لفظ "عشا یعشو" کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے آنکھ میں کسی بیماری کے بغیر خود کو اندھا بنا لینا اور اگر عشی یعشی کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ آفت جو آنکھ میں ہوتی ہے۔ (تفسیر روح البیان جلد ۸ ص ۳۶۸) لیکن یاد رہے کہ زیر بحث آیت میں یہ "عشا یعشو" کے مادہ سے ہے۔

[۲] لسان العرب، مفردات راغب، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان اور تفسیر المیزان کی طرف رجوع فرمائیں۔

تعبیر اس لیے ہو کہ تمام شیاطین لوگوں کے اغواء اور گمراہ کرنے کے سلسلے میں متحد، متفق اور ایک دشمن کی مانند عمل کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں پر "عدو"، "اعداء" کے معنی میں ہے۔ (یعنی مفرد کا صیغہ جمع کے معنی دے رہا ہے)۔[1]

جبکہ بعض دوسرے حضرات نے تصریح کی ہے کہ ''عدوٗ'' کا اطلاق، مفرد، تثنیہ اور جمع تینوں پر ہوتا ہے۔[2]

چھٹی آیت کا تعلق سورہ محمد سے ہے اور اس سورت میں معرفت کے بہت سے حجابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی تو فساد فی الارض اور قطع رحمی کو باطنی نابینائی اور بہرے پن کا سبب بتایا گیا ہے (آیت ۲۳) اور کبھی قرآن میں غور وفکر نہ کرنے کو دلوں پر قفل پڑنے کے ہم ردیف قرار دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی شیطان وسوسوں اور ابلیسی زینتوں اور آرزوؤں کو گمراہ لوگوں کے مرتد ہو جانے کا سبب بتایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ جو لوگ پہلے تو راہ حق کو پا لیتے ہیں لیکن پھر شیطانی آرزوؤں کی بنا پر منحرف ہو جاتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس انحراف کو قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا یہ آیت اس یہودی قوم کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے تھی اور وہ لوگ جو نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھ چکے تھے ان کی بناء پر آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے لیکن جب ظہور رسالت ہوا تو مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے جو بذات خود ایک طرف کا ارتداد ہے۔

یا ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے پہلے تو حق کو قبول کر لیا اور بعد میں منحرف ہو گئے۔

یا ظاہر میں تو مان لیا لیکن باطن میں مخالف ہو گئے۔

لیکن اگر آیات کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اکثر کا تعلق منافقین سے ہے۔ اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی طرف اشارہ ہو، ایسے منافقین جنہوں نے ابتداء میں تو حق کو پہچان لیا لیکن بعد میں اس سے روگردان ہو گئے۔

"املی لھم" کا جملہ "املاء" سے ہے جس کے معنی لمبا کرنا اور مہلت دینا ہیں۔[3] اور یہاں پر مراد شیطان کی طرف سے لمبی چوڑی اور دور دراز کی آرزوؤں کا ایجاد کرنا ہے، ایسی آرزوئیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور اس کی نگاہوں میں باطل کو مزین کر دیتی ہیں اور اسے حق سے باز رکھتی ہیں۔

اسی سلسلے میں ساتویں اور آخری آیت با آواز بلند اور ببانگ دہل لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ خدا کا وعدہ برحق ہے۔ اس کے بعد حق سے انحراف، دھوکہ کھانے اور معرفت سے باز رہنے کے دو عوامل کا ذکر کرتا ہے۔ پہلا عامل دنیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ''مبادا دنیاوی زندگی

---

[1] روح المعانی جلد ۸ ص ۴

[2] المنار، جلد ۸، ص ۵

[3] یاد رہے کہ یہ لفظ دراصل "ملو" (بروزن سرو) کے مادہ سے ہے نہ کہ ''ملأ'' ہمزہ کے ساتھ۔

تمہیں فریب دے“ اور دوسرا عامل شیطان ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے ”کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں خدا کے بارے میں دھوکہ دے دے۔“ کبھی تو وہ تمہیں اس کے رحم و کرم کا امیدوار بنا کر اس کے عذاب سے بے خبر کر دیتا ہے اور کبھی تمہیں اس قدر سرگرم کر دیتا ہے کہ بالکل ہی خدا اور اس کے فرمان کے بارے میں تو سوچتے ہی نہیں، یا پھر اس کے احکام و فرامین کو برعکس کر کے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔

”غرور“ (بروزن شرور) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہر دھوکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ جاہ و مال ہو یا مقام و منصب، خواہ خواہشات نفسانی ہوں یا شہوات شیطانی اور خواہ فریب کار انسان ہو یا شیطان۔ لیکن چونکہ واضح ترین اور خبیث ترین فرد شیطان ہے لہٰذا عام طور پر اسے شیطان سے ہی تفسیر کرتے ہیں۔ [1]

”لا یغرنکم باللہ الغرور“ کی تعبیر بہت سے مفسرین کے عقیدہ کے مطابق شیطان کے انسان کو خدا کے فضل اور رحم و کرم کے ذریعہ دھوکہ دینے کی طرف اشارہ ہے اور وہ اسے اس قدر فریب میں ڈال دیتا ہے کہ وہ ہر گناہ سے آلودہ ہو جاتا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ اقدام اس کے ایمان و معرفت کے کمال کی دلیل ہے کہ اس نے خدا کو ان (رحمان و کرم اور فضل کی) صفات کے ساتھ پہچانا ہے!!

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کو دھوکہ دے کر اس عنوان سے زہر کھلا دیں کہ وہ طاقتور ہے اور زہر کے اثرات کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہے، یا اس کے پاس زہر کا تریاق ہے۔ اس طرح سے تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

مزید تشریح

شیطان کون ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں شیطان ایک فرد کا نام نہیں ہے، بلکہ ”ابلیس“ جس نے جناب حضرت آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا تھا، شیاطین میں سے ایک تھا۔

اس کے پاس اپنی جنس کے بھی بہت سے فوجی سپاہی ہیں اور انسانوں سے بھی۔ اور شیطان کا نام سب پر بولا جاتا ہے۔ اسی لیے کفر، ظلم، شرک، فساد فی الارض کرنے والوں کے سرغنے اور گمراہ کرنے والے تمام کارندے، غرض سب کے سب شیطان کے فوجی ہیں بلکہ ایک روایت کی رو سے تو انسانی شیطانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو جنات شیطانوں سے بدتر ہیں، جیسا کہ ہم حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپؐ نے ابوذرؓ سے فرمایا:

”ھل تعوذت باللہ من شر شیاطین الجن والانس“

---

[1] ”غرور“ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

''یعنی آیا تو نے جن وانس کے شیطانوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب کر لی ہے؟''

تو انہوں نے عرض کی:

''آیا انسانوں میں بھی شیطان ہیں؟''

تو رسالت مآبؐ نے فرمایا:

"نعم هم شر من شياطين الجن"

''جی ہاں! بلکہ وہ تو جنات کے شیطانوں سے بھی بدتر ہیں۔''[۱]

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے پاس باقاعدہ منظم لشکر ہیں جن میں سے کچھ سوار ہیں اور کچھ پیدل ۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے:

"واجلب عليهم بخيلك ورجلك"

''بے شک تو اپنے سوار اور پیدل، غرض سب کو انسانوں کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کرے۔'' (بنی اسرائیل ٦٤)

"اجلب"، "اجلاب" کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں فوری جمع آوری، یا کسی جماعت اور گروہ کو چلنے کے لیے نعرے لگانا۔ شیطان کے سوار اور پیدل لشکر سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ جو شخص بھی خدا کی نافرمانی کے لیے سوار ہو کر یا پیدل چل کر جاتا ہے یا اس راستے میں جنگ کرتا ہے، وہ شیطان کا سوار اور پیدل لشکر ہے۔[۲]

بعض نے کہا ہے کہ اس کا صحیح معنوں میں سوار لشکر بھی ہے اور پیدل فوج بھی، جو اس کے یار و مددگار ہیں۔

بعض نے اسے کنایہ کے معنی پر حمل کیا ہے اور کہا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اس نے مقابلے کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ انسان کے مقابلہ کے لیے آتا ہے۔[۳]

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کا سوار لشکر کفر، ظلم اور فساد کے سرغنے ہیں اور اس کی پیدل نچلے یا متوسط قسم کے لوگ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کے سوار لشکر سے انسان کی شہوات اور صفات رذیلہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے قلب و روح پر مسلط ہو جاتی ہیں اور اس کی پیدل فوج سے مراد وہ عوامل ہیں جو باہر سے آکر انسان کو منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۱۵۴

[۲] قرطبی نے اس تفسیر کو اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے۔

[۳] فخر رازی نے اس تفسیر کو ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (جلد ۲۱، ص ٦) اور تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی اسی طرح کی بات ہوئی ہے۔ (جلد ۵، ص ۳۴۳)

۲۔ایک سوال اوراس کا جواب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ خداوند عالم ہمیں ایسے طاقتور لیکن بے رحم لشکر کے سامنے تن تنہا اور بے یارو مددگار چھوڑ دے اور کیا یہ چیز اس کی حکمت اور اس کے عدل سے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے پر توجہ کرنے سے مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح قرآن مجید میں آیا ہے کہ خداوند عالم مومنین کو فرشتوں کے ذریعہ منظم کرتا ہے اور اپنی غیبی اور معنوی طاقتیں ان لوگوں کے ہمراہ کر دیتا ہے جو جہاد نفس اور جہاد دشمن میں بھر پور حصہ لیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

''بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر ڈٹ گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ تو ڈرو اور نہ ہی غم کھاؤ اور تمہیں اس بہشت کی خوشخبری ہو جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا اور ہم تمہارے اس دنیاوی زندگی میں بھی یار و مددگار تھے اور آخرت میں بھی۔'' (سورہ فصلت ۳۰۔۳۱)

۳۔ایک اور اہم نکتہ

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شیطان کبھی بھی ہمارے دل کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوتا اور ہماری روح کے ملک میں پاسپورٹ کے بغیر قدم نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ غافل گیر کر کے حملہ کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود ہماری ہی اجازت سے اندر داخل ہوتا ہے۔ جی ہاں! وہ دروازے سے اندر آتا ہے روشندان یا کھڑکی سے نہیں۔ ہم خود ہی اس کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولتے ہیں۔ جس طرح قرآن کہتا ہے:

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۹۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝۱۰۰

''اس کا تسلط ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ (بلکہ) اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اسے اپنی سرپرستی کے لیے انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں (یعنی اس کے فرمان کو بھی خدا کے فرمان کے برابر سمجھتے ہیں۔'' (سورہ نحل ۹۹۔۱۰۰)

اصولی طور پر یہ انسان کے اعمال ہی ہیں جو شیطان کے اثر ورسوخ کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ كَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ

''فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔(بنی اسرائیل ۲۷)

لیکن ہر حالت میں اس کے اور اس کے مختلف لشکریوں کے رنگ برنگے داموں سے جو شہوات کی مختلف صورتوں یعنی بدکاری کے اڈوں کی شکل میں، استعماری سیاست کے روپ میں، انحرافی مکاتب فکر کے انداز میں، فاسد اور مفسد ثقافت کی صورت میں قدم قدم پر موجود ہیں، نجات حاصل کرنے کے لیے ایمان، تقویٰ، سایہ لطف و رحمت پروردگار اور اپنے آپ کو اس کی ذات کے حوالے کر دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے:

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّیۡطٰنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۳﴾

''اگر خدا کا فضل و کرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب اس شیطان کی پیروی کرتے۔''(نساء ۸۳)

یہاں پر معرفت کے بیس حجابوں کا تفصیلی تذکرہ اختتام کو پہنچتا ہے۔ اب ہم معرفت کے ذرائع کا پتہ چلاتے ہیں۔

۵۔معرفت کے ذرائع

اشارہ

جس طرح بیج آمادہ زمین میں اگتے ہیں اور شورہ زار زمین میں کبھی پھول نہیں کھلتے ،خواہ وہاں پر بہترین بیج کاشت کیا جائے اور آب باران سے اس کی آبیاری کی جائے ، اسی طرح معرفت کا بیج بھی فقط آمادہ دلوں میں نشوونما پاتا ہے اور معرفت کے پھول پاک و پاکیزہ روحوں میں کھلتے ہیں۔

اسی وجہ سے ان صفات ،روحیات اور اعمال سے آگاہی جو معرفت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔''شناخت ومعرفت'' سے متعلق اہم ترین مباحث میں سے ہیں۔اس بارے میں قرآن مجید نے نہایت ہی بامعنی تعبیرات اور بہت ہی لطیف وزیبا اشاروں سے کام لیا ہے۔

اگر چہ معرفت کے ذرائع بہت ہیں لیکن زیادہ اہم اصول کہ جن کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تقویٰ

۲۔ ایمان

۳۔ خوف اور احساس ذمہ داری

۴۔ تزکیہ نفس

۵۔ ہوشیاری

۶۔ آگاہی

ان میں سے ہر ایک امر کو جداگانہ فصل میں بیان کیا جائے گا۔پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو بیان کیا جائے گا، پھر اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوگی اور اس بارے میں اسلامی روایات سے بہرہ برداری کی جائے گی تاکہ موضوع کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔

۱۔تقویٰ اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ (سورہ بقرہ ۲-۱)

(۲) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (سورہ انفال ۲۹)

(۳) وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۸۲

(سورہ بقرہ ۲۸۲)

(۴) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸ۙ

(سورہ حدید ۲۸)

ترجمہ

(۱) یہ باعظمت کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور پرہیز گاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

(۲) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم خدا (کے فرمان) کی مخالفت سے پرہیز کرو تو وہ تمہارے لیے ”فرقان“ (باطل سے حق کی جدائی کا ذریعہ) قرار دے گا۔

(۳) اور خدا سے ڈرو اور خدا تمہیں تعلیم دے گا اور خداوند عالم ہر چیز کو جانتا ہے۔

(۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کر دے اور تمہارے لیے ایسا نور قرار دے جس کے ذریعہ سے تم اپنی راہ کو پیدا کرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خداوند عالم غفور اور رحیم ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

”تقویٰ“ دراصل ”وقایہ“ (بروزن درایہ) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ”کسی چیز کو آفات سے بچانا۔“ پھر وہ کہتے ہیں کہ ”تقویٰ کے معنی ہیں روح اور نفس کو ان چیزوں سے بچانا جن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ڈر، خوف (اور پرہیز) کو بھی تقویٰ کہا جانے لگا اور زبان شرع میں گناہوں اور حرام کاموں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام تقویٰ ہے اور کمال تقویٰ یہ ہے کہ بعض مشکوک مباح چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔“[1]

---

[1] مفردات راغب مادہ ”وقی“

دوسرے ارباب لغت نے بھی مندرجہ بالا مفہوم سے ملتا جلتا مفہوم بیان کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی ''صانت''[1] (بچاؤ) اور بعض نے ''اتقاء'' کے معنی ''برائیوں اور ہوا وہوس سے رکنا'' بیان کیے ہیں۔[2]

بعض مفسرین نے بعض صحابہ کرامؓ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب آنحضرتؐ سے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

''آیا تم کسی پرخار رستے سے گزرے ہو؟ جب مثبت جواب سنا تو فرمایا، تو اس وقت کیا کرتے تھے؟ آیا اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر اور کانٹوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ اسی کا نام تقویٰ ہے۔''

جی ہاں! زندگی کی راہیں طے کر کے خدا تک پہنچنے کے رستے میں کئی قسم کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ خواہشات نفسانی، ہوا وہوس، جھوٹی امیدوں، لمبی آرزوؤں اور لغزشوں کے کانٹے قدم قدم پر انسان کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ہوشیار اور خبردار رہے مبادا اس کی روح کا دامن ان کانٹوں سے الجھ پڑے اور تار تار ہو جائے، مبادا کسی کانٹے کی نوک اس کی جان کے پاؤں میں چبھ جائے اور اسے زخمی کر ڈالے، مبادا کوئی کانٹا اسے اس راستے کے طے کرنے سے باز رکھے اور اپنی جانب متوجہ کر لے۔

اور یہ اس وقت ہوگا جب انسان ہمیشہ بیدار، خبردار، آگاہ اور ہر طرح سے ہوشیار رہے۔

سادہ ترین الفاظ میں تقویٰ روح کے ارتقاء کو درپیش آنے والی آفات سے پرہیز اور گناہوں اور شبہات سے بچنے کا نام ہے۔

بعض مفسرین نے تقویٰ کے متعدد معانی ذکر کیے ہیں اور ان معانی کے لیے قرآنی آیات سے شواہد اور دلائل بھی پیش کیے ہیں، حقیقت میں جن میں سے ہر ایک معنی تقویٰ کے مصداقوں میں سے ایک مصداق ہے، مثلاً توبہ، اطاعت، اخلاص، ایمان (پرستش اور توحید)۔[3]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی آفت کے مقابلے میں کسی چیز کو ڈھال قرار دے۔ جس طرح انسان ڈھال کے ذریعہ اپنے دشمن کے وار کو روکتا ہے اسی طرح پرہیزگار افراد بھی فرمانِ الٰہی کی اطاعت کے سپر کے ذریعہ اپنے آپ کو عذاب خداوندی سے بچا لیتے ہیں۔[4]

بعض لوگوں نے تقویٰ کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے: کفر کے مقابلے میں تقویٰ، گناہ کے مقابلے میں تقویٰ اور ان چیزوں کے مقابلے

---

[1] لسان العرب، وہی مادہ

[2] مجمع البحرین، وہی مادہ۔ (توجہ رہے کہ ''تقویٰ'' کا اصل لفظ ''وقوی'' تھا بعد میں ''واؤ'' کو ''تا'' میں تبدیل کر دیا گیا، جیسا کہ خلیل بن احمد نے کتاب العین میں لکھا ہے۔

[3] وجوہ القرآن، ص ۵۵ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[4] روح البیان، جلد ۱، ص ۳۰

میں تقویٰ جو انسان کو یادِ خدا سے غافل کر دیتی ہیں۔[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب معانی اس اصل کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کا آغاز میں ذکر ہوا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

تقویٰ اختیار کرو تا کہ نورِ علم تمہارے دلوں میں روشن ہو

سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے "یہ آسمانی کتاب صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگاروں کے لیے موجب ہدایت ہے۔" اس تعبیر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ ہدایت کی راہیں ہموار کرنے کے لیے کس قدر موثر ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جب تک انسانی وجود میں ایک مرحلے کی حد تک تقویٰ موجود نہ ہو، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ آسمانی کتابوں اور ہدایت کے سرچشموں سے بہرہ ور ہو۔ تقویٰ کی کم سے کم حد یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے سرِتسلیم ختم کر لے اور ہٹ دھری، عناد اور دشمنی کا مظاہرہ نہ کرے۔ جو لوگ تقویٰ کے اس مرحلے سے بھی محروم ہیں یقیناً وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی کسی ہدایت کو قبول کر سکتے ہیں۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان میں تقویٰ اور حق کے آگے سرِتسلیم خم کرنے اور حقائق کو قبول کرنے کی روح جس قدر طاقتور ہو گی منابع ہدایت سے بھی وہ اتنا زیادہ بہرہ ور ہو گا۔

ہدایت کے منابع کہ جن میں قرآن مجید سرِفہرست ہے، کی مثال ایسی ہے جیسے زندگی عطا کرنے والی بارش ہوتی ہے جو صرف آمادہ اور شیریں زمینوں میں معرفت کے مختلف النوع پھول اگاتی ہے کیونکہ شورہ زار اور کلراٹھی زمین میں تو صرف خس و خاشاک ہی اگتے ہیں۔

"ھدی" (ہدایت کو مصدر کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ اگر انسان میں تقویٰ کی روح زندہ ہو جائے تو قرآن اس کے لیے مجسم ہدایت ہوتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ اس عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرہیزگار لوگ دو طرح کی ہدایت کے حامل ہیں جیسا کہ کفار و منافقین دو طرح کی ضلالت (گمراہی) کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت تو انہیں فطرت کی سلامتی کی جانب سے حاصل ہوتی ہے اور اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک ایسی حقیقت کی ضرورت ہے جو اس کے وجود سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وہ حس سے مخفی ایک مبداء کے وجود پر ایمان پیدا کرتا ہے کیونکہ اس ضرورت کو وہ دوسری مخلوق میں بھی دیکھتا ہے اور وہ اس حقیقت پر بھی پہنچتا ہے کہ جس طرح تخلیقی امور میں اس کی کسی بھی ضرورت کے پورا کرنے سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے، اس چیز کی ہدایت جو اعمال اور اخلاق کی تباہیوں سے اسے بچاتی ہے کا

---

[1] روح البیان، جلد ا، ص ۳۱

مسئلہ بھی اس کے بارے میں انجام پاتا ہے اور یہی چیز درحقیقت توحید، نبوت اور معاد پر ایمان ہے، جو دین کے اصلی اصول ہیں۔ [۱]

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآنی ہدایت کو پرہیز گاروں کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ صرف وہی لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور چونکہ دوسرے لوگ اس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھاتے، لہٰذا قرآن کی ہدایت ان سے منطقی ہے۔ [۲]

فخر الدین رازی اپنی ایک تعبیر میں اس طرح کا نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر متقین کے لیے اس آیت کے علاوہ کوئی اور فضیلت نہ بھی ہو، پھر بھی کافی ہے اور یہ فضیلت دوسری تمام فضیلتوں پر بھاری ہے۔ ادھر دوسری طرف قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن "ھدی للناس" (تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے)۔ اگر اس آیت کو اور مذکورہ آیت کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ "جو لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، درحقیقت انسان کے زمرے ہی میں ان کا شمار نہیں ہے۔" [۳]

اگرچہ ان تمام تفسیروں میں کسی قسم کی منافات نہیں ہے لیکن جو تفسیر ہم نے آغاز میں بیان کی ہے وہ سب سے زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لفظ "متقین" کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تقویٰ کی راہ پر چلیں تاکہ تحصیل حاصل (حاصل شدہ چیز کو حاصل کرنا) کا اشکال پیش نہ آئے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں تقویٰ کے کئی مراحل ہیں۔ اس کا ایک مرحلہ تو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ اس کے بالاترین مراحل قرآنی ہدایت کا موصول ہوتے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید "ھدی للمتقین" کے بعد والی آیات میں پرہیز گاروں کا اس عنوان سے تعارف کراتا ہے کہ وہ مبدا و معاد پر ایمان رکھتے ہیں، نماز برپا کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ تو کیا قرآن ہدایت ان کے لیے تحصیل حاصل نہیں ہے؟

لیکن ایک نکتہ پر توجہ دینے سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور عمل کے اس مرحلہ تک پہنچ جانا آخری مرحلہ نہیں ہوتا۔ ابھی انسان کے شایانِ شان ارتقائی مراحل تک پہنچنے کے لیے کئی اور مراحل درمیان میں ہیں کہ جنہیں طے کیا جانا ضروری ہے اور متقین اور پرہیز گار افراد تقویٰ کے اس مرحلہ تک پہنچنے کے بعد قرآن ہدایت کی روشنی میں اس سے بالائی مراحل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس قسم کی دوسری تعبیریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورہ حاقہ کی ۴۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے "وانه لتذكرة للمتقين" یقیناً قرآن مجید پرہیز گاروں کے لیے یاد آوری کا ذریعہ ہے۔

سورہ بقرہ کی دوسری آیت قرآن کو "پرہیز گاروں کے لیے ذریعہ ہدایت" بیان کرتی ہے اور یہاں پر ذریعہ تذکرہ و یاد آوری تو معلوم ہے کہ "تذکر"، "ہدایت" کے مقدمات میں سے ہے۔ اسی لیے کچھ مفسرین ایسے ہیں کہ جب وہ آیت پر پہنچتے ہیں تو کہا ہے کہ اس آیت میں بھی

---

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۴۲

[۲] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[۳] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۱

وہی بات ہے جو سورہ بقرہ میں ہے۔

بہرحال ان آیات کی حالت اس بات کی شاہد ناطق ہے کہ تقویٰ کی تاثیر ہدایت اور معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت تقویٰ اور معرفت کے رابطے کو پہلے سے زیادہ طور پر واضح کرتی ہے۔ روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور ارشاد ہو رہا ہے ''اے مومنین! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو خداوند عالم تمہارے لیے فرقان قرار دے گا۔''

بعض ارباب لغت کی تصریحات بتاتی ہیں کہ لفظ ''فرقان''، ''اسم مصدر'' ہے اور بعض کے نزدیک ''مصدر'' ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کی تصریح کے مطابق اس قسم کے مقامات پر فاعل کے معنی میں ہے اور ساتھ ہی تاکید بھی پائی جاتی ہے، (صیغہ مبالغہ کے مفہوم کے مشابہ) اور اس کے معنی ہیں وہ چیز کہ جس کے ذریعہ حق کو باطل سے جدا کیا جائے۔ اس کا وسیع مفہوم ہے جو کہ قرآن مجید، معجزات انبیاء، عقلی روشن دلائل، شرح صدر، باطنی اور معنوی توفیق اور نورانیت وغیرہ سب کو شامل ہے۔[1]

اس طرح سے قرآن مجید کہتا ہے کہ ''تقویٰ'' معرفت کی راہیں ہموار کرتا ہے، جو بعض مراحل میں مکمل طور پر قابل استدلال ہوتا ہے اور بعض دوسرے مراحل میں خداوند عالم کی غیبی امدادوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے جنگ بدر کے دن کو ''یوم الفرقان'' سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس دن خداوند عالم کی طرف سے لشکر کفر کے مقابلے میں لشکر ایمان کو واضح تائید حاصل ہوئی تھی۔ دشمنانِ اسلام ساز و سامان اور افرادی قوت کے لحاظ سے تین گنا زیادہ تھے لیکن سپاہ اسلام سے وہ شکست فاش کھائی کہ کوئی اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور چونکہ جنگ بدر مسلمانوں اور مشرکوں میں پہلی مسلح جنگ تھی، لہٰذا اہل حق کی صفیں اہل باطل سے جدا ہو گئیں۔ اسی لیے اسے ''یوم الفرقان'' لکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں ''فرقانا'' کو نکرہ اور مطلق صورت میں بیان کیا گیا ہے جو ایک طرف تو اس کی عظمت کی دلیل ہے اور دوسری طرف اس کی وسعت کی اور وہ اعتقادی، عملی اور زندگی کے ہر قسم کے اہم امور کے بارے میں ہر قسم کی اظہار رائے کو شامل ہے۔ اس طرح سے درخت تقویٰ کا پھل ہر خیر و برکت کی شناخت تک رسائی اور ہر طرح کے شر و فساد سے دوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مطلق ہے۔ لہٰذا اسے کفار اور مومنین کے درمیان ہر قسم کے فرق اور جدائی پر حمل کرنا چاہیے اور یہ فرقان یا تو دنیاوی احوال کے بارے میں ہے یا اخروی احوال کے یا قلب و باطن سے متعلق ہے یا ظاہر سے۔ قلب اور باطن کے سلسلے میں یہ ہے کہ خداوند عالم مومنین کو ہدایت اور معرفت عطا کرتا ہے اور انہیں شرح صدر کی نعمت سے نوازتا ہے، حسد، کینہ اور دشمنی کو ان کے دلوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جبکہ کفار اور منافقین کے دل اس قسم کی بری عادات سے معمور ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب دل، اطاعتِ الٰہی سے منور ہوتا ہے تو اس سے یہ تمام تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور ظاہری لحاظ سے بھی خداوند عالم مسلمانوں کو برتری،

---

[1] مفردات راغب، کتاب العین، لسان العرب، مجمع البحرین، المیزان اور کشاف کا مطالعہ فرمائیں۔ (زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

کامیابی، نصرت اور ظفر عطا فرماتا ہے۔[۱]

اسی سلسلے کی تیسری آیت جو قرآن کی سب سے لمبی آیت (بقرہ ۲۸۲) کا چھوٹا سا حصہ ہے، جس میں مختلف ہدایات اور فرامین کے بعد فرماتا ہے ''خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور خداوند عالم تمہیں تعلیم دیتا ہے۔''

''قرطبی'' اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ''یہ خدا کا ایک وعدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا خدا اسے تعلیم دے گا یعنی اس کے دل میں ایک نور قرار دے گا کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہر اس چیز کا ادراک کرے گا جو اس کی طرف القاء کی جائے۔''[۲]

اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم علم و دانش کے حصول سے دستبردار ہو جائیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس ہی کافی ہے جیسا کہ بعض صوفیا اور دیگر منحرف قسم کے لوگ کہتے ہیں۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ تقویٰ صحیح معنوں میں علم و دانش کے حصول کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے تیار شدہ اور اچھی زمین ہر قسم کی تخم ریزی کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ''اتقوا اللہ'' اور ''یعلمکم اللہ'' کے دونوں جملے شرط اور جزاء کی صورت میں ذکر نہیں ہوئے اور یہی بات سبب بن گئی ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت سے علم و تقویٰ کے رابطے کا انکار کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے پہلو میں واقع ہونا بھی بے حساب نہیں ہے اور ان کے آپس میں رابطے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بغیر آیت کے جملوں کا باہمی رابطہ زیر سوال آ جائے گا۔

چوتھی اور آخری آیت میں تقویٰ اور معرفت کے درمیان باہمی رابطے کی ایک بار پھر بخوبی وضاحت کی گئی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور رسول پاکؐ پر ایمان لے آتے ہیں ان کو تین قسم کی جزا ملتی ہے۔

ایک تو یہ کہ خداوند عالم ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دو حصے عطا فرمائے گا، ایک بوجہ ایمان کے اور دوسرا بوجہ تقویٰ کے، یا ایک حصہ بوجہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے اور دوسرا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے، کیونکہ باوجود یکہ آیت میں مخاطب مومنین ہیں اور انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور آیت کا شان نزول بھی بتا رہا ہے کہ یہ حبشہ کے ان اہل کتاب اور عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے قرآن کو سنا اور آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے۔[۳]

دوسری یہ کہ خداوند عالم ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے لیے ایک نور قرار دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنے رستہ پر چلیں گے۔ (ویجعل لکم نورا تمشون بہ)۔

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵ ص ۱۵۳ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

[۲] تفسیر قرطبی، جلد ۲ ص ۱۲۱۴

[۳] کفل (بروزن طفل) کے معنی ایسا فائدہ ہیں جس سے انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ درحقیقت ایک حبشی لفظ ہے جو لغت عرب میں وارد ہوا ہے۔

اگر چہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو مقید کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اس نور کی طرف اشارہ جانا ہے کہ جو بروز قیامت مومنین کے آگے آگے اور دائیں طرف میں حرکت کرے گا، جیسا کہ سورہ حدید کی ۱۲ ویں آیت میں مذکور ہے کہ "یوم تری المومنین والمومنات یسعی نورھم بین ایدیھم و بایمنھم"۔ لیکن ہماری زیر بحث آیت میں قید کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ لیکن اس کا مفہوم عام ہے جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے اور یہ دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ تو گویا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''تقویٰ'' اور ''روشن بینی'' کے درمیان ایک قوی رابطہ ہے۔

تیسری یہ کہ ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا اور وہ اس کی رحمت خاص میں شامل ہو جائیں گے۔ (ویغفرلکم واللہ غفور رحیم)

مزید تشریح

ا۔ احادیث میں علم اور تقویٰ کا رابطہ

اسلامی روایات میں بھی علم پر تقویٰ کی تاثیر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان روایات سے بخوبی واضح ہو گیا ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ قلب اور روح کی طہارت معارف الٰہیہ کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ فرمائیں:

۱۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"من غرس اشجار التقی جز ثمار الھدی"

''جو تقویٰ کے درخت کاشت کرتا ہے وہ ہدایت کے پھل چنتا ہے۔''[1]

۲۔ امیر المومنین علی علیہ السلام ہی کے ایک خطبہ میں آیا ہے:

"اما بعد فانی اوصیکم بتقوی اللہ...... فان تقوی اللہ دواء قلوبکم و بصر عمی افئدتکم و شفاء مرض اجسادکم و صلاح فساد صدورکم و طھور و نس انفسکم وجلاء عشاء ابصارکم" اما بعد

''میں تمہیں خدا کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں............ کیونکہ خدا کا تقویٰ تمہارے بیمار دلوں کی دوا، تمہارے دلوں کی بینائی کا سبب ہے، تمہارے جسموں کے دردوں کی دوا ہے، تمہاری جانوں کے زخموں کی مرہم ہے،

[1] غرر الحکم

تمہاری آلودہ روحوں کی طہارت ہے اور تمہاری آنکھوں کی نابینائی کی جلا ہے۔"[۱]

۳۔ ایک اور روایت میں آنجنابؑ ہی سے منقول ہے:

"للمتقی ھدی فی رشاد و تحرج عن فساد"

"متقی کے لیے سوجھ بوجھ پر مبنی ہدایت ہے اور فساد سے پرہیز ہے۔"[۲]

۴۔ نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"این العقول المستصبحة بمصابیح الهدی والابصار اللامحة الی منار التقوی"

"کہاں ہیں چراغ ہدایت سے روشن ہونے والی عقلیں اور کہاں ہیں نورِ تقویٰ سے دیکھنے والی آنکھیں؟"[۳]

۵۔ اپنی اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں، آپؐ فرماتے ہیں:

"حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ وصیت کی کہ: "یا موسی وطن نفسك علی البصر تخلص من الذنب" اے موسیٰ اپنی جان کو صبر کے لیے آمادہ کرلو تاکہ حلم اور بردباری تک رسائی حاصل کرو، تقویٰ کو اپنے دل میں جگہ دو تاکہ علم و معرفت تک جا پہنچو اور اپنے نفس کو صبر کے ساتھ ریاضت دو تاکہ گناہوں سے بچ جاؤ۔"[۴]

۲۔ علم اور تقویٰ کا باہمی رابطہ

تقویٰ اور گناہوں اور آلودگیوں سے اجتناب کا آگاہی اور معرفت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ بالفاظ دیگر علم اور اخلاق کا منطقی رابطہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا قرب ہوگا کہ وہ ایک دوسرے پر برابر کے گہرے نقوش اور اثرات مرتب کرتے ہیں۔ تقویٰ علم کا سرچشمہ ہے اور علم تقویٰ کا اور یہ صرف عجیب ہی نہیں بلکہ معرفت کی راہیں طے کرنے کے لیے ایک بنیادی اصل بھی ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۸

[۲] غرر الحکم

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۴

[۴] منیۃ المرید، شہید ثانی (منقول از بحار الانوار، جلد ۱، ص ۲۲۷)

تقویٰ علم و معرفت پر مندرجہ ذیل دلائل کے ساتھ اثر ڈالتا ہے:

الف۔ ہم جنس اور ہم آہنگ ہونا ہمیشہ باہمی جاذبیت اور رابطے کا سبب ہوتا ہے۔

جب انسانی روح تقویٰ کی وجہ سے پاک و پاکیزہ ہو جاتی ہے اور اس کے اور حقیقی علوم و معارف کے درمیان ایک قوی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ کند جنس با ہم جنس پرواز۔

ب۔ تقویٰ کی درانتی انسانی روح کی کھیتی سے تمام خار و خس کو کاٹ ڈالتی ہے جو اس کے لیے پریشان کن ہوتے ہیں اور دل کو علم و دانش کے بیج کے نشو و نما پانے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ بلکہ اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آفریدگار کے ہاتھ سے علوم کے تمام بیج آغاز ہی سے اس کھیتی میں بوئے جا چکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ نشو و نما اور پروان چڑھنے سے روکنے والی چیزوں کی بیخ کنی کر کے صحیح آبیاری کی جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے ارشاد فرمایا:

"لیس العلم فی السمآء فینزل الیکم ولا فی تخوم الارض فیصعد علیکم ولکن العلم مجبرل فی قلوبکم مرکوز فی طبایعکم، تخلقوا باخلاق الروحانیین یظھر لکم"

"علم نہ آسمان پر ہے کہ تم پر نازل ہو، نہ زمین کی گہرائیوں میں ہے کہ تمہارے لیے باہر نکل آئے، بلکہ علم خود تمہارے دلوں کی گہرائیوں اور تمہاری سرشت اور طبیعت میں مخفی ہے۔ فرشتوں اور پاک دل لوگوں کے اخلاق اپناؤ تا کہ علم تم پر ظاہر ہو جائے۔" [1]

ج۔ ہم جانتے ہیں کہ بخل اور حسد عالم ہستی (کائنات) کے مبدا میں نہیں ہیں اور "وان من شیٔ الا عندنا خزائنه و ما ننزله الا بقدر معلوم"۔ یعنی ہر چیز کے منابع اور خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ان سے صرف معلوم مقدار کے مطابق ہی نازل کرتے ہیں۔ سورۂ حجر ۲۱ کے مطابق تمام نعمتوں کے ختم نہ ہونے والے خزانے خداوند عالم کے پاس ہیں اور وہ جواد ہے اور بہت بڑا سخی ہے۔ وہ جس قدر بھی زیادہ فرمائے اس کے خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس کی سخاوت اور کرم مزید آشکار ہوتا ہے کیونکہ "ولا یزیده کثرة العطا الا جود او کرما" اسی لیے اگر کوئی اس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی بے لیاقتی اور عدم استعداد ہوتی ہے اور تقویٰ انسان کو خدائی فیض کے لائق بناتا ہے اور معارف الٰہیہ اور معرفت بھرے علوم سے بڑھ کر اور کیا فیض الٰہی ہو سکتا ہے۔

یہ دل پیمانوں اور ظروف کی مانند ہیں جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر الصراط المستقیم، جلد ا، ص ۲۶۷

"ان هذه القلوب اوعیة فخیرها اوعیها"

''بہترین دل وہ ہیں جن کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہو۔'' [1]

اہم بات یہ ہے کہ ہمارے وجود کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہونی چاہیے اور ہمارے دلوں کو الٹے برتنوں کی مانند نہیں ہونا چاہیے کہ جن میں ایک قطرہ بھی نہ ٹھہر سکے اور یہ امر تقویٰ کے بغیر ناممکن ہے۔

۳۔علم اور تقویٰ کی باہمی تاثیر

حقیقی علم، اخلاقی رذالتوں اور گناہ کے سرچشموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور ان امور کے نتائج انسان کو دکھا دیتا ہے اور یہ آ گاہی، تقویٰ اور گناہوں سے پرہیز کی پیدائش میں موثر معاون ثابت ہوتی ہے اور یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں علم، تقویٰ کا سرچشمہ ہوتا ہے وہاں تقویٰ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ البتہ تقویٰ کا ہر ایک مرحلہ علم کے مرحلہ کا سبب بنتا ہے اور علم کا وہ مرحلہ تقویٰ کے ایک بالاترین مرحلے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح سے یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے میں اثر کرتے رہتے ہیں اور شاید سورہ اعراف کی آیت ۲۰۱ اسی برابر کی تاثیر کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان الذین اتقوا اذا مسهم طائف من الشیطان تذکروا فاذا هم مبصرون"

''پرہیز گار لوگ جب شیطانی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں تو یادِ خدا میں لگ جاتے ہیں اور بابصیرت ہو جاتے ہیں۔''

یعنی پہلے نمبر پر تقویٰ، پھر تذکر اور یادآوری۔ اس کے بعد بصیرت ہے اور ان سب کا نتیجہ شیطانی وسوسوں سے نجات کا حصول ہے۔

۴۔علم اور تقویٰ کے باہمی رابطہ سے ناجائز مفاد اٹھانا

جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، تقویٰ اور معرفت کے درمیان ایسا رابطہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں، قرآن وحدیث کی رو سے بھی اور دلائل اور عقل کے لحاظ سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس بات کا مقصد یہ ہے کہ ہم معمول کے طریقہ کے مطابق تحصیل حصول علم کے طریقوں کو ترک کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ ''صرف اپنے باطن کی ہی اصلاح کرنا چاہیے تاکہ تمام علم ودانش ہمارے دل کی طرف امڈ کر آ جائیں۔'' جیسا کہ اکثر صوفیاء کا عقیدہ ہے، یہ کہہ کر انہوں نے مروجہ علوم سے نبرد آزمائی اور دانش کے حصول کے ساتھ محاذ آرائی کا بہانہ تراشا ہے اور ہمیشہ کے لیے جہالت اور لاعلمی کے بوجھ تلے دب چکے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

اسلام نے ایک طرف تو حصول علم کو واجب قرار دیا ہے۔حتیٰ کہ کسی علمی محفل کو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ کے ہم پلہ قرار دیا ہے(مجلس العلم روضة من ریاض الجنة) اور عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت قرار دیا ہے(النظر الی وجه العالم عبادة)۔[۱] طلب علم اور حصول علم کے لیے قدم اٹھانے کو بہشت کی طرف قدم اٹھانا قرار دیا ہے۔[۲] قلم علماء کی سیاہی کو خون شہداء سے افضل قرار دیا ہے[۳] اور حدیث کے یاد کرنے اور اسے قلمبند کرنے کو بہت بڑی فضیلت قرار دیا ہے۔[۴]

اور دوسری طرف تقویٰ اور تہذیب نفس کی دعوت دی ہے تا کہ روح اور جان معارفِ الٰہیہ کے قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر آمادہ ہوں۔

اس طرح سے ایک طرف تو وہ لوگ زبردست غلطی پر ہیں جو خود بھی حصول علم کی راہوں کو چھوڑ چکے ہیں اور اپنے دوسرے ہمدرس ساتھیوں کو بھی بار بار یہی کہتے ہیں کہ ''دھوڈالواوراق کو کیونکہ عشق کا علم کتابوں میں نہیں ہوتا۔'' اور صرف باطن کے تصفیہ کے قائل ہیں جبکہ یہ تصفیہ، باطن بھی غالباً بوجہ بے علمی اور نا آ گاہی کے انحرافی راہوں پر چل نکلتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی پر ہے اور گمراہ ہیں جو صرف رسمی علوم کے حصول کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور تہذیب نفس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ حق تک پہنچنے کے لیے دونوں ضروری ہیں۔

۲۔ایمان اور معرفت

اشارہ

ایمان کی روح یہی ہے کہ حق کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا جائے اور حقائق اور واقعیات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے اور چونکہ اس کائنات میں سب سے اعلیٰ اور سب سے عظیم حقیقت اور واقعیت خداوند ذوالجلال کی ذات پاک ہے اسی لیے ایمان کی روح اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

ایمان انسان کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ واقعیات اور حقائق کو اسی طرح پہچاننے کی کوشش کرے جس طرح کہ وہ ہیں، خواہ وہ حقائق تلخ ہوں یا شیریں، اس کی طبیعت کے مطابق ہوں یا خلاف۔

---

[۱] غررالحکم

[۲] بحارالانوار، جلد ا، ص ۱۶۴

[۳] بحارالانوار، جلد ۲، ص ۱۴

[۴] محجة البیضاء، جلد ا، ص ۱۵

جو لوگ حق کے آگے نہیں جھکے ہیں ان کی معلومات درحقیقت خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس کا مجسمہ ہیں، نہ کہ اس خارجی دنیا میں موجود حقائق کا۔ وہ دنیا کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو وہ خود چاہتے ہیں، نہ کہ اس کے اپنے اصل رنگ اور کیفیت میں۔

پس اس اشارے کے ساتھ ہی اجمالی طور پر پتہ چل گیا کہ ایمان اور معرفت کے درمیان کیسا رابطہ ہے؟

اب ہم قرآن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں۔

آیات

(۱) اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ (سورہ انعام ۱۲۲)

(۲) اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ۝ (سورہ نور ۴۰)

(۳) وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰۤٮِٕكَ هُمُ الصِّدِّيۡقُوۡنَ ۖ وَالشُّهَدَاۤءُ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ وَنُوۡرُهُمۡ ؕ (سورہ حدید ۱۹)

(۴) اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيۡلٌ لِّلۡقٰسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مِّنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰۤٮِٕكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝ (سورہ زمر ۲۲)

ترجمہ

(۱) آیا وہ شخص جو مر چکا ہو، پھر ہم نے اسے زندہ کیا ہو، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جسے ہم نے زندہ کیا اور اس کے لیے نور قرار دیا کہ جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو ظلمتوں میں گھر چکا ہو اور ان سے باہر نہ آئے؟

(۲) یا ظلمتوں کی مانند ہے ایک بیکراں سمندر میں کہ جسے موج نے ڈھانپ رکھا ہے، تاریکیاں ہیں ایک دوسرے کے اوپر، اس طرح کہ جب کوئی اپنا ہاتھ باہر نکلتا ہے تو اسے نہیں دیکھ سکتا۔ جس کے لیے خدا نے نور نہیں بنایا اس کے لیے کوئی نور نہیں۔

(۳) جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لا چکے ہیں، وہی صدیق بھی ہیں اور شہداء اپنے رب کے پاس ہیں۔ ان کے لیے اعمال کا اجر اور نور (ایمان) ہے۔

(۴) آیا وہ شخص کہ جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے نور کی سواری پر ہے (ایسے لوگوں کی مانند ہو سکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نور ہدایت ان کے دل میں داخل نہیں ہوا؟) پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ذکر خدا کے سامنے سخت ہیں۔ وہی لوگ تو واضح گمراہی میں ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ایمان کی تاثیر

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جو پہلے مردہ تھے پھر خدا نے انہیں زندہ کر دیا اور پھر ان کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ وہ اپنی راہ دیکھتے ہیں۔

مرنے اور زندہ ہونے سے مراد وہی بعد از کفر ہے، جیسا کہ سورہ انفال کی ۲۴ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

"یا ایها الذین امنوا استجیبوا للّٰه وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم"

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو خدا اور اس کے رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں بلائے تا کہ تمہیں زندہ کرے۔''

پس معلوم ہوا کہ زندگی وہی ایمان حقیقی کی زندگی ہے جس میں معرفت کا نور ملا ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کا گروہ ہے جو کفر کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور ہرگز اس سے خارج نہیں ہوئے (کمن مثله فی الظمات لیس بخارج منها)

بہت سے مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس نور سے مراد قرآن مجید ہے۔ بعض نے دین کا نور مراد لیا ہے اور دوسرے کئی مفسرین نے نور حکمت سمجھا ہے۔[۱] بعض نے نورِ اطاعت بھی مراد لیا ہے۔[۲] لیکن اس بات میں شک نہیں کہ اس نور کا مفہوم وسیع ہے جو ہر قسم کی شناخت اور معرفت کو شامل ہے اور صاف بات ہے کہ قرآن پاک بھی اس کے مصداقوں میں سے ایک اتم و اکمل مصداق ہے۔

"یمشی به فی الناس" (اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے) کی تعبیر دنیا کی اجتماعی زندگی کے ساتھ بہت ہی مناسبت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ایمان'' انسان کے دل میں ''معرفت'' کی راہیں ہموار کرتا ہے اور دنیاوی زندگی میں غلطیوں سے بھی باز

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۱۷۲، تفسیر قرطبی، جلد ۴، ص ۲۵۱۴، تفسیر المنار، جلد ۸، ص ۳۰

[۲] تفسیر ابوالفتوح، جلد ۵، ص ۵۰

رکھتا ہے۔

زیر بحث سلسلے کی دوسری آیت بے ایمان افراد (یا ان کے اعمال) کو ایسی ظلمتوں سے تشبیہ دے رہی ہے جو عمیق سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے ہوئے ہوں، جن کے اوپر موجیں ہی موجیں ہوتی ہیں اور موجوں کے اوپر اور فضاؤں میں تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی وہاں پر موجود ہو اور اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے نہ دیکھ سکے۔(اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا) اور آخر میں تاکید کے ساتھ کہتا ہے، جس کے لیے خدا نے نور قرار نہ دیا ہو اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے۔(من لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور)۔

اس آیت کی عبارت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمانی اور کفر ظلمت ایجاد کرتے ہیں، جبکہ ایمان اور اسلام نور آفرین ہوتے ہیں۔ بے ایمان اور منحرف لوگوں سے وہ وہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اس حد تک زیادہ ہوتی ہیں کہ انسان کبھی کبھی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ اپنے سامنے کی نزدیکی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتے اور اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظلمت کے بارے میں جو مندرجہ بالا آیت میں نقشہ کشی کی گئی ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظلمت زیادہ گہری اور ظلمانی نہیں ہوتی۔سمندر کی گہرائی ویسے بھی قدرتی طور پر تاریک ہوتی ہے، کیونکہ سورج کی روشنی پانی میں زیادہ سے زیادہ سات سو میٹر کی گہرائیوں تک ہی پہنچ سکتی ہے۔اس کے بعد ظلمت ہی ظلمت اور تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اور نور آفتاب اس حد تک اس وقت پہنچتا ہے جب سمندر میں ٹھہراؤ ہو اور اس میں پیچ وتاب کھاتی موجیں اپنے زوروں پر نہ ہوں جن سے نور کی شعاعیں اپنا اثر کھو دیتی ہے، نیز تاریک اور سیاہ بادل بھی ان شعاعوں کا راستہ نہ روکیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان تاریکیوں سے مراد کافروں میں تین قسم کی تاریکیاں ہیں: اعتقادی تاریکی، گفتار کی تاریکی اور کردار وعمل کی تاریکی۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد دل کی تاریکی، آنکھ کی تاریکی اور کان کی تاریکی ہے۔مگر کچھ اور حضرات نے کہا ہے یہ تین طرح کی ظلمت اس بات سے عبارت ہے کہ: ۱۔ وہ نہیں جانتے۔ ۲۔ اس بات کو بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔ ۳۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔لیکن ان تفسیروں میں آپس میں کوئی منافات نہیں بلکہ ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔

تیسری آیت میں پہلے تو مومنین کو ''صدیق'' اور ''شہید'' کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے، پھر فرماتا ہے کہ: ''ان کے لیے ان کے اعمال کی جزاء اور ان کے ایمان کا نور ہے۔'' (لھم اجرھم و نورھم)۔

''صدیق'' مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت سچ بولنے والا اور بعض نے کہا ہے کہ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، بلکہ بعض اور حضرات نے اس سے بھی بالاتر معنی ذکر کیے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جس نے سچائی کی عادت کو اس طرح اپنا لیا ہو کہ جھوٹ بولنا اس کے لیے ناممکن ہو۔بالفاظ دیگر سچ اس کی عادت ثانوی بن چکا ہو۔

بعض اور حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو عقیدے اور گفتگو کے لحاظ سے سچا ہو اور اعمال اس کی گفتار اور عقائد کی

تصدیق کریں۔[1]

چونکہ ان معانی کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے اور سب معانی مبالغہ کے مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں لہٰذا ان کی ایک جگہ پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ یقیناً آیت کی مراد تمام مومنین نہیں ہیں بلکہ وہ مومنین ہیں جو ایمان کے بالائی مراتب پر فائز ہیں۔

اور ممکن ہے کہ ''شہدا'' سے مراد یہ ہو کہ سچے مومنین شہیدوں کے ثواب کے حامل ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، دعا فرمایئے خدا مجھے شہادت عطا فرمائے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا "ان المومن شھید" مومن تو شہید ہوتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی "والذین امنوا باللّٰہ و رسولہ..." (یہی زیر بحث آیت)۔[2]

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شہید سے مراد، اعمال کا گواہ ہے، کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ (انبیاء اور آئمہ) امتوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔

ان دونوں معانی کو اکٹھا کرنا بھی بعید نہیں ہے۔[3]

"لھم اجرھم و نورھم" میں ''اجر'' کے معنی ان کے اعمال کی جزا ہے اور ''نور'' کو بعض مفسرین نے قیامت کے دن مومنین کا نور مراد لیا ہے جو بہشت کی راہیں کھولے گا۔ لیکن اس محدودیت پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس جگہ پر نور مطلق صورت میں بیان ہوا ہے جو دنیا میں معرفت اور آگاہی کے نور کو بھی شامل ہے اور آخرت میں میدانِ قیامت کے نور کو بھی۔

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت ایک تقریری استفہام کی صورت میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''آیا خدا نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور اس کے پاس نورِ الٰہی کی سواری ہے، ان لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نورِ معرفت کو ان کے دلوں تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی؟ (افمن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ) اور یہ بات بذاتِ خود اس چیز کی روشن دلیل ہے کہ ایمان کی قبولیت شرح صدر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور شرح صدر خدائی نور کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ خدائی نور جو دنیا کو مومن کی آنکھوں کے سامنے روشن کر دیتا ہے اور وہ حقائق کو اسی طرح درک کرتا ہے کہ جس طرح کہ وہ ہیں۔

''شرح صدر'' سے مراد یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر وسعت اختیار کر لیتی ہے کہ بہت سے حقائق کو قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا مقابل نقطہ ''ضیق صدر'' ہے، جسے تنگی سینہ کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر تنگ اور چھوٹی ہو

---

[1] مفردات راغب، مادہ صدق۔ مجمع البحرین، مادہ صدق۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۱۸۶۔ تفسیر مراغی، جلد ۲۷، ص ۱۷۴۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۶، ص ۲۳۸

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۲۳۸

[3] بحار الانوار، جلد ۴۶، ص ۷۴، حدیث ۲

جاتی ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھنے پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر شرح صدر وہی روح کی عظمت اور بزرگی ہے کہ جن میں سے ایک اہم عامل خدا کی غیر متناہی ذات کے ساتھ رابطہ ہے۔ جی ہاں! جو روح رنگ الٰہی اور صبغۃ اللہ میں رنگ جائے وہ کشادہ ہو جاتے ہے اور زیادہ سے زیادہ علوم کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

نہ صرف یہ کہ کشادہ نہیں ہوتی بلکہ نرم بھی ہوتی ہے اور حقائق و معارف کی تخم پاشی کے لیے بھی تیار ہوتی ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''عذاب ہے ایسے سنگدل لوگوں پر جن کے دل ذکر خدا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' (فویل للقاسیة قلوبهم من ذکر الله)۔

مزید تشریح

احادیث کی رو سے علم اور ایمان کا رابطہ

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

''ان المومن ینظر بنور الله''

''مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔'' [۱]

امام علیہ السلام کے ایک دوست نے آپؑ سے اس کی وضاحت چاہی تو آپؑ نے فرمایا:

''خدا نے مومن کو اپنے نور سے خلق فرمایا ہے اور اسے اپنی رحمت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔''

۲۔ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث شریف ہے:

''اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله، ثم تلا، ان فی ذالك لا یات للمتوسمین''

''مومن کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے پھر آپؐ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا جس کے معنی ہیں اس (قوم لوط جیسی قوموں کے افسوسناک انجام) میں صاحبانِ ہوش کے لیے نشانیاں ہیں۔'' [۲]

۳۔ ایک اور روایت بھی ہے جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے سرور رسالت

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۴، حدیث ۲

[۲] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۴، حدیث ۴

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی بات کو دوسرے لفظوں میں بیان فرمایا:

"ایاکم و فراسة المومن فانه ینظر بنور الله تعالیٰ"

''تم مومن کی فراست سے بچتے رہو، کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔''[۱]

۴۔ بعض روایات میں تو بات اور بھی آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت امیرؑ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اتقوا ظنون المومنین فان الله سبحانه جعل الحق علی السنتهم"

''تم مومنین کے تخمین وگمان سے بچو، کیونکہ خداوند عالم حق کو ان کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔''[۲]

۵۔ نہج البلاغہ ہی میں آنجنابؑ کا فرمان ہے:

"و بالصالح یستدل علی الایمان و بالایمان یعمر العلم"

''عمل صالح کے ذریعہ ایمان کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اور ایمان کے ذریعہ علم کا محل آباد ہوتا ہے۔''[۳]

۶۔ ہم اپنی اس بحث کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرمان پر ختم کرتے ہیں:

"ما من مومن الا وله فراسة فانه ینظر بنور الله علی قدر ایمانه"

''کوئی مومن ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے خاص ہوشمندی اور ہوشیاری ہوتی ہے اور وہ اپنے ایمان کی مقدار کے مطابق نورِ خدا سے دیکھتا ہے۔''[۴]

جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں بتا چکے ہیں سچا ایمان انسان کو حق اور حقیقت کا عاشق بنا دیتا ہے اور انسان کے اندر واقعیات اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پھونک دیتا ہے اور اس طرح سے اس کی روح اور جان ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر ہر قسم کی معرفت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتی ہے۔

۳۔ صبر وشکر اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو پڑھتے ہیں:

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۵، حدیث ۸

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۳۰۹

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۶

[۴] عیون الاخبار، جلد ۲، ص ۲۰۰ (منقول از الحیاۃ جلد ۱ ص ۹۲)

آیات

(۱) وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ۙ
وَ ذَکِّرۡهُمۡ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۵﴾
(سورہ ابراہیم ۵)

(۲) اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡکَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَکُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۳۱﴾ (سورہ لقمان ۳۱)

(۳) فَقَالُوۡا رَبَّنَا بٰعِدۡ بَیۡنَ اَسۡفَارِنَا وَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِیۡثَ
وَ مَزَّقۡنٰهُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۱۹﴾
(سورہ سبا ۱۹)

(۴) وَ مِنۡ اٰیٰتِهِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ﴿ؕ۳۲﴾ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ
رَوَاکِدَ عَلٰی ظَهۡرِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿ۙ۳۳﴾
(سورہ شوریٰ ۳۲۔۳۳)

ترجمہ

(۱) ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال اور انہیں ایام اللہ کی یاد دلا، اس میں صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔
(۲) کیا تو نے نہیں دیکھا کشتیوں کی طرف جو سطح سمندر پر خدا کے حکم اور اس کی نعمت کے ساتھ چلتی ہیں تاکہ وہ اپنی بعض نشانیاں تمہیں دکھائے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں۔
(۳) لیکن ان (بے شکرے) لوگوں نے کہا پروردگار! ہمارے سفروں کے درمیان دوری پیدا کر دے (تاکہ بے نوا لوگ امیر لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں، تو اس طرح سے) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) خبریں اور داستانیں قرار دے دیا اور ان کی جماعتوں کو منتشر کر دیا۔ اس ماجرے میں عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں ہر صابر اور شاکر کے لیے۔

(۴) (اس کی نشانیوں میں سے کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی مانند سمندر میں چلتی رہتی ہیں، اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے تو وہ بھی پشت سمندر پر رک جائیں گی، اس بات میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

''آفاق'' اور ''انفس'' کی سیر اور صابر و شاکر ہم سفر

سب سے پہلی آیت میں ''بنی اسرائیل'' کا تذکرہ ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ہدایت کا فریضہ سونپا گیا اور وہ خدائی آیات اور معجزات لے کر ان کے پاس آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کفر و شرک اور فساد کی ظلمتوں سے نکال کر توحید کے نور کی طرف لے جائیں جو تمام برکتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے اور انہیں خدائی ایام کی یاد دلائیں اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں اور عبرت کے اہم درس پوشیدہ ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں'' (ان فی ذالك لآیات لکل صبار شکور)۔

اس آیت میں ''ایام اللہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان مختلف اقوال ہیں:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد خدا کی نعمتوں اور آزمائشات کے دن ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء کرام اور خدا کی نیک امتوں کی کامیابی کے دن ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سرکش اقوام کے عذاب کے دنوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن بظاہر ان تمام تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب ''ایام اللہ'' ہیں۔

اصولی طور پر ''ایام'' (دنوں) کے معنی میں ہے اور اس لفظ کی خدا کی طرف اضافت اصطلاحی طور پر ''اضافہ تشریفی'' ہے اور اس سے مراد ہر وہ دن ہے جس کی حد سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ یا تو اس کا تعلق خدا کی عظیم نعمتوں سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے شامل حال ہوتی ہے، مثلاً ظلم اور شرک و کفر کے لشکروں پر عظیم فتح و کامرانی، ظالموں اور طاغوتوں کے چنگل سے نجات، جہاد یا کسی اور فریضہ کی ادائیگی کے موقع پر کامیابی کا حصول۔ یا پھر ان کا تعلق خدائی عذاب سے ہوتا ہے جس نے کسی سرکش قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا تھا، یا عبرت کے ان تازیانوں سے ہوتا ہے جو امتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کی جانوں پر پڑتے ہیں۔ غرض یہ سب ''ایام اللہ'' ہیں اور ان کا وسیع مفہوم ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات الٰہی اور عبرت کے دروس سے استفادہ کو صابروں اور شاکروں کے ساتھ

---

[1] یہ تفسیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند روایات میں سے نقل ہوئی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر المیزان، جلد ۵، ص ۱۵-۱۶ اور تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، ص ۵۲۶

کیوں مخصوص کیا ہے؟ (توجہ رہے کہ ''صبار'' اور ''شکور'' دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، ایک میں صبر و استقامت کے اضافے کے معنی پائے جاتے ہیں اور دوسرے میں شکر گزاری کے اضافے کے تو اس کا جواب یہ ہے چونکہ اس قسم کے حوادث اور واقعات کی صحیح معنی میں تحقیق اور ان پر غور و فکر اور ان کے آغاز و انجام پر پوری طرح غور و خوض کے لیے صبر و شکیبائی اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور پھر ان حوادث کے نتائج سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو ان کی نعمتوں کی قدر جانتے اور ان پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اس طرح سے ''صبر'' اور ''شکر'' معرفت آگاہی کی راہ ہموار کرنے کے دو بہترین ذرائع ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں صبر اور شکر کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہونا اس وجہ سے ہے کہ ایسے افراد مصائب اور آلام کے مقابلے کے لیے صبر و شکیبائی کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتے ہیں اور نعمتوں کے موقعہ پر شکر کے اسلحہ سے، گویا وہ نہ تو مصیبت کے آگے گھٹنے ٹکاتے ہیں اور نہ ہی نعمتوں کے موقع پر مغرور ہو جاتے ہیں اور کسی بھی حالت میں خود کو گم نہیں کر پاتے۔ اسی وجہ سے وہ ان حوادثات سے معرفت کو حاصل کرنے اور عبرت کا سبق لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دوسری اور چوتھی آیت میں ''ان فی ذالک لایات لکل صابر شکور'' کا جملہ سطح سمندر پر کشتیوں کے چلنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ کشتیاں خدا کے حکم اور ہواؤں کی منظم حرکت کے نتیجہ میں تیزی سے چلتی رہتی ہیں اور دور دراز کا سفر طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچتی ہیں۔

مسلم ہے کہ یہ موضوع تکوینی آیات میں سے ایک ہے اور اس کائنات میں خداوند عالم کی قدرت اور تخلیقی نظام کی ایک نشانی ہے۔

لیکن آیا خدائی نشانیوں سے بہرہ گیری اور استفادہ ہر شخص کے لیے ممکن ہے جو کہ کائنات کے نظام حتیٰ کہ ہواؤں کے چلنے تک میں موجود ہے، یا صرف ان لوگوں سے مخصوص ہے جو غور و خوض اور صبر و شکیبائی کے ساتھ اس عجیب نظام کی انسانی عقل و دانش کی حد تک ریزہ کاری کے ساتھ زیر تحقیق لاتے ہیں اور پھر یہ کہ "شکر منعم" بھی ان کی شناخت اور معرفت کے سلسلے میں ان کی تلاش اور ان کے تحرک کا سبب بنتے ہیں۔ ''قرطبی'' اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ''یہاں پر آیات بمعنی علامات کے ہیں اور یہ علامات اور نشانیاں ہر ایک شخص کے دل میں ظاہر نہیں ہوتیں، بلکہ ان لوگوں سے مخصوص ہیں جو اس کی بلاؤں کے سامنے صابر اور نعمتوں کے لیے شاکر ہوتے ہیں۔ [۱]

تفسیر روح البیان میں منقول ہے کہ ''صبار'' کے معنی ہیں وہ شخص جو سخت مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں پائیداری کا مظاہرہ کرتا ہے اور خود کو آفاق و انفس کی آیات میں سوچ و بچار اور غور و فکر کے لیے تکلیفوں میں ڈالتا ہے۔ [۲]

کس قدر قابل غور بات ہے کہ جس ہوا نے کرہ زمین کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے کائنات کی لطیف ترین چیز ہے۔ لیکن جب اس لطیف جسم میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ عظیم اور غول پیکر کشتیوں کو سطح سمندر پر متحرک کیے رکھتی ہے بلکہ ان بادلوں کو بھی خشک اور مردہ زمینوں کی طرف لے جاتی ہے جو زندگی عطا کرنے والی بارش کے حامل ہوتے ہیں۔ وہاں پر بارش ہوتی ہے اور بنجر زمینیں آباد ہو

---

[۱] تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۵۱۶۱

[۲] روح البیان، جلد ۷، ص ۹۸

جاتے ہیں۔ سرد ہواؤں کو گرم علاقوں میں اور گرم ہواؤں کو سرد علاقوں میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔ جس سے کرہ ارضی انسانی زندگی کے قابل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ نباتات کے بیجوں اور دانوں کو اپنے ساتھ حمل کرکے ادھر ادھر پہنچا دیتی ہیں، پھولوں کے اندر کے سفوف کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں تا کہ اس طرح سے درختوں کا تخم گابھ میں تبدیل ہو۔ تو کیا یہ سب خدائی نشانیاں نہیں ہیں؟ اور صابر و شاکر لوگوں کے علاوہ اور کون اس سے استفادہ کرسکتا ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"الایمان تضفان نصف صبر و نصف، شکر"

''ایمان کے دو حصے ہیں: ایک کا نام صبر ہے اور دوسرے کا نام شکر ہے۔''[1]

اور یہ حدیث آیات بالا کے مفہوم پر تاکید ہے۔

بالآخر تیسری آیت میں قوم سبا کی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جب توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور وہ سرزمین یمن میں پہاڑوں کے درمیان ایک عظیم ''سد'' (ڈیم) ایجاد کرکے پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اس ذخیرہ شدہ پانی سے بہت سے سرسبز اور شاداب باغات کی آبپاشی کرتے تھے، ان کی زندگی خوشی اور نعمت سے معمور تھی۔ لیکن انہوں نے ناشکری کا رستہ اختیار کیا۔ خوش حال لوگوں نے مظلوم و مستضعف عوام پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عظیم سد ٹوٹ گئی، باغات ویران ہوگئے اور وہ خود اس طرح تتر بتر اور منتشر ہوگئے کہ قرآن پاک نے ان کی اس طرح نقشہ کشی کی ہے کہ ''ہم نے انہیں دوسروں کے لیے خبریں اور داستانیں بنا دیا'' **(فجعلنھم احادیث)** اور ہم نے ان کی اجتماعیت کو مکمل طور پر منتشر اور تتر بتر کر دیا'' **(ومزقناھم کل ممزق)**۔ پھر فرماتا ہے ''اس داستان میں آیات اور نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں، ان سب لوگوں کے لیے جو صبر کرنے والے اور شکر گزار ہیں'' **(ان فی ذالك لآیات لکل صبار شکور)**۔

کیونکہ وہ اس ماجرے میں غور و فکر کرکے بہت سے نکات حاصل کرتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی اور موت کا فاصلہ بہت کم ہوتا ہے، اس قدر کم کہ موت خود اس کی زندگی میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہی وافر مقدار کا پانی جو قوم سبا کی آبادی، تہذیب اور تمدن کا ذریعہ تھا ایک دن اسی کی تباہی اور بربادی کا سبب بن گیا۔

ادھر دوسری طرف سے اس مغرور انسان کی انتہائی کمزوری اور عاجزی کا بھی پتہ چلتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں کہ قوم سبا کی عظیم سد جسے ''سد مآرب'' کہتے ہیں، کو جنگلی چوہوں نے سوراخ کر دیا، جس سے پانی نے آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع کر دیا اور وہ سوراخ بالتدریج وسیع ہوتا گیا۔ انجام کار سد مآرب ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تو اس طرح سے چند جنگلی چوہوں نے ایک عظیم تمدن کو کیونکر ملیا میٹ کر دیا!!

تیسری بات یہ ہے کہ قوم سبا کے مستکبرین جو غریب عوام کا اپنے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ گنتی

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۳۲۳۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۱۶۲۔ تفسیر مراغی، جلد ۲۱، ص ۹۷۔ تفسیر قرطبی جلد ۵، ص ۵۷۱ ۳اور دوسری تفسیریں۔

کے چند امیروں اور مستضعف عوام کے درمیان سد مآرب جیسی عظیم حد اور سد حائل ہے، انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے شہروں اور آبادیوں کو غریب اور مستضعف عوام کے شہروں اور آبادیوں سے دور قرار دے تاکہ عام لوگ سفر کرکے آسانی کے ساتھ ان تک نہ پہنچ سکیں اور یہ امتیاز ان کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے!! (فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا) لیکن خدا نے انہیں ایسا تتر بتر اور منتشر کیا کہ انہوں نے اس سوچ کو ہمیشہ کے لیے دماغ سے نکال دیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آسودہ اور خوشحال زندگی نے انہیں یادِ خدا سے غافل کر دیا اور اس وقت ہوش میں آئے جب ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے:

اے روزگارِ عافیت شکرت نگفتم لاجرم

دستی کہ در آغوش بودا کنون بہ دندان می گزم

''یعنی اے خوشحالی اور عافیت کے زمانے میں نے تمہارا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اسی لیے جو ہاتھ پہلے آغوش میں ہوا کرتا تھا اب اسے دانتوں سے کاٹ رہا ہوں۔''

اس طرح سے صبر و شکیبائی اور حوصلے کے ساتھ اور عقل و خرد کے تعاون سے اس داستان کی بہت سی نشانیوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔[1]

نتیجہ کلام

مندرجہ بالا چاروں آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جو شخص بھی اسرار و آفرینش اور اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی کے اسرار میں زیادہ سے زیادہ اور گہرا مطالعہ کرے اور پورے صبر و شکیبائی کے ساتھ اس مطالعہ میں مگن رہے اور شکر گزاری کی روح یعنی معرفت کے وسائل و ذرائع اس پر حکم فرما ہوں تو شناخت اور معرفت کا بیشتر حصہ اس کے نصیب میں آجائے۔ اسی لیے صبر اور شکر معرفت کی راہ ہموار کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔

۴۔ معرفت خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے

اشارہ

مشہور ہے کہ دولت کو دولت ہی کماتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مقدار سرمایہ خود ہی بیشتر منافع اور سرمایہ کمانے کا

---

[1] توجہ رہے کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ ''احادیث'' جمع منتہی الجموع ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی سرگزشت کی ایک نہیں بلکہ کئی داستانیں ہیں۔

سبب بنتا ہے۔اس کی مقدار جتنا زیادہ ہوگی، منافع بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔
یہی اصول علم و دانش اور معارف پر بھی حکم فرما ہے۔ جو لوگ علمی سرمایہ کے حامل ہوتے ہیں ان کے لیے مزید علمی سرمایہ کے حصول کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں معرفت بذات خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔یعنی ایک مرحلہ کا علم اور دانش سبب بن جاتا ہے کہ اس سے بالاتر کئی دوسرے مراحل تک رسائی حاصل کی جائے۔
اب اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾ (سورہ روم ۲۲)

(۲) فَتِلۡكَ بُيُوۡتُهُمۡ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوۡا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۲﴾ (سورہ نمل ۵۲)

ترجمہ

(۱) اور اس کی آیات میں سے ہیں زمین و آسمان کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا مختلف ہونا۔ اس میں عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔
(۲) یہ وہی گھر ہیں جو اپنے ظلم وستم کی وجہ سے خالی رہ گئے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے لیے روشن نشانی ہے جو عالم ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

پہلے آشنا بنو پھر پتہ چلے

زیر نظر آیات میں سب سے پہلی آیت سورہ روم کی متعدد آیات کے ضمن میں سے ایک آیت ہے جس میں آفاقی اور نفسی آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور خداوند عالم کی عالم اکبر (اس کائنات) میں اور عالم اکبر (وجود انسان) میں موجود آیات وعلامات کو شمار کیا گیا ہے۔
اس آیت میں ایک طرف تو عالم اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”خداوند عالم کی آیات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق“

(ومن ایاته خلق السموات والارض)۔ اس کے بعد وجود انسانی کی باریکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''اس کی دوسری نشانی تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے''(و اختلاف السنتکم والوانکم)۔

نہ صرف ظاہری زبان اور رنگ کا اختلاف بلکہ اندرونی زبان اور رنگ ذوق اور سلیقوں کا رنگ بھی، جو اس قدر مختلف اور متفرق ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ دو ایک جیسے انسان مل جائیں حتیٰ کہ یہ اختلاف دو جڑواں بھائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

یہ فرق ایک طرف تو لوگوں کی پہچان اور ایک دوسرے سے شناخت کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو اجتماعی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ چنانچہ جو لوگ ایسے جڑواں افراد کے ساتھ رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں بسا اوقات سخت مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس قدر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک سفر سے واپس آتا ہے تو وہ دوسرے کو ملنے چلے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ اس کے قریبی رشتہ دار دھوکہ کھا جاتے ہیں، بیمار ایک ہوتا ہے دوا دوسرے کو دی جاتی ہے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ اگر تمام لوگ ہر لحاظ سے ایک دوسرے جیسے ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟

ادھر دوسری طرف یہ انواع واقسام کا اختلاف اس بات کا سبب ہے کہ ہر گز وہ معاشرہ کی کسی نہ کسی قسم کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور یہ معاشرتی ضروریات ہر گروہ کے ذوق کی تسکین اور استعداد کے مطابق پوری ہو رہی ہیں، اور انسانی معاشرے میں کسی قسم کا خلا بھی رونما نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ سب خداوند عالم کی آیات اور نشانیاں نہیں ہیں؟ اس خالق کی نشانیاں جس نے اس عظیم کائنات کو خلق فرمایا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ''زبانوں کے اختلاف'' کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''بولیوں'' (زبانوں) کا اختلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں ایک ہزار بولیاں (زبانیں) بولی جاتی ہے اور یہ تنوع (سردست ہمیں جس کے اصل سرچشمہ سے سروکار نہیں ہے) مختلف اقوام کی ایک دوسرے سے پہچان کا موثر ذریعہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے لوگوں کے لہجے اور طرزِ بیان مراد ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا ایک اندازِ گفتگو ہے جس سے اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

بعض صاحبانِ تفسیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد صوتیں یا بااصطلاح اداروں کی ''ٹیونیں'' ہیں جو آپس میں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے نابینا لوگ بہت سے افراد کو ان کی آوازوں سے بخوبی پہچان لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے آنکھوں والے کسی کو دیکھ کر پہچان جاتے ہیں۔

اور یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ کائنات کی عظیم سے عظیم تر چیز سے لے کر (بظاہر) اس کی عام اور سادہ ترین چیز تک سب کی سب ایک باقاعدہ منظم اور مرتب نظام کے تحت موجود ہیں اور اس ذات کردگار کے علم وقدرت کی نشانیاں ہیں۔

اور قابل توجہ بات ہے کہ آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: ''ان موضوعات میں صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں'' (ان فی ذالك لآیات للعالمین)۔ جی ہاں! وہی صاحبانِ علم جو بڑے غور وخوض اور موشگافیوں کے ذریعے ایک ایک کر کے ان اسرار ورموز کی تہ تک پہنچتے ہیں اور ان کی سابقہ آگاہی ان کی آئندہ آگاہی کا موجب بنتی ہے۔

دوسری آیت ان فسادی اور فتنہ پرور ٹولوں کی بات کر رہی ہے جو مفسرین کے بقول سرزمین ''وادی القری'' اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں رہتے تھے، جن کی تعداد نو تھی اور وہ کافر اور منافق ٹولے تھے، جن کا کام ہمیشہ تخریب کاری اور فتنہ پروری تھا، جیسا کہ اسی سورہ نمل کی آیات میں آیا ہے ''**وکان فی المدینة تسعة رھط یفسدون فی الارض**'' (شہر میں نو گروہ تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے)۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں توبہ و بازگشت اور اپنی اصلاح کی کافی مہلت دی، لیکن انہوں نے اصلاح کی بجائے غرور اور تکبر کا رستہ اختیار کیا اور دن بدن اس میں بڑھتے گئے۔ انجام کار عذاب الٰہی نے انہیں آلیا اور کڑاکے کی مہلک بجلیوں اور زلزلوں نے ان کی بے شرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

زیر بحث آیت کہتی ہے ''یہ وہ گھر ہیں جو اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی رہ گئے'' (**فتلك بیوتھم خاویة بما ظلموا**)۔

پھر فرماتا ہے ''اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو عالم ہیں'' (**ان فی ذالك لایة لقوم یعلمون**)۔

''**بما ظلموا**'' کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے گھروں کی ویرانی کا سبب خود ان کے مظالم ہی تھے، اسی لیے ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے ''میں نے اس حقیقت کو کتاب خدا میں پایا ہے کہ ظلم انسان کا خانہ خراب کر دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسی آیت کو تلاوت فرمایا۔ تورات میں بھی آیا ہے:

''اے فرزند آدم! ظلم نہ کر کیونکہ وہ تیرا خانہ خراب کر دے گا۔''[۱]

البتہ اس طرف بھی توجہ رہے کہ ''**خاویه**'' کا لفظ اصل ''خالی'' کے معنی میں ہے، لیکن بہت سے مفسرین نے اس کی ''ویران'' کے معنی سے تفسیر کی ہے اور یہ شاید اس لیے ہے کہ جب مکان اپنے مکینوں سے خالی ہو جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ویران ہو جاتا ہے۔[۲]

نتیجہ کلام

یہ حقیقت ہے کہ خدا کی آیات، خواہ آفاقی ہوں یا انفسی اور خواہ وہ درس عبرت سے متعلق ہوں کہ جن میں گذشتہ لوگوں کی سرگزشت ہوتی ہے، تمام لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے تمام لوگ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے اسی لیے قرآن کہتا ہے ''ان امور میں آگاہ اور عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

کہیں پر کہتا ہے کہ ''صاحبانِ تقویٰ لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

---

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۹، ص ۱۹۴

[۲] تفسیر روح البیان میں ''خوی'' کے مادہ کے دو معانی ذکر کیے گئے ہیں، ایک ''خالی ہونا'' دوسرا ''گرنا اور منہدم ہونا''۔ اسی لیے عرب ''خوی النجم'' کہتے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ صرف اسی پہلے معنی کے لیے ہے اور ''خوی النجم'' وہاں پر بولا جاتا ہے کہ جہاں پر کوئی ستارہ غروب کرے، لیکن وہاں پر بارش نہ ہو۔ (زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عقیدہ کے مطابق بہت سے ستاروں کے ساتھ بارش بھی ہوتی ہے اور جب بارش نہیں آتی تھی تو اس ستارے کے بارے میں یہی تعبیر استعمال کرتے تھے)۔

کہیں پر کہتا ہے کہ ”غور وفکر کرنے والے اور صابر وشا کر افراد کے لیے......“

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف اس قسم کے لوگ جن کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں، ان آیات سے استفادہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارے سے خالی نہیں ہیں کہ ہمیشہ علم ومعرفت ہی بیشتر علم ومعرفت کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ مثلاً: كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

”ہم اپنی اس طرح کی آیات کو ان لوگوں کے لیے تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں جو عالم ہیں۔“ (اعراف ۳۲)

یا پھر يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

”خداوند عالم اپنی آیات کو اس قوم کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عالم ہے۔“ (یونس ۱۵)

یا پھر كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

”ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فصاحت اور وضاحت ہے اس قوم کے لیے جو آگاہ ہے۔“ (فصلت ۳)

اور یا وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

”یہ قوانین الٰہی کی حدود ہیں جنہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو عالم ہیں۔“ (بقرہ ۲۳۰)

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان آیات سے اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل جاتا ہے کہ ”علماء کو آیات الٰہی کی تفصیل، تشریح اور توضیح کی کیا ضرورت ہے۔